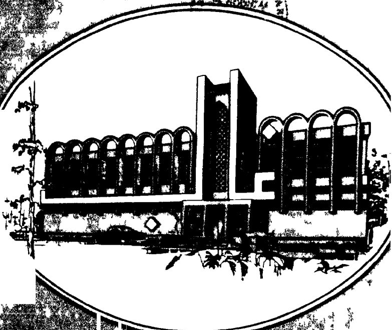
سلور جوبلی نمبر

غالب نامہ



مجلہ

غالب نامہ

مجلسِ مشاورت :
پروفیسر مسعود حسین خاں
پروفیسر سیّد امیر حسن عابدی
پروفیسر مختار الدّین احمد

مجلہ

غالب نامہ

اردو میں علمی، ادبی اور تحقیقی رفتار کا آئینہ

مدیر اعلا، پروفیسر نذیر احمد

مدیران

رشید حسن خاں

پروفیسر عبدالودود اظہر

شاہد ماہلی

غالب انسٹی ٹیوٹ، ایوانِ غالب مارگ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

مجلہ غالب نامہ نئی دہلی

جنوری ۱۹۹۶

جلد ۱۷ ——— شمارہ ۱

قیمت: ۵۰ روپے

ناشر و طابع : شاہد ماہلی

مطبوعہ : عزیز پرنٹنگ پریس، دہلی

خط و کتابت کا پتا

غالب نامہ، غالب انسٹی ٹیوٹ، ایوانِ غالب مارگ، نئی دہلی ۲

اداریہ

غالب انسٹی ٹیوٹ کی تاسیس کے پچیسویں سال اس کی سلور جوبلی منائی جا رہی ہے، اس موقع پر غالب نامے کا مخصوص شمارہ شائع ہو رہا ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ پچھلے شماروں کے مقابلے میں یہ شمارہ زیادہ ضخیم اور اس کے مقالوں میں زیادہ تنوع ہے۔ یہ شمارہ تنقیدی و تحقیقی مضامین کا خاصا مجموعہ ہے، ان مضامین سے غالب کی حیات، شخصیت اور فکر کے بعض نئے گوشے سامنے آتے ہیں، اس میں کچھ تاریخی و ثقافتی مقالے شامل ہیں گو وہ براہِ راست غالب سے متعلق نہیں لیکن ان کے مطالعے سے نہ صرف معلومات میں اضافہ ہوگا بلکہ انسانی فکر کی نئی جہت سامنے آئے گی۔ انھیں میں ایک مقالہ ہریانہ کے کتبات پر ہے، کتبات تاریخ کے لیے نئے اور مستند مواد کے حامل ہوتے ہیں، ہریانہ کے کتبات دلی سے ملحق خطے کی تہذیبی و تاریخی زندگی پر روشنی ڈالیں گے۔ راقم الحروف کا ایک مقالہ وارستہ سیالکوٹی کی مشہور کتاب مصطلحات الشعرا پر ہے، وارستہ اپنے عہد کا سب سے بڑا نقاد اور محقق تھا، وہ غالب کا اس لحاظ سے تقریباً معاصر تھا کہ غالب کی پیدائش سے کچھ ہی پہلے اس کی وفات ہوئی تھی۔ وارستہ فکری لحاظ سے غالب سے بہت قریب تھا، غالب کی طرح وہ بھی ہندوستانی فارسی شاعروں اور ادیبوں کو فارسی زبان کے معاملے میں مستند نہیں سمجھتا اور اسی بنا پر ان سے استناد بھی نہ کرتا تھا۔ غالب کا بھی یہی موقف تھا، وہ امیر خسرو کے علاوہ کسی ہندوستانی شاعر کو قابلِ تقلید یا قابلِ استناد

نہیں سمجھتے تھے۔

پروفیسر مختار الدین احمد نے مشہور انشاپرداز اور طنز نگار پروفیسر رشید احمد صدیقی کے وہ خطوط جمع کر دیے ہیں جو ڈاکٹر سید عابد حسین کے نام ہیں۔ یہ خطوط بڑی تاریخی و ادبی اہمیت کے حامل ہیں۔

اس شمارے میں پاکستان کے چند دانشوروں اور محققوں کے مقالے شامل ہیں، ان حضرات نے میری درخواست پر سلور جوبلی کے لیے مقالے لکھے، میں ان کا تہ دل سے ممنون ہوں۔ میں ان سب مقالہ نگار حضرات کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جنھوں نے اس مخصوص نمبر کے لیے مقالے تحریر فرمائے۔

نذیر احمد

ترتیب

پروفیسر حامدی کاشمیری

غالب جدید دور میں

غالب نابغۂ روزگار ہیں، اپنی غیر معمولی تخلیقی توانائی، حکیمانہ ذہن اور گہرے لسانی شعور
ی بدولت وہ شاعری میں ایک عدیم المثال اور ارفع مقام رکھتے ہیں، ان کی شخصیت میں اتنی
ہمہ گیریت، تہداری اور تاثر پذیری ہے کہ انھوں نے زمان و مکاں کی حد بندیوں سے بالاتر
ہو کر، بنی آدم کے گوناگوں ازلی اور ابدی تجربات کو ذاتی سطح پر محسوس کرکے ان کو لسانی قالب
میں حسن اور دوام عطا کیا ہے، نتیجے میں انسانی فکر، جمالیات، تہذیب اور اقدار کے نئے
افق روشن ہوئے ہیں، ان کی شخصیت کی بے کرانی اور تہداری کا اندازہ اقبال کے اس
شعر سے لگایا جا سکتا ہے:

دلم بہ دوش، نگاہم بہ عبرت امروز
شہید جلوۂ فردا، و تازہ آئینم

غالب ۱۷۹۷ء میں آگرے میں پیدا ہوئے ۱۸۱۳ء میں وارد دلی ہوئے، اور ۱۸۶۹ء
میں رحلت کر گئے، واقعہ یہ ہے کہ غالب کو وارد دلی ہونے کے بعد ہی ملک کے ابتر ہوتے ہوئے
حالات کا قریب سے مطالعہ کرنے کا موقع ملا، اس سے قبل وہ ایام طفولیت آگرہ کے رولتی
جشن و نشاط اور شعر و نغمہ کے کیف پرور ماحول میں گزار چکے تھے۔ نواب زادہ تو تھے ہی، اس

بے پروا دنیا کے بدلتے حالات سے بے خبر رند مشربی، آزردہ روی اور عیش کوشی میں منہمک رہے۔ غداری کے سلسلے میں دلی کے، تو ان کے سارے خواب بکھر گئے، دلی میں تہذیب و شائستگی کی اقدار پراگندگی کی حالت میں تھیں، معاشرے میں تکلف تصنع، رسوم ظاہری اور رعایت پرستی عام تھی، انانیت کے گہرے احساس کے باوجود ان کی وہ قدر افزائی نہ ہو سکی، جس کے وہ حقدار اور متمنی تھے۔ ذوق استادِ شہ تھے۔ اور غالبؔ کو اپنی آبرو کے تحفظ کی فکر دامن گیر تھی، مالی دشواریاں اتنی سخت تھیں کہ روزمرہ کی ضروریات کی کفالت بھی مشکل تھی، انھیں بہت جلد محسوس ہوا کہ سلطنت مغلیہ کا ستارۂ اقبال ڈوب رہا ہے۔ اور ایک بدیسی قوم ایک نئی جارح اور قابض تاریخی قوت کے طور پر ملک کے سیاہ و سپید کی مالک بن رہی ہے۔ اس مرحلے پر انھوں نے جذباتیت سے کنارہ کش ہو کر سیاسی تبدیلی کی ناگزیریت کو تسلیم کیا، اس کا ثبوت سرسید کی آئین اکبری پر ان کی تقریظ سے ملتا ہے، جس میں انھوں نے ماضی کی روایات سے برگشتگی کا اعلان کیا، اور انگریزوں کی "داد و دانش" کی ستائش کی،

صاحبانِ انگلستاں را نگر — شیوہ و انداز اینان را نگر

تا چہ آئیں ہا پدید آوردہ اند — آنچہ ہرگز کس ندید آوردہ اند

داد و دانش را بہم پیوستہ اند — ہند را صد گونہ آئیں بستہ اند

تاہم بدلتے حالات سے ان کی یہ ذہنی مفاہمت اتنی یک رخی اور واضح نہیں، جتنا کہ یہ دکھائی دے رہی ہے، حقیقت یہ ہے کہ ان کے رویے کی یہ تبدیلی ان کے دل و دماغ میں کشمکش پیدا کرنے والی غیر معمولی پیچیدگیوں سے مربوط ہے، جن کے محرکات تاریخی سیاسی اور تہذیبی انتشار اور تضاد میں مضمر ہیں، آبائی طور پر امارت اور خاندانی وجاہت کے گہرے احساس اور بچپن میں عیش پرستانہ ماحول میں پرورش کی بنا پر ان کی شخصیت کی جڑیں ماضیت کی آن بان میں پیوست ہیں، لیکن وہ حال کے پرآشوب حالات سے باخبر ہیں، ساتھ ہی ساتھ ان کی نظر مستقبل کے نادیدہ امکانات پر بھی ہے، فکر و نظر کی یہ وسعت پذیری ان کی ہمہ گیر شخصیت کی دلیل ہے۔ انھوں نے تاریخی قوتوں کی عمل آوری پر نظر رکھی، تاہم ان کا تاریخی شعور محض ایک مورخ کا شعور نہیں جو گزرے ہوئے حالات و

واقعات کی ترتیب و تدوین سے علاقہ رکھتا ہے، اس کے برعکس، یہ ایک فنکار کی فعال تخلیقی حیثیت ہے۔ جو تی نفسہٖ موجود حقائق کے بجائے ان دور رس تشکیلی اثرات کی باز آفرینی کرتی ہے، جو داخلی شخصیت پر نقش ہوتے ہیں، اس لیے ان کے کلام میں تاریخی یا عصری حالات کی نشاندہی اگر محض تاریخی نقطۂ نظر سے کی جائے، تو وہ لاحاصل ہوگی، یہ درست ہے کہ فنکار بھی دیگر ذی شعور لوگوں کی طرح تاریخ کے نشیب و فراز سے گزرتا ہے، لیکن وہ تاریخ رقم نہیں کرتا، بلکہ تاریخی واقعات کے اثر و نفوذ کو داخلی شخصیت کے بسیار گونہ عوامل میں تحلیل کرکے "محشر خیال" بن جاتا ہے۔

غالب نے بلاشبہ اپنے عہد کے حقائق کا سامنا کیا، اور ان کی شخصیت گہرے انتشار و ابتلا سے واقف ہوئی، لیکن ان کے کلام کے حزنیہ عناصر مثلاً "آئے تازہ واردان۔۔۔" یا "بازیچۂ اطفال ہے۔۔۔" کو محض ان کے عہد سے منسوب کرنا یا محض اس کا نتیجہ قرار دینا درست نہیں، فنکار خارجی حالات کی خودکار ترسیلیت سے کوئی تعلق نہیں رکھتا وہ بقول اقبال اپنے زمانے کا مقابلہ کرتا ہے، اور اپنے زمانے خود خلق کرتا ہے، وہ اپنے عہد کے مکاشفانہ شعور سے داخلی شخصیت میں برپا ہونے والے محشر کو فروغ دیتا ہے، لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے، جب وہ ایک کائناتی بصیرت سے بہرہ ور ہو، جو اسے معاصر حالات کی آگاہی کے ساتھ ساتھ مابعد الطبیعاتی سطح پر زندگی، موت، کائنات اور تباہی کے جیسے ازلی مسائل کی جانب راغب کرتی ہے، غالب بھی ایک ایسے ہی دانشور تخلیق کار ہیں، جو کائناتی بصیرت سے متصف ہیں، انھوں نے معاصر شعور کو کائناتی آگہی کی توسیع و تشدید کا ذریعہ بنایا، یہ کام ایک نابغہ ہی انجام دے سکتا ہے، غالب کے ہمعصر ذوق کے یہ ممکن نہ ہوا، جدید دور میں، خاص کر ترقی پسندی کے عروج کے زمانے میں کتنے شعرا اس میں کامیاب ہوئے؟ غالب کے چند اشعار ملاحظہ ہوں، جن میں ان کا عصری شعور کائناتی وژن میں تحلیل ہوا ہے۔

رہا آباد عالم اہل ہمت کے نہ ہونے سے — بھرے ہیں جس قدر جام و سبو، میخانہ خالی ہے

ملکِ جنوں کہ بھول کے بھی رمیدہ ہوں　　میں دشتِ غم میں آہوئے صیاد دیدہ ہوں

ہے نا امیدی، ہمہ بدگمانی　　میں دل ہوں فریبِ وفا خوردگاں کا

باغ پا کر خفقانی یہ ڈراتا ہے مجھے　　سایۂ شاخِ گل افعی نظر آتا ہے مجھے

سموم وادیِ امکاں زبس جگر تاب است　　گداز زہرۂ خاک است ہر کجا آب است

ہے موجزن اک قلزمِ خوں کاش یہی ہو　　آتا ہے ابھی دیکھیے کیا کیا مرے آگے

مذکورہ بالا اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ غالب کے یہاں معاصر شعور فکری اور جذباتی سطح پر ایک صد درجہ کمپلکس اور متضاد PHENOMENON کو جنم دیتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں جو تصویر خانہ ابھرتا ہے، وہ مغل پینٹنگس کی طرح واضح لکیروں، رنگوں اور شبیہوں سے عبارت نہیں، بلکہ مبہم اور پیچیدہ سرائیلی خاکوں کے مماثل ہے، پس ان کے کلام سے ٹھوس تاریخی یا عصری معلومات کی توقع کرنا بے سود ہے۔ یاد رہے کہ غالب نہ مورخ ہیں، نہ فلسفی، نہ صوفی اور نہ معلم اخلاق، وہ شاعر ہیں۔ اور پہلے سے طے کردہ کسی فلسفے نظریے یا عقیدے کے تحت زندگی اور کائنات کا مطالعہ نہیں کرتے، بلکہ ہر نوع کی ذہنی جکڑ بندیوں کی شکست کرکے پوری ذہنی آزادی کے ساتھ حیات و کائنات کے مظاہر و مسائل سے دست و گریباں ہوتے ہیں، اور اپنے انفرادی ردعمل کا اظہار کرتے ہیں یہ ردعمل کسی طے کردہ فکری ضابطے کا پابند نہیں، یہ ان کی انفرادی افتادِ طبع کا زائیدہ ہے۔ غالب صد درجہ تفرد پسند رہے ہیں۔ وہ ایک انفرادی طرزِ حیات کے داعی رہے، اور ذہنی اور تخلیقی طور پر بھی ذہنِ بزرگاں سے منحرف ہوکر اپنے مزاج کے تقاضوں کی پاسداری کرتے رہے یہاں تک کہ ان کے ذہنی اور تخلیقی مظاہر میں بھی انفرادیت کی چھاپ نمایاں ہے۔
زندگی کے بارے میں یہ آزادانہ رویہ ان کے یہاں تجربات کی وسعت اور گوناگونی

کو ماند کر دیتا ہے، اور وہ اردو کے تمام شعرا پر سبقت لے جاتے ہیں۔ تجربات کی بوقلمونی شیکسپیر کی طرح ان کی عظمت کے لیے ٹھوس بنیاد فراہم کرتی ہے۔ چنانچہ ان کی شاعری میں قوس قزح کی رنگوں کی ایک نادر دنیا آباد ہے، اس دنیا میں انسان بدلتے رنگوں گویا کرداروں اور محیرالعقول واقعات کی فراوانی دیکھ کر متحیر ہو جاتا ہے، اور تحیر تجسس اور انکشاف کے متنوع جذبات سے گزرتا ہے۔ اس ضمن میں آرزو/ شکستِ آرزو، ایقان/ محرومی، معنویت/ لغویت، متانت/ ظرافت، جنت/ دوزخ، راحت طلبی/ ایذا پسندی، آب/ سراب، واقعیت/ التباس، وصل/ وداع اور آگہی/ غفلت متنوع اور متضاد کیفیات مشتے نمونے از خروارے کے مصداق محض چند مثالیں ہیں۔ بلاشبہ کلام غالب انسانی تجربات کا وہ غیر مختتم خزانہ ہے، جو قبل التاریخی دور سے لے کر آج تک کے انسان کی لوحِ تقدیر پر نقش ہے۔

غالب اپنے دور کی "رنگا رنگ بزم آرائیوں" کو "نقش و نگار طاقِ نسیاں" دیکھ کر دل گرفتہ و مغموم ہوئے، اور "دیدۂ عبرت نگاہ" بن گئے، تاہم تہذیبی اداروں کی بے رونقی اور زوال ان کے نزدیک محض تہذیبی اقدار و مظاہر کی زوال پذیری ہی نہیں، بلکہ تباہی کے کائنات گیر عمل کا حصہ ہے۔ اس کی رو سے انسان، فطرت، موت، غم، بڑھاپے اور زوال کی ناقابلِ تسخیر قوتوں سے مستقل آویزشوں میں گرفتار ہوتا ہے۔ اور ناگزیر تباہی کا سامنا کرتا ہے، یہ فلسفیانہ اندازِ فکر ہے، جو فلسفے کی کتابوں کے مطالعے سے نہیں بلکہ — "حیرت آبادِ تمنا" میں وارد ہو کر اپنی واقعیت کا احساس دلاتا ہے، یہ مفکرانہ شعور "اندیشۂ سود و زیاں" سے بالاتر ہو جاتا ہے۔ اور روزمرہ زندگی کے واقعات کو بھی ایک نئی روشنی میں پرکھتا ہے۔ اور فنکار پر پیدائش، موت، کائنات، غم و مسرت اور ربط و اقدار کی معنویت یا عدم معنویت منکشف کرتا ہے، غالب نے ایسا ہی کیا، انھوں نے غدر کے بعض شعرا کی طرح وقتی شہر آشوب نہیں لکھے، وہ آشوبِ آگہی سے متصادم رہے۔ یہی وہ مفکرانہ رویہ ہے، جو غالب کو جدید ذہن کے قریب کرتا ہے۔

موجودہ صدی میں سائنسی علوم اور جدید انکشافات نے طلسم کائنات کی

پیدا کرتا ہے کے عمل کو تیز کیا ہے۔ مختلف علوم جدیدہ خصوصاً نظریات، نفسیات، طبیعات اور فلسفہ کی مدد سے کائنات کی غالب قوتوں کے مقابلے میں انسان کی اصل حیثیت نمایاں ہو رہی ہے۔ اور فکر دانش بھی روایتی حد بندیوں سے نکل کر جدیدیت کی کشادگی سے ہمکنار ہو رہی ہے۔ اس سبب کے فروغ کے نتیجے میں حیات و کائنات کے بارے میں پرانے معتقدات ماضی کا حصہ بنتے جا رہے ہیں۔ اور ان کی تفہیم جدید حسیت کے مطابق کی جا رہی ہے۔ یہ ایک ہمہ گیر ذہنی انقلاب ہے۔ جس سے موجودہ دور کا فنکار گزر رہا ہے۔ تاہم کلاسیکی شعراء اور جو فنکار اس ذہنی رویے کے مؤید رہے ہیں، وہ زمانی بعد کے باوجود جدید ذہن کے لیے معنویت رکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ غالب شناسی کی جانب بھرپور توجہ دی جا رہی ہے اور میر تقی میر کی احیا کا کام بھی تیزی سے جاری ہے۔

غالب کی 'دیدہ وری' کا ثبوت یہ ہے کہ وہ انیسویں صدی ہی میں شعور کے اس خواب شکن انقلاب سے گزر چکے ہیں، جو اقدار شکنی، اخلاقی پامالی اور تشدد پرستی کے ہولناک مناظر کی بنا پر موجودہ فنکار کی تقدیر ہے۔ موجودہ فنکار معاشرتی طور پر عالمگیر جنگوں مادیت پرستی سے بے چہرگی اور تہذیبی بحران سے آشنا ہے، اور فکری سطح پر وہ انسانی زندگی کی اصل اور غایت کے چکرا دینے والے سوالات سے متعارف ہے۔ غالب مغربی تہذیب کے ابتدائی آثار و قرائن سے ہی بخوبی اندازہ لگا چکے تھے کہ روایتی معاشرہ انتشار کی زد میں ہے اور اس کے ساتھ ہی روایتی آداب و اقدار اور خیالات و معتقدات بھی تباہی کی لپیٹ میں ہیں۔

ہے موجزن اک قلزمِ خوں، کاش یہی ہو
آتا ہے ابھی دیکھیے کیا کیا مرے آگے

مستعدِ قتلِ یک عالم ہے جلادِ فلک
کہکشاں موجِ شفق میں تیغِ خوں آشام ہے

نتیجتاً ان کی فکری تگ و تاز بالآخر انسان کی مظلومیت اور بیچارگی ہی پر مرتکز ہوتی ہے۔

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لیے

برگشتگی کا یہ رویہ کسی منضبط یا طے کردہ فلسفیانہ نظریے سے کوئی مطابقت نہیں رکھتا، یہ کم و بیش عقلی امکانات کے باوجود ان کی جبلی خصائص سے متعلق ہے، یہی وجہ ہے کہ یہ نظریاتی کٹرپن اور انجماد سے دور ہے۔ یہ جبلی اور احساسی کیفیات سے زیادہ مربوط ہے، اس لیے زندگی اور فطرت کے جمالیاتی وجود کا معترف ہے۔ اور زندگی کے لامحدود امکانات سے صرف نظر نہیں کرتا، غالب ایک جانب زندگی کی لایعنیت کی انتہی پرزور وکالت کرتے ہیں کہ دنیا کو "بازیچۂ اطفال" قرار دیتے ہیں۔ اور "دانا و نادان" پر خندہ زن ہوجاتے ہیں، تاہم دوسری طرف "ہوس کے نشاط کار" کے قائل ہیں وہ تمنا کے آگے دشت امکاں کو ایک نقش پا قرار دیتے ہیں، انھیں تیرہ شبی میں "مژدۂ صبح" ملتا ہے:

ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا ۔۔۔ نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب ۔۔۔ ہم نے دشت امکاں کو ایک نقش پا پایا

مژدۂ صبح دریں تیرہ شبانم دادند ۔۔۔ شمع کشتند و ز خورشید نشانم دادند

متذکرہ بالا اشعار سے مترشح ہوتا ہے کہ غالب اپنے جبلی وجود کے تقاضوں سے باخبر ہیں۔ یہ تقاضے انسان کو یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ فنا پذیر ہے، سرگرم جستجو رکھتے ہیں، مختلف فکری شعبوں مثلاً مذہبیات، تصوف، فلسفہ، نفسیات اور طبیعات نے بھی اس کی توثیق کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جدید دور میں وجودیت کے علمبرداروں نے جہاں نفی ذات پر زور دیا ہے، وہاں اثبات وجود کی وکالت بھی کی گئی ہے، حقیقت یہ ہے کہ زندگی کسی رویے، عقیدے یا نظریے کی پابندی قبول نہیں کرتی۔ یہ کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں لہ غالب کو یہ ادراک حاصل ہے، اور اسی بنا پر وہ جدید شعور کے پیش رو قرار دیے جاسکتے ہیں۔

انھوں نے اپنے اشعار میں آشوبِ آگہی، ہمہ پائی تہ لوگھونی، اور تخیل کردار و واقعہ سے ایک طلسمی آئینہ خانہ خلق کیا ہے۔ جو قاری کو بیخود و وارفتہ و حیران، کر دیتا ہے۔

آئینہ خانہ ہے صحنِ چمنستاں یکسر
بسکہ ہیں بیخود و وارفتہ و حیراں دمِ صبح

شاعر اپنے حیرت انگیز تجربات کے اظہار کے لیے الفاظ کے میڈیم سے کام لیتا ہے لیکن مروجہ لسانی اظہار اس کے لیے ایک چیلنج بن جاتا ہے۔ روایتی زبان بالعموم کثرت استعمال سے کلیشے میں بدل جاتی ہے۔ اور ترسیلیت کے امکانات کی تحدید کرتی ہے ، اس لیے ایک بڑے شاعر کو مروجہ لسانی ڈھانچے کی شکست کر کے ایک نئے لسانی نظام کو واضح کرنا پڑتا ہے۔ غالب نے بھی ایسا ہی کیا، ان کی شعری لسانیات کی منفرد خوبی یہ ہے کہ یہ اردو زبان کی خلقی قوتوں کو بروئے کار لاتی ہے۔ یہ دراصل زبان کے لسانی رموز کی دریافت کا عمل ہے، اس عمل میں غالب نے اردو زبان کی تقدیر بدل دی۔ انھوں نے لفظ کی مخفی توانائی کا انکشاف کیا وہ نہ صرف منفرد لفظ کے متعدد حسی اور معنوی امکانات کو اجاگر کرتے ہیں۔ بلکہ ترکیب سازی سے بھی زبان کی نئی تشکیلات کا کام انجام دیتے ہیں۔

گوہر ز بحر خیزد و معنی ز فکر ژرف
بر ما خراج طبع روانے نہادۂ

ڈاکٹر نیر مسعود

غالب کے یہاں معنی کی پیش رفت

اس گفتگو میں غالب کے ان تین شعروں کے حوالے سے یہ واضح کرنے کی کوشش کی جائے گی کہ معنی کی پیش رفت سے ہماری کیا مراد ہے،

۱۔ تم وہ نازک کہ خموشی کو فغاں کہتے ہو — ہم وہ عاجز کہ تغافل بھی ستم ہے ہم کو

۲۔ غم کھانے میں بودا دلِ ناکام بہت ہے — یہ رنج کہ کم ہے مے گلفام بہت ہے

۳۔ میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا — میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا

لیکن ان شعروں پر گفتگو کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دو اور شعروں کے حوالے سے یہ وضاحت کردی جائے کہ معنی کی پیش رفت سے ہماری کیا مراد نہیں ہے:

۱۔ ان کو آتا ہے پیار پر غصہ — ہم کو غصے پہ پیار آتا ہے

۲۔ اس بلائے جاں سے آتش دیکھیے کیونکر بنے — دل سوا شیشے سے نازک، دل سے نازک خوے دوست

دونوں شعروں میں معنی کا تحرک اور تسلسل موجود ہے لیکن پیش رفت موجود نہیں۔ پہلا شعر ایک قائم صورتِ حال کا ذکر کرتا ہے۔ محبوب کو عاشق کے پیار پر غصہ آتا ہے، عاشق کو وہ غصے میں پیارا معلوم ہونے لگتا ہے۔ محبوب کو عاشق پر غصہ آتا رہے گا اور عاشق کو محبوب پر پیار آتا رہے گا۔ محبوب کا غصہ اور عاشق کا پیار دونوں ایک دوسرے کا سبب بھی ہیں اور نتیجہ بھی۔ علت و معلول کا

یہ دوہرا قسم شعر میں معنی کو متحرک تو رکھتا ہے لیکن آگے نہیں بڑھاتا۔ اسی قسم کا معنوی تحرک مصرع
ثانی میں بھی ہے۔ جو بات عاشق کے نازک دل کو ٹھیس پہنچاتی ہے وہی محبوب کی آزردگی کا
سبب بھی بنتی ہے اس لیے کہ اس کا مزاج عاشق کے دل سے بھی زیادہ نازک ہے۔ یہ آزردگی
عاشق کے دل کو پھر شکستہ کرتی ہے اور یہی شکستگی محبوب کو پھر آزردہ کرتی ہے۔ یعنی یہاں بھی
پہلے شعر کی طرح معنوی صورت حال متحرک مگر قائم ہے۔ اس میں کوئی پیش رفت، بہ الفاظ دیگر
کوئی معنوی تبدیلی یا شدت رونما نہیں ہوتی اور معنی ایک دائرے میں متحرک رہتے ہیں۔

اس دوسرے قسم کے بالمقابل غالب کے پہلے شعر کو رکھیے:

تم وہ نازک کہ خموشی کو فغاں کہتے ہو ہم وہ عاجز کہ تغافل بھی ستم ہے ہم کو

یہاں بھی ایک طرف وہی نازک مزاج محبوب ہے اور دوسری طرف وہی عاشق جس کا دل شیشے کی
طرح نازک ہو چکا ہے لیکن یہاں محبوب کی نازک مزاجی اور عاشق کی نازک دلی کی مثالیں بھی
پیش کر دی گئی ہیں۔ (محبوب کا خاموشی کو فغاں کہنا اور عاشق کے لیے تغافل کا بھی ستم ہونا) اور یہی
مثالیں شعر میں معنی کے تحرک کا دائرہ توڑ کر اسے مسلسل آگے بڑھاتی اور شدید تر کرتی جاتی ہیں۔ عاشق
کے لیے محبوب کا تغافل بھی ستم ہے۔ لیکن محبوب اس کے ساتھ تغافل نہیں برت رہا ہے بلکہ اس کی
خاموشی کو فغاں کہہ کر اس پر واقعی بڑا ستم کر رہا ہے۔ اور عاشق اسے مخاطب کر کے اس ستم کی فریاد
کرنے پر مجبور ہو گیا ہے۔ یہ فریاد اس محبوب کے ستم کی ہے جو اتنا نازک مزاج ہے کہ عاشق کی
خاموشی کو فغاں کہتا ہے۔ ظاہر ہے یہ فریاد اسے مزید آزردہ کرتی ہے اور یہ مزید آزردگی عاشق کی
مزید فغاں کا سبب بنتی ہے اس لیے کہ اب وہ عاجز ہو چکا ہے یعنی محبوب کے ستم پر خاموش یا
غیر متاثر رہنے کی تاب نہیں رکھتا۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ محبوب کا ستم عاشق کے نالے کو اور عاشق کا نالہ
محبوب کے ستم کو بڑھاتا چلا جا رہا ہے۔ اور اسی مناسبت سے شعر میں معنی آگے بڑھ رہے ہیں اور
صورت حال سنگین سے سنگین تر ہوتی چلی جا رہی ہے۔

غالب کا دوسرا شعر:

غم کھانے میں بودا دلِ ناکام بہت ہے یہ رنج کہ کم ہے مے گلفام بہت ہے

معنی کی پیش رفت کی ایک اور عمدہ مثال ہے۔ شراب غم کے احساس کو زائل کر سکتی ہے، بشرطیکہ

تھا لیکن اب عدم سے بھی معدوم ہو چکا ہوں۔ عدم کا عدم وجود ہے۔ میں عدم سے معدوم ہوا تو پھر موجود ہو گیا۔ عنقا عالم وجود میں معدوم اور عالم عدم میں موجود ہے۔ میں عالم عدم میں پہنچا تو وہاں عنقا مجھے موجود ملا، لیکن اپنے محبوب کا وصال مجھے وہاں بھی نصیب نہ ہوا اور میں وہاں بھی اس کے فراق میں آتشیں آہیں سرکرتا رہا جنھوں نے عنقا کے پر جلا دیے۔ آخر غم فراق نے مجھ کو عالم عدم سے بھی معدوم کر دیا اور میں ایک بار پھر عالم وجود میں نظر آنے لگا۔ اور ایسا بارہا ہو چکا ہے۔

بظاہر اس شعر میں معنی کی پیش رفت سے زیادہ معنوی تحرک کی تکرار نظر آتی ہے، یعنی متکلم عالم عدم میں جاتا ہے۔ پھر عالم وجود میں واپس آتا ہے، پھر جاتا ہے، پھر واپس آتا ہے، لیکن شعر میں عدم کے دوسری مرتبہ کا ذکر نہیں ہے۔ غالب نے عدم سے "پرے" ہونے پر زور دیا ہے۔ اور یہی "پرے" کا لفظ معنوی پیش رفت کی کلید ہے۔ نہیں کہا جا سکتا کہ وجود و عدم کا یہ کھیل کب سے ہو رہا ہے اور کب تک ہوتا رہے گا۔ متکلم ایک عالم وجود سے ایک عالم عدم میں پہنچتا ہے، غم فراق میں آہیں کرتا ہوا وہاں سے بھی پرے ہو کر کسی اور عالم وجود میں نمودار ہوتا ہے۔ اور وہاں سے کسی اور عالم عدم میں جا پہنچتا ہے معلوم نہیں اب تک وہ وجود اور عدم کے کتنے عالموں سے گزر چکا اور کتنے عنقاؤں کے پر جلا چکا ہے۔ ابھی تک تو اسے کسی بھی عالم میں محبوب کا وصال میسر نہیں آیا۔ وجود اور عدم کا ہر عالم اس کے لیے عالم فراق ہے، اور بے چینی، محرومی اور فنا در فنا کا یہ سفر ابھی اسے معلوم نہیں کب تک اور کہاں تک کرنا ہے۔

ظاہر ہے ان شعروں میں معنی کی مجموعی پیش رفت ان لفظوں کی مرہون ہے جن میں شاعر نے مضمون ادا کیا ہے، لیکن اس پیش رفت کی طرف ذہن کو خاص طور پر متوجہ کرنے کا کام بہت معمولی لفظوں نے انجام دیا ہے، یعنی پہلے شعر میں لفظ "عاجز" نے (ہم وہ عاجز کہ تغافل بھی ستم ہے ہم کو)، دوسرے شعر میں مصرع ثانی کے "بہت" نے (رید رنج کہ کم ہے ہے گلفام 'بہت ہے')، اور تیسرے شعر میں "پرے" اور "بارہا" نے (میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا میری آہ آتشیں سے بال عنقا جل گیا)، لفظوں کا ایسا استعمال انھیں واقعی گنجینۂ معنی کا طلسم بنا دیتا ہے۔

تفہیمِ غالب

شمس الرحمٰن فاروقی

معروف غالب شناس اور ممتاز جدید نقاد شمس الرحمٰن فاروقی مشرق و مغرب کی ادبیات پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ یہ کتاب ان کی بیس سالہ کاوشوں کا ثمرہ ہے۔

تفہیمِ غالب دیوانِ غالب کی شرح نہیں بلکہ قدیم و جدید شعریات کی روشنی میں مرزا غالب کے ۸۳۱ منتخب اشعار کی ایسی فکر انگیز شرح ہے جو کلامِ غالب پر ایک متوازن تنقید کا درجہ رکھتی ہے اور جس میں فاروقی کا رویہ غالب کے تمام شارحین سے مختلف ہے۔

صفحات	۳۲۸
قیمت	۹۰ روپے

ڈاکٹر وزیر آغا

غالب کی آوارہ خرامی

غالب کی بے قراری، ان کے سوانح ہی سے نہیں، کلام سے بھی مترشح ہے۔ اس بے قراری میں ایک بڑا حصہ ان کے آبائی خون کی گرمی اور تلملاہٹ کا بھی ہے۔ وہ یوں کہ غالب کے آبا ایک طویل مدت تک ہم جوئی میں مبتلا رہ کر نقل مکانی کرتے رہے۔ کم از کم غالب کا دعویٰ یہی ہے مثلاً وہ اپنے سلسلۂ نسب کو تورانیوں سے ملاتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ سلطنتوں کے عروج و زوال سے منسلک تھے اور متعدد بار غریب الوطنی سے آشنا ہوئے۔ خود غالب کے دادا میرزا قوقان بیگ سمرقند سے کابل اور پھر وہاں سے پھرتے پھراتے محمد شاہ کے زمانے میں جب ہندوستان میں وارد ہوئے تو کچھ عرصہ لاہور میں رہے لیکن پاؤں میں چکر تھا اس لیے وہاں سے دہلی آ گئے۔ غالب کے والد میرزا عبداللہ بیگ دہلی میں پیدا ہوئے لیکن ملازمت لکھنؤ میں کی۔ وہاں سے آگرہ کی طرف کوچ کیا۔ آگرہ سے الور گئے۔ واپسی پر ایک مہم میں مارے گئے ہیں۔ ساری ہنگامہ خیز داستان سے غالب کے آبائی خون کی بے قراری کا پتا چلتا ہے۔ ہم جوئی اور سفر کا بے پناہ میلان اس خون میں ودیعت ہو چکا تھا اور اسے خانہ بدوشی کے قدیم انسانی رجحان سے منسلک کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں۔ بعد ازاں غالب کے اشعار میں تخیل کی جو آوارہ خرامی نمودار ہوئی اس کا ان کے قبیلے کی صدیوں پر پھیلی ہوئی آوارہ خرامی سے ایک گہرا تعلق تھا۔ مگر یہ رشتہ زیر سطح

ہونے کے باعث نظروں سے اوجھل رہا۔

خود غالب آگرہ میں پیدا ہوئے لیکن اپنی جنم بھومی کو چھوڑ کر دہلی آ گئے، اور باقی زندگی وہیں گزار دی۔ بظاہر اس سے گمان گزرتا ہے کہ غالب تک آتے آتے ان کے خون کی گرمی مدھم پڑ گئی ہوگی مگر یہ بات صحیح نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ غالب نے دہلی میں زندگی کا بیشتر حصہ تو گزارا لیکن ان کے اندر کا مہم جو انسان اس "زندان" سے باہر آنے کے لیے ہمیشہ پھڑپھڑاتا رہا۔ مثلاً میرزا علاء الدین احمد خاں علائی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"ہر چند قاعدۂ عام یہ ہے کہ عالمِ آب و گل کے مجرم عالمِ ارواح میں سزا پاتے ہیں لیکن یوں بھی ہوا ہے کہ عالمِ ارواح کے گنہگار کو دنیا میں بھیج کر سزا دیتے ہیں چنانچہ آٹھویں رجب ۱۲۱۲ھ کو میرے واسطے حکم دوام حبس صادر ہوا۔ ایک بیڑی میرے پاؤں میں ڈالی اور دلی شہر کو زندان مقرر کیا اور مجھے اس زندان میں ڈال دیا۔ فکر نظم و نثر کو مشقت ٹھہرایا۔ برسوں کے بعد میں جیل خانے سے بھاگا۔ تین برس بلادِ شرقیہ میں پھرتا رہا۔ پایانِ کار مجھے کلکتے سے پکڑ لائے اور پھر اسی محبس میں بٹھا دیا۔ جب دیکھا کہ یہ قیدی گریز پا ہے دو ہتھکڑیاں اور بڑھا دیں۔ پاؤں بیڑی سے فگار، ہاتھ ہتھکڑیوں سے زخم دار، مشقت مقرری اور مشکل ہوگئی۔ طاقت یک قلم زائل ہو گئی۔ بے حیا ہوں۔ سال گزشتہ بیڑی کو زاویۂ زنداں میں چھوڑ، مع دونوں ہتھکڑیوں کے بھاگا۔ میرٹھ، مراد آباد ہوتا ہوا رام پور پہنچا۔ کچھ دن کم دو مہینے وہاں رہا کہ پھر پکڑا آیا۔ اب عہد کیا کہ پھر نہ بھاگوں گا۔ بھاگوں گا کیا؟ بھاگنے کی طاقت بھی تو نہیں رہی۔"

(جون ۱۸۶۱ء)

اس سے ظاہر ہے کہ غالب کی طبیعت کسی ایک پیمانے میں سما نہیں سکتی تھی اور چھلک چھلک جاتی تھی۔ کلکتے کا سفر اس کی ایک مثال ہے۔ بعض لوگوں کا یہ موقف ہے کہ غالب مجبور ہو کر کلکتے گئے تھے ورنہ اس سفر کا سبب سیر و تماشا ہرگز نہیں تھا۔ ثبوت میں وہ غالب کا یہ شعر پڑھتے ہیں جو سفرِ کلکتہ ہی کی پیداوار ہے ؎

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا یعنی
ہوس سیر و تماشا سو وہ کم ہے ہم کو

مگر وہ شاید اس بات کو فراموش کر جاتے ہیں کہ غالب ہی نے سیاح کو ایک خط میں لکھا تھا،
"میں تم سے توقع رکھتا ہوں کہ جس طرح تم نے لکھنؤ سے بنارس تک کے سفر
کی سرگزشت لکھی ہے اسی طرح آئندہ بھی لکھتے رہو گے۔ میں سیر و سیاحت کو
بہت عزیز رکھتا ہوں،

اگر بہ دل نہ خلد ہر چہ از نظر گزرد
زہے روانی عمرے کہ در سفر گزرد"

(بہ حوالہ غالب: از غلام رسول مہر)

اسی طرح کلکتہ کے بارے میں غالب نے جو کچھ اپنے اشعار یا خطوط میں لکھا ہے۔ اس سے یہ ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ ان کے لیے یہ سفر کوئی مصیبت کا پہاڑ تھا بلکہ یوں لگتا ہے جیسے اس سفر کے ہر سنگِ میل سے انھوں نے لطف کشید کیا اور ان کے ہاں مسافر سے کہیں زیادہ سیاح کا جذبۂ سیاحت برانگیختہ رہا۔ اول تو یہی دیکھیے کہ انھوں نے دہلی سے کلکتہ کا سفر ایک ماہ کے بجائے دس ماہ میں طے کیا اور انھیں قدم قدم پر منزل کا گماں ہوتا رہا۔ مثلاً دہلی سے کلکتہ چلے تو لکھنؤ جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن جب لکھنؤ کا خیال آیا تو اسی طرف مڑ گئے اور کچھ عرصہ لکھنؤ میں مقیم رہے۔ وہاں انھوں نے ہوسِ سیر و تماشا کے مقصد کو بظاہر رد کیا لیکن اسی غزل میں سے

مقطع سلسلۂ شوق نہیں ہے یہ شہر
عزمِ سیرِ نجف و طوفِ حرم ہے ہم کو

ملا کر کم از کم یہ ضرور کہہ دیا کہ لکھنؤ ان کے سلسلۂ شوق ہی کی ایک کڑی تھا۔ نیز یہ کہ اندر کی کوئی طاقت انھیں آگے ہی آگے کو لیے جا رہی تھی۔ یہ طاقت وہی سلسلۂ شوق تھا جس نے انھیں لکھنؤ سے کانپور اور کانپور سے باندہ پہنچا دیا۔ پھر وہ چلہ تارہ گئے اور وہاں سے کشتی کی سیر کرتے ہوئے الٰہ آباد پہنچے۔ الٰہ آباد سے بنارس آئے تو ان کی حِسِ سیاحت نے نظری

طرح کم دستیاب ہو۔ یعنی اگر غم زیادہ ہو یا غم کی زیادہ تاب نہ ہو تو شراب کی زیادہ مقدار مطلوب ہوگی۔ اس شعر کے متکلم کا دل غم سہنے میں کمزور ہے اس لیے اسے زیادہ شراب چاہیے یعنی شراب کم ہے۔ اب اس کے غموں میں شراب کی کمی کا مزید رنج شامل ہو گیا، اور چونکہ اس کا دل غم کھانے میں بودا ہے اس لیے شراب کی کمی کا رنج جتنا ہونا چاہیے تھا اس سے زیادہ ہو جاتا ہے۔ غم کی یہ زیادتی ہے جو شراب کی مقدار میں اور بھی زیادتی کا تقاضا کرتی ہے جس کے نتیجے میں شراب کی مقدار جو پہلے ہی کم تھی اور بھی کم معلوم ہونے لگی۔ اس مزید کمی کی وجہ سے غم اور مزید بڑھ گیا اور اسی تناسب سے شراب کی مقدار مزید کم ہو گئی۔ یعنی ایک طرف غم ہے جو بڑھتا چلا جاتا ہے، دوسری طرف شراب رکھے رکھے کم ہوتی چلی جا رہی ہے۔ یہاں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ شراب کی کمی اور غم کی زیادتی ایک دوسرے کا سبب بھی ہیں اور نتیجہ بھی۔ علت و معلول کا دہرا رشتہ جس کا ذکر پہلے آیا، یہاں بھی موجود ہے۔ لیکن یہاں معنی کسی ایک سطح پر محصور نہیں بلکہ مسلسل پیش رفت کر رہے ہیں۔ یہ پیش رفت تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی ہے اور دوسرے مصرعے میں "کم ہے گلفام بہت ہے" میں "بہت" کا لفظ معنی کی پیش رفت کو انتہائے گوارا کر لا انتہا تک پہنچا رہا ہے۔

انتہا سے لا انتہا کی طرف معنی کی پیش رفت کی ایک غیر معمولی مثال غالب کا یہ شعر ہے:

میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا

عشقِ حقیقی کا تقاضا یہ ہے کہ عاشق محبوب کے فراق میں اتنا بے قرار ہے کہ اس کا وجود فنا ہو جائے۔ تب اسے معشوقِ حقیقی کا وصال نصیب ہوگا۔ کسی عاشق کا زندہ ہونا اس کا ثبوت ہے کہ اس کا عشق درجۂ کمال کو نہیں پہنچا ہے۔ غالب کے شعر کا متکلم زندہ موجود ہے اور بظاہر حقیقی عاشق نہیں ہے۔ لیکن اس کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ عشق کی بے قراری اور فنا کے تجربے سے گزر چکا ہے، اور ایک بار نہیں، بارہا، اور یہ سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا ہے۔ شعر میں معنی کی پیش رفت اس تسلسل کے اس عجیب و غریب پیرایۂ اظہار سے ہوتی ہے جو غالب ہی کا حصہ ہے۔ یہ اظہار یوں ہوا ہے:

میں عدم سے بھی پرے ہوں۔ یعنی میں عالمِ وجود سے معدوم ہو کر عالمِ عدم میں پہنچا

ملف اندوزی کے میلان کو زبان عطا کردی۔ چنانچہ بنارس کی تعریف میں یوں رطب اللسان ہوئے ہے

تعالی اللہ بنارس چشم بد دور
بہشتِ خرم و فردوس معمور

اور ایک خط میں یوں لکھا:

"بھائی بنارس خوب شہر ہے اور میرے پسند ہے۔ ایک مثنوی میں نے اس کی تعریف میں لکھی ہے۔"

بنارس کے بعد کلکتہ پہنچے اور وہاں دو برس تک مقیم رہے۔ اصولاً اس عرصہ میں وطن کی یاد کے نتیجے میں ایک گمبھیر اداسی غالب پر مسلّط ہو جانی چاہیے تھی لیکن غالب کے اندر کا سیاح عزیب الوطنی کے نکیلے احساس سے قطعاً متاثر نہ ہوا۔ چنانچہ کلکتہ میں نہ صرف ان کا دل لگ گیا بلکہ وہ اس پر فریفتہ بھی ہو گئے۔ لکھتے ہیں:

کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں　　اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے
وہ سبزہ زار ہائے مطرّا کہ ہے غضب　　وہ نازنیں بتانِ خود آرا کہ ہائے ہائے
صبر آزما وہ ان کی نگاہیں کہ حف نظر　　طاقت رُبا وہ ان کا اشارا کہ ہائے ہائے
وہ میوہ ہائے تازۂ و شیریں کہ واہ واہ　　وہ بادہ ہائے نابِ گوارا کہ ہائے ہائے

غالب کلکتہ سے لوٹ آئے لیکن ان کی طبیعت کی بے قراری انھیں ہمیشہ سفر پر اکساتی رہی وہ ذوق کی طرح دلّی کی گلیوں کی خاک نہیں تھے بلکہ ان گلیوں میں ان کا سانس رکنے لگتا تھا اور وہ اس "زندان" سے باہر نکلنے کے متمنی رہتے تھے۔ بایں ہمہ کلکتہ کے بعد غالب صرف تین بار سفر کر سکے یعنی دو بار تو وہ رام پور گئے اور ایک دفعہ میرٹھ۔ مگر ان کے ہاں سفر کی لگن کا اندازہ اسی بات سے لگایئے کہ انھوں نے مختلف موقعوں پر کالپی، مارہرہ، فرخ آباد، گوالیار، انبالہ حتیٰ کہ سورت تک جانے کا ارادہ کر لیا تھا بلکہ جب قمار بازی کے سلسلے میں تین ماہ کی قید کاٹ کر رہا ہوئے تو ہندوستان کو چھوڑ دینے کے متمنی تھے۔ مثلاً "یادگارِ غالب" میں مولانا حالی نے غالب سے یہ فقرے منسوب کیے ہیں:

میری یہ آرزو ہے کہ اب دنیا میں نہ رہوں اور اگر رہوں تو ہندوستان میں نہ رہوں۔ مصر ہے، ایران ہے، بغداد ہے۔ یہ بھی جانے دو۔ خود کعبہ آزادوں کی جائے پناہ اور آستانۂ رحمۃ للعالمین، دلدادوں کی تکیہ گاہ ہے۔ دیکھیے وہ دن کب آئے گا کہ درماندگی کی قید سے جو اس گذری ہوئی قید سے زیادہ جاں فرسا ہے، نجات پاؤں اور بغیر اس کے کہ کوئی منزلِ مقصود قرار دوں سر بصحرا نکل جاؤں۔

(یادگارِ غالب، ص ۳۳)

غالب سے منسوب یہ بیان اس اعتبار سے بہت دلچسپ ہے کہ یہ غالب کی دبی ہوئی آرزوئے سیاحت کی نشان دہی کرتا ہے۔ ہرچند انھوں نے انتہائی دکھ کے عالم میں یہ الفاظ کہے لیکن دیکھیے کہ سیر کے لیے ان تمام جگہوں کا نام لیتے گئے جہاں وہ جانا چاہتے تھے۔ حد یہ کہ کعبہ کا ذکر بھی کر دیا اور گو یہ ذکر اس طور آیا کہ وہ کعبہ کی زیارت سے اپنے دکھوں کا مداوا چاہتے تھے لیکن میرا اندازہ ہے کہ دراصل طوافِ کعبہ بھی ان کے سلسلۂ شوق ہی کی ایک کڑی تھا نہ کہ کسی روحانی طلب کی تسکین کا ذریعہ! اس کا ایک ثبوت تو یہ ہے کہ ان کے اس بیان میں کعبہ ان کی آخری منزل نہیں۔ وہ بات ایران اور مصر کے ذکر سے شروع کرتے ہیں اور کعبہ کا ذکر کرتے ہوئے منزلِ مقصود تک سے بے نیاز ہو کر "سر بصحرا نکل جانے" کی آرزو کرنے لگتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ وہ سفر کے طالب تھے نہ کہ کسی خاص منزل کے۔ دوسرا ثبوت یہ ہے کہ جب ایک بار ان کے ممدوح نے حج کا ارادہ کیا تو غالب کے دل میں بھی ساتھ جانے کی آرزو پیدا ہوئی مگر اس آرزو میں سیر کا جذبہ حصولِ ثواب کے جذبے پر غالب تھا چنانچہ برملا کہا ؂

غالب گر اس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں
حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی

مگر ذکر غالب کے سفرِ رام پور کا تھا۔ غالب دو بار رام پور گئے۔ بظاہر اس کی ایک خاص وجہ تھی بعینہٖ جیسے کلکتہ جانے کا بھی ایک خاص سبب تھا۔ مگر جس طرح غالب نے کلکتہ کے سفر کو سیاحت میں تبدیل کر لیا تھا بالکل اس طرح رام پور جاتے ہوئے وہ اپنے ذوقِ سیاحت کی تسکین کا سامان فراہم کرتے رہے اور اجنبی جگہوں نے انھیں اداسی کے بجائے لطف عطا کیا۔ مثلاً رام پور کے

بلدے میں میر مہدی مجروحؔ کو لکھتے ہیں:

"ابابابا! میرا پیارا میر مہدی آیا۔ آؤ بھائی مزاج تو اچھا ہے؟ بیٹھو یہ رامپور ہے، دارالسرور ہے، جو لطف یہاں ہے وہ اور کہاں ہے؟ پانی سبحان اللہ! شہر سے تین سو قدم پر ایک دریا ہے اور کوسی اس کا نام ہے۔ بے شبہ چشمۂ آبِ حیات کی کوئی سوت اسی میں ملی ہے۔ خیر، اگر یوں بھی ہے تو بھائی، آبِ حیات عمر بڑھاتا ہے لیکن اتنا شیریں کہاں ہوگا!"

(فروری ۱۸۶۰ء)

سفر سے غالبؔ کے لگاؤ کا ایک دلچسپ پہلو یہ بھی ہے کہ دہلی کی طرف واپسی ان کے لیے کسی خاص کشش کا باعث نہیں ہوتی تھی۔ یہ بات غالب کے ہاں ہجر جوئی کے جذبے کی غماز ہے۔ کہ رکنے کا عمل ان کی طبیعت پر گراں اور چلتے رہنا ان کے لیے ہمیشہ باعثِ تسکین ہوتا تھا۔

غالبؔ آگرہ میں زندگی کے انیس برس گزارنے کے بعد دہلی آئے اور پھر یہیں کے ہو رہے مگر یوں لگتا ہے جیسے دہلی کے در و دیوار سے انھیں ہول آتا تھا اور وہ اسے "زنداں" کہنے سے بھی ہچکچاتے نہیں تھے۔ علائی کی طرف اپنے خط میں تو انھوں نے اپنے ردِعمل کا برملا اظہار بھی کر دیا۔ اسی طرح غدر کے ایام میں جب دہلی شہر کے اندر آنے اور باہر جانے پر ہر قسم کی پابندیاں عائد ہوئیں تو غالبؔ کو سانس رکنے کا احساس ہوا تھا۔ چنانچہ اپنے متعدد خطوط میں بڑے کرب آمیز لہجے میں ان سختیوں کا ذکر کرتے ہیں۔ غالبؔ خود کو تنہا محسوس کرتے تھے کہ انفرادیت کے نتیجہ میں تنہائی کا احساس ناگزیر ہے۔ تاہم انھوں نے تازہ سانس لینے کے لیے اپنے چاروں طرف کی کھڑکیاں ضرور کھول رکھی تھیں۔ یہ کھڑکیاں وہ دوست اور احباب تھے جن سے وہ سدا گفتگو رہتے۔ کبھی شعر کے ذریعے سے، کبھی خط کے واسطے سے، کبھی ملاقات کے وسیلے سے! مگر جب غدر میں یہ کھڑکیاں یکے بعد دیگرے بند ہوتی چلی گئیں تو غالب کو اپنی تنہائی اور بے بسی کا احساس اور بھی شدت سے ہونے لگا:

"انگریزی قوم میں سے جو ان روسیہ کالوں کے ہاتھوں قتل ہوئے ان میں سے کوئی میرا امید گاہ تھا اور کوئی میرا شفیق اور کوئی میرا دوست اور کوئی میرا یار اور

کوئی میرا شاگرد۔ ہندوستانیوں میں کچھ عزیز، کچھ دوست، کچھ شاگرد، کچھ معشوق سو وہ سب کے سب خاک میں مل گئے۔ ایک عزیز کا ماتم کتنا سخت ہوتا ہے جو اتنے عزیزوں کا ماتم دار ہو اس کو زیست کیوں کر نہ دشوار ہو۔ ہائے اتنے یار مرے کہ جو اب میں مروں گا تو میرا کوئی رونے والا بھی نہیں ہوگا۔"

(میرزا تفتہ کے نام)

غالب کے خون میں آوارہ خرامی کے اجزا کی فراوانی اس بات سے بھی ظاہر ہے کہ انھوں نے عمر بھر اپنا مکان نہ بنوایا اور نہ ایک ہی مکان میں سکونت رکھی۔ مکان مثل درخت کی جڑ کے ہے کہ جب انسان مکان بناتا ہے تو دھرتی سے رشتۂ ازدواج قائم کرتا ہے۔ مگر غالب کی طبیعت کسی ایک جگہ رُکنے پر مشکل ہی سے مائل ہو سکتی تھی۔ چنانچہ وہ ہر چند کہ عمر بھر دہلی میں رہے لیکن شہر چھوڑنے کی آرزو کو مکان چھوڑنے کے عمل سے پورا کرتے رہے۔ مولانا حالی لکھتے ہیں:

"ہمیشہ کرایہ کے مکانوں میں رہا کیے یا ایک مدت تک میاں کالے صاحب کے مکان میں بغیر کرایہ کے رہتے تھے۔ جب ایک مکان سے جی اکتایا۔ اسے چھوڑ کر دوسرا مکان لے لیا۔" (یادگارِ غالب ص ۲۲)

قطبان بیگ کی حویلی، کالے میاں کی حویلی، حکیم محمد حسن خاں کی حویلی۔ غالب ایک خانہ بدوش کی طرح عمر بھر اپنا بوریا بستر اٹھائے ایک مکان سے دوسرے مکان میں منتقل ہوتے رہے۔ محض اس لیے کہ بقول حالی وہ ایک جگہ رہتے ہوئے اس سے اکتا جاتے تھے۔ آخری مکان گلی قاسم جان کے موڑ پر تھا۔ وہاں بھی نہ رہے موت کی پالکی میں بیٹھ کر ہوا ہو گئے۔

غالب مکان ہی نہیں گھر کی تنگ دامانی سے بھی نالاں تھے۔ ان کے لیے گھر ایک بندی خانے سے زیادہ اہمیت نہ رکھتا تھا۔ ذرا ملائم الفاظ میں سرائے کا کمرہ کہہ لیجیے۔ بیوی کو بیڑی اور عارف کے بچوں کو ہتھکڑیاں کہہ کر پکارنا ان کی اس خاص روش ہی کا غماز ہے۔ اپنی کوئی اولاد نہیں تھی عارف کے دونوں بیٹوں کو اپنے گھر میں لے آئے۔ عارف انہیں عزیز تھے۔ اس لیے چاہیے تو یہ تھا کہ عارف کے دو بیٹے یعنی باقر علی خاں اور حسین علی خاں ان کے لیے ایک قیمتی اثاثہ قرار پاتے لیکن غالب انہیں ہتھکڑیاں کہتے ہیں اور دبی زبان میں ان کے پھیلائے ہوئے شور و شغب

سے ناپسندیدگی کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ مثلاً تفتہ کو لکھتے ہیں:

"اس کے (یعنی عارف کے) دونوں بچے کہ وہ میرے پوتے ہوتے ہیں میرے پاس آرہے ہیں اور دم بدم مجھے ستاتے ہیں۔ میں تحمل کرتا ہوں خدا گواہ ہے کہ تم کو اپنا فرزند سمجھتا ہوں۔ پس تمہارے نتائج طبع میرے معنوی پوتے ہوتے ہیں۔ جب اس عالم کے پوتوں سے کہ مجھے کھانا نہیں کھانے دیتے، مجھ کو دوپہر کو سونے نہیں دیتے، ننگے ننگے پاؤں پلنگ پر رکھتے ہیں، کہیں پانی لڑھکا دیتے ہیں، کہیں خاک اڑاتے ہیں، میں تنگ آتا ہوں تو ان معنوی پوتوں سے کہ ان کی یہ باتیں نہیں ہیں کیوں گھبراؤں گا۔" (۱۸، جون ۵۲ ۱۸ء)

حقیقت یہ ہے کہ وہ اصلی اور معنوی دونوں قسم کے پوتوں سے نالاں تھے۔ ہر گو یہ بات تفتہ کو بڑے لطیف انداز میں یہ بات سمجھا گئے۔ مگر نہ تفتہ نے انھیں معنوی پوتے ارسال کرنا ترک کیے اور نہ اصلی پوتے ان سے جدا ہوئے اور وہ اپنے خطوں میں ان کے تکلف پر ندے پالنے اور قرض لینے کی داستان کو بڑے التزام سے بیان کرتے رہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ پوتے غالب کی تنہائی کو بانٹتے نہیں تھے بلکہ اس میں مخل ہوتے تھے۔ تو کیا غالب کو اپنی تنہائی عزیز تھی؟ سفر کرنے والا، چاہے وہ جسمانی طور پر مصروف سفر ہو یا تخیلی طور پر، تنہائی کو ہمیشہ عزیز جانتا ہے کہ اسی حالت میں وہ پوری طرح متحرک ہو سکتا ہے۔ غالب فطری طور پر متحرک تھے اس لیے شور وشغب سے اپنے ذہن کی رفتار کو مدھم پڑتے دیکھتے تو دبی زبان میں اس پر احتجاج ضرور کرتے۔ یہی حال بیوی سے ان کے تعلقات کا تھا۔ بلکہ اس ضمن میں تو ان کا مقصد مرزا حاتم علی مہر کے نام لکھے گئے خط سے بالکل ہی عیاں ہو گیا ہے۔ وہ مہر کو اس کی بیوی کی بے وقت موت پر یوں دلاسا دیتے ہیں:

"کسی کے مرنے کا وہ غم کرے جو آپ نہ مرے، کیسی اشک فشانی، کہاں کی مرثیہ خوانی آزادی کا شکر بجا لاؤ۔ غم نہ کھاؤ اور اگر ایسے ہی اپنی گرفتاری سے خوش ہو تو چنّا جان نہ سہی، منا جان سہی۔ میں جب بہشت کا تصور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر مغفرت ہو گئی اور ایک قصر ملا اور ایک حور ملی، اقامت جاودانی ہے اور اسی ایک نیک بخت کے ساتھ زندگانی ہے۔ اس تصور سے جی گھبراتا ہے اور کلیجہ منہ کو آتا ہے۔

ہے بے ثمر۔ اسیری ہو جائے گی۔ طبیعت کیوں دگھبرائے گی۔ وہی از مردیں
کاش وہ، وہی طوطی کی ایک شاخ چشم بددور، وہی ایک گھر! بھائی ہوش میں
آؤ۔ کہیں اور دل لگاؤ۔ (۱۸۶۰ء)

ایک اور خط میں بیوی کو 'بیڑی' کا لقب عطا کیا ہے۔ چنانچہ دوسروں کو لکھے گئے خطوں میں استانی جی
بیگم غالب کے بارے میں ایک آدھ فقرہ اگر لکھ دیا تو لکھ دیا یا کھانا کھانے یا دالان میں دھوپ
سینکنے کے لیے دو گھڑی کے لیے گھر میں آگئے تو آگئے ورنہ گھر کی چار دیواری، جس کی تعمیر میں جذباتی
وابستگی کا ہاتھ ہوتا ہے، ان کے لیے کچھ ایسی باعثِ تسکین نہ تھی۔

یہ سب درست! لیکن اگر آوارہ خرامی کی خواہش اور زنداں سے باہر آنے کی تمنا ان
کے کلام میں موجود نہیں تو پھر ان تمام کوائف کو محض غالب کے اضطراری افعال کہہ کر باسانی مسترد
کیا جا سکتا ہے۔ تاہم جب ان کے کلام کا مطالعہ کریں تو ایک بے قرار روح زنداں میں پھڑپھڑاتی
ہوئی صاف دکھائی دیتی ہے۔ اس ضمن میں پہلی بات تو یہ ہے کہ غالب کے اشعار کی بُنت میں
روزمرہ، محاورہ اور معاملہ بندی کے رجحان سے کہیں توانا رجحان تشبیہ و استعارہ یا تخیل کے
لطیف ہیولوں کی تعمیر کا ہے۔ تشبیہ بجائے خود آوارہ خرامی کے رجحان پر دال ہے۔ یہ کسی شے یا
کیفیت کو بعینہٖ پیش کرنے کے بجائے ہمیشہ اسے تقابل سے پیش کرتی ہے اور یوں گویا ایک
شے سے پھدک کر کسی دور کی شے پر بسیرا کرنے کے بعد واپس اپنی اصل جگہ پر آجاتی ہے۔ تشبیہ
کسی شے کی نرمی یا گرمی کا احساس دلانے کے لیے ناظر کا ہاتھ پکڑ کر اسے شے سے مَس نہیں کرتی
بلکہ اسے پہلے کوئی اور شے دکھاتی ہے۔ اور پھر اصل کی تفہیم اس درمیانی شے کے وسیلے سے کرتی
ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ تشبیہ بجائے خود ایک خاصا متحرک اندازِ بیان ہے اور ان طبائع
کو زیادہ عزیز ہے جو آوارہ خرامی کو پسند کرتی ہیں۔ غالب کے اپنے زمانے میں ذوق، ظفر اور
دوسرے بلند پایہ شعرا بھی شعر کہہ رہے تھے، ان کے کلام کی سادگی، صفائی اور سامنے کی بات کو
سامنے کی زبان میں بیان کرنے کی روش، اردو زبان پر ان کی حیرت انگیز قدرت کی غماز تو ہے
لیکن اس میں تشبیہ کی وہ فراوانی نہیں جو غالب کے ہاں موجود ہے۔ مثلاً:

جلوۂ گل نے کیا تھا واں چراغاں آبِ جو   یاں رواں مژگانِ چشمِ تر سے خونِ ناب تھا

گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا
بحر گر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

یوں ہی گر روتا رہا غالب تو اے اہلِ جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

کیا تنگ ہم ستم زدگاں کا جہان ہے
جس میں کہ ایک بیضۂ مور آسمان ہے

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

سایہ میرا مجھ سے مثلِ دود بھاگے ہے اسدؔ
پاس مجھ آتش بجاں کے کس سے ٹھہرا جائے ہے

دیکھو تو دل فریبیِ اندازِ نقشِ پا !
موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گئی !

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالبؔ
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

میں نے صرف چند اشعار یہاں پیش کیے ہیں ورنہ غالب کے کلام میں تشبیہات کے انبار لگے ہیں۔ البتہ دلچسپ بات یہ ضرور ہے کہ غالب تشبیہ کے سلسلے میں آتش، گرمی، سوز، شمع وغیرہ سے خاصا اکتساب کرتے ہیں حتیٰ کہ انھیں جلوۂ گل میں بھی چراغاں ہی کا منظر دکھائی دیتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ چونکہ آگ کی بے قراری اور سیماب پائی خود غالب کے اندر کی سیمابیت اور آتش پنہاں کے مماثل تھی اس لیے انھوں نے عام طور سے آگ اور اس سے متعلق کیفیات ہی سے اپنے لیے تشبیہات اخذ کیں۔ ایک بات اور بھی ہے۔ وہ یہ کہ غالب کے آبا سمرقند اور ایران سے آئے تھے اور اس علاقے میں وہ نسل آباد رہی ہے جو آج بھی آریہ ہونے پر فخر کرتی ہے۔ اس نسل نے کبھی زرتشت کے فلسفے کو اپنایا تھا اور کبھی آتش پرستی کی روایات کو سینے سے لگایا تھا۔ چنانچہ غالب کا بھی ایک شعر ہے ؎

بے ننگ سینہ دل اگر آتش کدہ نہ ہو
ہے عار دل نفس اگر آذر فشاں نہیں

نیز یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ خود آریہ نسلاً خانہ بدوش قبائل پر مشتمل تھے اور صدیوں تک کسی اندرونی خلفشار میں مبتلا وسطی ایشیا سے یورپ، یونان اور ہندوستان تک آوارہ خرامی کرتے رہے تھے چنانچہ اگر خانہ بدوشی اور آتش پرستی کی یہ رمق ہزاروں برس بعد غالب کے خون میں بھی نمودار ہوئی تو یہ حیاتیات کے اصولوں کے عین مطابق تھی۔

غالب کے اشعار کی بنت میں تشبیہ اور استعارے کے علاوہ تخیلی ہیولوں نے بھی ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ بعض اوقات تو غالب آب و گل کی دنیا سے اوپر اٹھ کر ایک ایسا لطیف اور خیالی جہان تعمیر کر لیتے ہیں جو شاید قدموں کی ہلکی سے ہلکی چاپ کا بھی متحمل نہ ہو سکے۔ اس سے یہ بات بھی کھل کر وہ اپنے پوتوں کے پھیلائے ہوئے شور و شغب سے کیوں نالاں تھے کہ ہر بار جب کوئی ننھا منا ہاتھ انھیں چھوتا تھا تو ان کے خوابوں کے آبگینے ٹوٹ ٹوٹ جاتے تھے۔ غالب کی خیال آرائی اور خیال آفرینی کی یہ روش ان کے کلام میں خاصی نمایاں ہے۔ یہ چند اشعار دیکھیے۔

ہوں گرمیٔ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ ہوں

مستانہ طے کروں ہوں رہِ وادیِ خیال
تا باز گشت سے نہ رہے مدعا مجھے

شوق اس دشت میں دوڑائے ہے مجھ کو کہ جہاں
جادہ غیر از نگہ دیدۂ تصویر نہیں

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے اُدھر ہوتا کاشکے کہ مکاں اپنا

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
یک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

غالبؔ کی آوارہ خرامی محض تخیل کی دنیا تک محدود نہیں۔ وہ گوشت پوست کی زندگی میں بھی سیر و سیاحت کے والہ و شیدا تھے۔ ان کے سوانح کا مطالعہ کرتے ہوئے میں یہ گزارش کر چکا ہوں کہ سیر و سیاحت کے سلسلے میں ان کے "کردہ گناہوں" کی فہرست خاصی طویل ہے۔ بڑی بات یہ ہے کہ ان کے اندر کوئی ایسی آگ پنہاں تھی جو انھیں ہر دم متحرک رکھتی تھی۔ بے شک قیسؔ کی تلمیح فارسی کے وسیلے سے اردو میں آئی اور خاصی مقبول بھی ہوئی اور غالب نے بھی اس تلمیح کو اپنایا لیکن انھوں نے جس شیفتگی سے خود کو قیسؔ سے جذباتی طور پر ہم آہنگ کیا اس سے بھی

ندازہ ہوتا ہے کہ وہ قیس کی آوارہ خرامی کو اپنی طبیعت سے کس قدر قریب محسوس کرتے تھے۔ ان کا مداعا یہ ہے وہ جسمانی سطح پہلے ہو یا روحانی سطح پر، ایک ایسا سلسلۂ شوق تھا جس کی کوئی واضح منزل نہیں تھی۔ وہ کس شے کی تلاش میں تھے اور کیا یہ شے کوئی معروضی حیثیت بھی رکھتی تھی؟ ... قرائن کہتے ہیں کہ وہ اپنے سامنے منزل کا ہیولیٰ تو کھڑا کر لیتے تھے لیکن اس تک پہنچتے پہنچتے ایک نئی منزل کے نقوش ان کے سامنے ابھر آتے تھے۔ اس قسم کے خالص کاروباری معاملات جیسے پنشن کا قضیہ وغیرہ میں بھی جب ایک امید فسخ ہوتی تھی تو وہ ایک نئی امید کی آبیاری کرنے لگتے تھے۔ پنشن نہیں تو خطاب، خطاب نہیں تو وظیفہ، وظیفہ نہیں تو کچھ اور۔ قیاس یہ ہے کہ دراصل منزل ان کے باہر نہیں بلکہ اندر تھی اور اندر کی یہ منزل ایک ایسی تو یہ تھی جسے وہ خود بھی گرفت میں لینے سے قاصر تھے۔ اسے ایک ایسی آگ یا پیاس کا نام دینا چاہیے۔ جو اپنی تکمیل کی خواہاں تھی اور ہر اس شے کو خود میں سمو لینا چاہتی تھی۔ جو اس خلا کو پُر کر سکے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں غالب کا ردِ عمل بیشتر دوسرے فن کاروں سے مختلف ہو جاتا ہے۔ اکثر فن کار فن کے عروج پر پہنچنے کے بعد تیاگ کی روش اختیار کرتے اور ایک درویشانہ مسلک کے تابع ہو جاتے ہیں۔ غالب تیاگ کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ لیکن محض رسمی طور پر۔ اصل بات یہ ہے کہ وہ اپنے اندر کے خلا کو پُر کرنے کے لیے چیزوں اور کیفیتوں کو سینے سے لگاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان کے ہاں زندگی کی تلخ کر دو ٹوں کو مس کرنے کا رجحان عام ہے وہ اپنے اندر کے خلا کو پتنگ بازی سے بھی پُر کرنے کی سعی کرتے ہیں اور شراب نوشی سے بھی۔ جوا بازی بھی انھیں عزیز ہے اور سیر و تفریح بھی: وہ عشقِ مشک سے بھی گریزاں نہیں اور دنیاوی وجاہت کی بھی تمنا کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ غالبؔ نے ہر شعبۂ زندگی کی سیاحت کی اور اس ضمن میں اچھے یا برے کی تمیز کو ذرا کم ہی ملحوظ رکھا اور گو ان کے مختلف اقدامات پر ان کے اپنے زمانے کے بہت سے لوگوں کی بھنویں بار بار تن سی گئیں لیکن تجربات کے اسی تنوع نے غالبؔ کے کلام میں وہ بے پناہ توانائی بھی پیدا کی جو درویشانہ مسلک رکھنے والوں یا سماجی اعتبار سے قطعاً شریفانہ زندگی بسر کرنے والوں کو ذرا مشکل ہی سے حاصل ہوتی ہے۔

غالبؔ کے اندر کی یہ آگ یا وحشت ان کے کلام میں بھی بار بار اپنا پرتو دکھاتی ہے۔

مثلاً دیکھیے:

میں اور اک آفت کا ٹکڑا وہ دلِ وحشی کہ ہے
عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا

مانعِ دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں
ایک چکر ہے میرے پانو میں زنجیر نہیں

وحشت پہ میری عرصۂ آفاق تنگ تھا
دریا زمین کو عرقِ انفعال ہے

گرد بادِ رہِ بے تابی ہوں
صرصرِ شوق ہے بانی میری

مرہم کی جستجو میں پھرا ہوں جو دور دور
تن سے سوا فگار ہیں اس خستہ تن کے پانو

نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا
حبابِ موجۂ رفتار ہے نقشِ قدم میرا

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود
قبلہ کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

ہر قدم دوریِ منزل ہے نمایاں مجھ سے
میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

کیوں نہ فردوس میں دوزخ کو ملا لیں یارب
سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

آوارہ خرامی کا جذبہ اس بات کا متقاضی ہے کہ اس کے راستے میں کوئی بند نہ باندھا جائے کیوں کہ بقول غالب جب طبع رکتی ہے تو اور بھی رواں ہوتی ہے۔ روانی سے تو انکار ناممکن ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ غالب رکاوٹ کے عمل کے شکوہ سنج ہمیشہ رہے اور انھیں ہر وہ شے یا عمل ناگوار محسوس ہوا جس نے ان پر کسی قسم کی بندش عائد کی یا کم از کم جس میں انھیں بندش یا بیڑیوں کا احساس ہوا غالب کے نزدیک روانی، روانیِ طبع یا آوارہ خرامی کناروں میں مقید ہو کر بہنے کا عمل نہیں بلکہ کناروں سے چھلکنے کے عمل کا دوسرا نام ہے۔ چنانچہ وہ سماجی کھائیوں GROOVES سے ہمیشہ متنفر اور اپنی انفرادیت کا مظاہرہ کرنے میں ہمیشہ پیش پیش رہے۔ یہ بات ان کے مخصوص مزاج سے ہے کہ ان کی زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات تک پھیلی ہوئی ہے۔ مثلاً انھوں نے دنیا میں عام لوگوں کے ساتھ مرنا پسند نہ کیا یا جس روز داڑھی رکھی اسی دن سے سر منڈایا۔ مذہبی احکامات کے سلسلے میں آزادہ روی کا مسلک اختیار کیا وغیرہ غالب کہتے ہیں:

کیا تنگ ہم ستم زدگاں کا جہان ہے
جس میں کہ ایک بیضۂ مور آسمان ہے

اس شعر سے اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ غالب کے ہاں آزادی کا تصور کس قدر کشادہ تھا۔ اتنا کشادہ کہ بڑی سے بڑی آزادی بھی انھیں قیدو بند سے رہائی کا احساس عطا نہ کر سکتی تھی۔ اس شعر سے اس کے علاوہ یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ تنگ و تاریک گلیوں کے شہر میں ان کی نظر میں حصولِ آزادی

کے لیے آسمان کو ٹوٹنے پر سدا مائل رہیں کہ اپنے ماحول میں چھت پرسے دکھائی دینے والا آسمان کا حصہ ہی در و دیوار کی قیود و بند سے آزاد نظر آتا تھا۔ مثلاً دیکھنے کی بات ہے کہ جب غالب اپنے مکان کا ذکر کرتے ہیں تو چھت پر سے آسمان کو دیکھنے اور محظوظ ہونے کی روش باقی تمام باتوں پر سبقت لے جاتی ہے۔ مثلاً نواب علاء الدین احمد کو لکھتے ہیں:

"مینہ کھل گیا ہے۔ مکان کے مالکوں کی طرف سے مرمت شروع ہو گئی ہے۔ لڑکا ڈرتا ہے نہ بی بی گھبراتی ہے۔ نہ میں بے آرام ہوں۔ کھلا ہوا کوٹھا، چاندنی رات، ہوا سرد، تمام رات فلک پر مریخ پیش نظر، دو گھڑی کے تڑکے زہرہ جلوہ گر، ادھر چاند مغرب میں ڈوبا اُدھر مشرق سے زہرہ نکلی صبوحی کا وہ لطف روشنی کا وہ عالم۔" (۹ اگست ۱۸۶۳ء)

در و دیوار سے غالب کو جو وحشت ہوتی تھی اس کی وجہ دراصل یہ تھی کہ دیواروں ہی سے زنداں تعمیر ہوتا ہے اور زنداں آوارہ خرامی کے جذبے کو پابجولاں کر دیتا ہے چنانچہ وہ دیواروں کے حبس سے گریزاں تھے اور اپنے اشعار میں زنداں اور اس کی علامتوں کا بار بار ذکر کرتے تھے۔

بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

شرحِ اسبابِ گرفتاریِ خاطر مت پوچھ
اس قدر تنگ ہوا دل کہ میں زنداں سمجھا

بلائے جاں ہیں جو یہ پیشِ نظر در و دیوار
نگاہِ شوق کو ہیں بال و پر در و دیوار

آزادی نسیم مبارک کہ ہر طرف
ٹوٹے پڑے ہیں حلقۂ دام ہوائے گل

صد سے دل اگر افسردہ ہے گرمِ تماشا ہو
کہ چشمِ تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو

احباب چارہ سازیٔ وحشت نہ کر سکے
زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا

آزادہ روی غالب کا مسلک تھا۔ اس لیے یہ غیر اغلب نہیں کہ وہ زنداں میں رہتے ہوئے بھی یہاں کی دنیا میں آوارہ حال رہے۔ یا یوں کہیے کہ چونکہ غالب فطری طور پر متحرک تھے اس لیے جب وہ گھڑی بھر کے لیے رُکے تھے تو انھیں سنگ و خشت کی دیواروں کا بوجھ فی الفور محسوس ہونے لگتا تھا۔ غالب کی طبیعت کا یہ ہیجان ان کی داستانِ حیات ہی سے نہیں اندازِ گفتگو سے بھی مترشح ہے۔ یہ تو معلوم نہیں کہ وہ گفتگو آہستہ آہستہ کرتے تھے یا تیز لیکن ان کے کلام سے یہ بالکل ظاہر ہے کہ ان کے ہاں ڈراما کے عناصر کی خاصی فراوانی تھی اور ڈراما سے شغف داخلی بے قراری ہی کا غماز ہوتا ہے۔ جب اندر کی فاضل قوت متلاطم ہو جائے تو وہ زبان کے علاوہ جسم کی حرکات میں بھی اپنا اظہار کرتی ہے۔ اور یوں گفتگو میں مکالمے کا انداز اور کلام میں تمثیل کا رنگ جھلکنے لگتا ہے۔ غالب کے خطوط سے ان کی گفتگو کے ڈرامائی عناصر کا اندازہ بآسانی ہو جاتا ہے۔ مثلاً میر مہدی کے نام ان کے ایک خط کے تیور دیکھیے:

"اے جناب میرن صاحب! السلام علیکم"

"حضرت آداب!"

"کہو صاحب، آج اجازت ہے میر مہدی کے خط کا جواب لکھنے کی؟"

"حضور، میں کیا منع کرتا ہوں؛ میں نے تو یہ عرض کیا تھا کہ اب وہ تندرست ہو گئے ہیں، بخار جاتا رہا ہے۔ صرف پیچش باقی ہے۔ وہ بھی رفع ہو جائے گی:

میں اپنے ہر خط میں آپ کی طرف سے دعا لکھ دیتا ہوں۔ آپ پھر کیوں تکلیف کریں؟
"نہیں میرن صاحب، ان کے خط کو آئے بہت دن ہوئے ہیں وہ خفا ہوا ہوگا۔
جواب لکھنا ضرور ہے۔"
"حضرت وہ آپ کے فرزند ہیں، آپ سے خفا کیوں ہوں گے!"
"بھائی آخر کوئی وجہ تو بتاؤ کہ تم خط لکھنے سے کیوں باز رکھتے ہو؟"
"سبحان اللہ! اے لو حضرت، آپ تو خط نہیں لکھتے اور مجھے فرماتے ہیں کہ تو باز رکھتا ہے۔"
"اچھا، تم باز نہیں رکھتے، مگر یہ تو کہو کہ تم کیوں نہیں چاہتے کہ میں میر مہدی کو خط لکھوں؟"
"کیا عرض کروں: سچ تو یہ ہے کہ جب آپ کا خط جاتا اور وہ پڑھا جاتا تو میں سنتا اور حظ اٹھاتا۔ اب جو میں وہاں نہیں ہوں تو نہیں چاہتا کہ آپ کا خط جاوے۔ میں اب پنج شنبے کو روانہ ہوتا ہوں، میری روانگی کے تین دن بعد آپ خط شوق سے لکھیے گا۔"
"میاں بیٹھو، ہوش کی خبر لو، تمہارے جانے نہ جانے سے مجھے کیا علاقہ۔ میں بوڑھا آدمی تمہاری باتوں میں آگیا اور آج تک اسے خط نہ لکھا۔ لاحول ولا قوۃ۔"
یہی حال ان کے کلام کا ہے جس میں متعدد موقعوں پر ایک پوری ڈرامائی کیفیت ابھری ہوئی نظر آتی ہے۔ مثلاً ان کی ایک غزل کا یہ حصہ دیکھیے جس میں عدالتِ ناز کے اندر دل و مژگاں کا مقدمہ پیش ہوتا ہے اور ایک جیتی جاگتی تمثیل میں ڈھل جاتا ہے:

پھر کھلا ہے درِ عدالتِ ناز گرم بازارِ فوجداری ہے
ہو رہا ہے جہان میں اندھیر زلف کی پھر سررشتہ داری ہے
پھر ہوئے ہیں گواہِ عشق طلب اشک باری کا حکم جاری ہے
دل و مژگاں کا جو مقدمہ تھا آج پھر اس کی روبکاری ہے

ڈرامائی کیفیت غالب کے عام اشعار کا طرۂ امتیاز بھی ہے مثلاً

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
تمہیں کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے

تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم
میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے

غالب تمہیں کہو کہ ملے گا جواب کیا
مانا کہ تم کہا کیے اور وہ سنا کیے

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

اسد خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جو اس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

غالب کی آوارہ خرامی کا ایک اور دلچسپ ثبوت یہ بھی ہے کہ ان کی وفات کے تقریباً ساٹھ برس بعد ایشیا کے عظیم مصور عبدالرحمٰن چغتائی نے ان کے مختلف اشعار کو ایسی تصویروں میں پیش کیا جو مصوری کی زبان میں ٹون [illegible] سے کہیں زیادہ خط LINE کی مرہون منت تھیں۔ واضح رہے کہ مصوری میں TONE اور خط LINE دو متبادل طریق ہیں۔ اگر تصویر میں گہرائی مقصود اور روحانی اقدار کا اظہار مطمح نظر ہو تو TONE کو بروئے کار لایا جاتا ہے۔ لیکن اگر آرزو یہ ہو کہ تحرک اور جزر و مد دکھایا جائے تو پھر لائن

LINE زیادہ مفید ہے۔ مرقع چغتائی میں غالب کے اشعار کی عکاسی ایسی تصویروں کے ذریعے ہوئی ہے جن میں خطوط کا عمل دخل بہت زیادہ ہے۔ ظاہر ہے کہ چغتائی نے غالب کے تخیل کے حرکی عناصر کا احاطہ کرنے کے لیے قطعاً غیر ارادی طور پر خطوط کے استعمال کی ضرورت محسوس کی ہوگی۔ چغتائی کی فنی عظمت کا یہ ایک ادنا ثبوت ہے کہ اس نے غالب کے شعری تحرک کو بڑی کامیابی کے ساتھ خطوط LINE کی زبان میں پیش کیا اور ایسا کرتے ہوئے اس خاص کیفیت کو بڑی خوبی سے اجاگر کیا۔ جسے اس مضمون میں نشان زد کیا گیا ہے۔

سیر المنازل (فارسی متن معہ اردو ترجمہ)

تصنیف: مرزا سنگین بیگ

ترتیب و ترجمہ:

ڈاکٹر شریف حسین قاسمی

فارسی کی وہ اولین کتاب ہے جس میں ابتدا سے دہلی کی اجمالی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ یہ کتاب اوائل انیسویں صدی عیسوی کی دہلی کے مستند اور معتبر دستاویز کا درجہ رکھتی ہے۔ جس میں شاہجہان آباد کی مختلف عمارات، مقابر، مساجد، منادر، معابد، محلے، مکانات اور حویلیوں کے علاوہ یہاں کے مشاہیر علم و فن اور اہل حرفہ کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔ دہلی کی تہذیب و تمدن کا ایک رنگا رنگ مرقع۔

صفحات۔ ۳۰۶

قیمت۔ ۴۵ روپیہ

شان الحق حقی

شرحِ نکاتِ غالب

کلامِ غالب کی بہت سی شرحیں لکھی گئی ہیں، لیکن آج بھی اس میں شرح کی گنجائش نظر آتی ہے سچ پوچھیے تو بہت سے سربستہ مضمون کھلے ہی نہیں ہیں۔ اسے خوبی قرار دیا جائے یا خامی ؛ ویسے یہ ایک امتیاز تو ہے ہی، میں اسے خوبی ہی قرار دیتا ہوں۔ یہ کلام کی بڑائی کی دلیل ہے کہ اس میں سے مضامین نکلتے چلے آئیں۔ دراصل ہر حلقے ہر دور بلکہ ہر فرد کو اپنے مرغوب کلام سے اپنے اپنے طور پر لطف اندوز ہونے کا حق ہے، بشرطیکہ کلام میں اس کی گنجایش بھی ہو، جو اس کے وسیع ہونے کی دلیل ہو گی۔ ضروری نہیں کہ ہر کلام میں ایسی ہی تہ در تہ معنویت موجود ہو۔ یہی ایک بات کلام کے پلے کو بلند کرتی ہو۔ شاعری کے ہزار روپ ہیں اور ہر روپ کا اپنا مقام، اپنا جواز اور اپنی دلکشی ہے۔ لیکن ادب کی برگزیدہ تخلیقات کسی ایک فرد کی تخلیق نہیں ہوتیں۔ انھیں پورے ایک عہد یا ایک معاشرے کی تخلیق کہنا چاہیے، بلکہ ان میں کچھ ایسے ابدی مسائل یا حقائق بھی مضمر ہوتے ہیں کہ ہر عہد کا ذہن ان کے ساتھ لرزتا رہے۔ اشعارِ غالب کا مفہوم وہ نہیں جو ان کے معاصرین نے سمجھا یا بعد کے شارحین نے بیان کیا۔ بلکہ وہ بھی نہیں جو خود غالب نے بتایا۔ اصل مفہوم وہ ہے جو میرے اور آپ کے دل کو لگے۔ عملِ تخلیق بھی ایک مثلث ہے جسے شاعر، کلام اور قاری مل کر پورا کرتے ہیں۔

یہاں تک میں نے دیکھا۔ غالب کے اشعار میں سے کسی کھینچ تان کے بغیر ایسے مضامین نکل آتے ہیں جو ہمارے فاضل شارحین کی نظر سے اتفاقاً اوجھل رہے۔ یا ان کے طرزِ فکر سے مناسبت نہیں رکھتے تھے۔ دو باتوں کو عام طور سے نظر انداز کیا گیا ہے۔ ایک تو یہ کہ شاعری کا اصل پیرایہ مجاز ہے۔ لفظی تشریحات کلام کے ساتھ انصاف نہیں کرتیں۔ غالب ایجاز پسند تھے۔ ایسا شاعر تو بغیر علامات کا سہارا لیے چل ہی نہیں سکتا۔ خاص طور پر غزل تو بقول غالب ایک ایسی تنگ نائے ہے جس میں دو مصرعوں کی محدود بساط کے اندر فن کے تمام تقاضوں کو نبھاتے ہوئے پہلو دار بات کہنی لازم آتی ہے۔ غالب کا یہ قول کہ :

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آئے

صرف کہنے کی بات نہیں تھی۔ دوسرے یہ کہ تشریح کرتے وقت شارحین صرف اسی ایک شعر پر نظر رکھتے ہیں اور شاعر کی عام روشِ فکر اور نظامِ عقائد سے صرف نظر کر جاتے ہیں۔ اس نے خود اپنے مسائلِ تصوف اور مشاہدۂ حق کا نام لیا تھا اور جتایا تھا کہ "بادہ و ساغر" اور "دشنہ و خنجر" کہے بغیر بات نہیں بنتی۔ پھر لفظ پر اتنا اصرار کیوں ؟ اسے صرف رند عشق باز ہی قرار دے کر شرح کرنا کافی نہیں تھا، جیسا کہ شارحین نے عام طور پر کیا ہے۔ اور بھی بہت سے نکتے ہیں جو نظر انداز ہوتے رہے ہیں، جیسے مثلاً اس شعر میں :

سن اے غارت گر جنس وفا سن
شکست قیمت دل کی صدا کیا

مجھے حیرت ہے کہ ہمارے اساتذۂ شعر کا خیال اس تلازمے کی طرف نہ گیا جو جنس، قیمت اور صدا میں موجود تھا۔ "صدا" یعنی بیچنے والے کی بولی۔ قیمت گھٹا کے بیچتے ہیں تو اس کی صدا لگاتے ہیں کہ لیے آج تو اس بھاؤ لٹا دیا۔ ایک بزرگ نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ قیمت دل کی جگہ شیشۂ دل ہوتا تو بہتر تھا۔ اسی طرح اس شعر میں :

دیوار بارِ منت مزدور سے ہے خم
اے خانماں خراب نہ احساں اٹھائیے

حضرات شارحین نے اپنے آپ سے یہ نہیں پوچھا کہ آخر منت مزدور کا بار بوسیدہ، جھکی ہوئی دیوار ہی پر کیوں، سیدھی دیوار پر کیوں نہیں؛ حالانکہ دیوار کے ساتھ چھت یا محراب یا گنبد کا تصور لازم ہے۔ جس سے اس کی خمیدگی واضح ہو جاتی ہے۔ شاید دیوار اپنے بل پر اٹھتی تو یوں جھک کر نہ رہ جاتی، ثریا تک پہنچتی۔ یہ بات بھی دلچسپ ہے کہ غالب مزدور کی منت کا اقرار کرتے ہیں۔ مالک یا مہندس کا نام نہیں لیا۔

وعلیٰ ہٰذا القیاس مجھے غالب کے بیسیوں اشعار ایسے ملے جن میں مزید غور و تامل کی گنجائش نکلتی تھی۔ میں ان پر پچاسویں دہائی سے اب تک جستہ جستہ حاشیے لکھتا رہا ہوں جو ادھر اُدھر چھپتے رہے ہیں، تیس ایسے اشعار میری کتاب "نکتۂ راز" میں بھی شامل ہیں (۲،۱۹ء)، اور یہ سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا۔ چنانچہ آیئے آج کچھ مزید اشعار پر غور کرتے ہیں:

دماغ عطر پیراہن نہیں ہے
غم آوارگی ہائے صبا کیا

میرے ممدوح و محترم علامہ نیاز فتحپوری لکھتے ہیں: "سوال یہ ہے کہ یہاں کس کا پیراہن مراد ہے، اپنا یا محبوب کا۔ بعض حضرات نے خود غالب کا لباس قرار دیا ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ لباس یار مراد ہے۔"

دوسرے شارحین کی طرح وہ بھی مضمون کے سراغ میں غلط رخ پر چلے گئے، اور بات الفاظ تک محدود ہو کر رہ گئی۔ حالانکہ شعر کا اصل پیرایہ مجاز ہے۔ پہلا سوال جو پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ صبا کی آوارگی کا غم کیسا؟ صبا کی آوارگی یعنی ادھر ادھر پھرنا کوئی ایسی بات نہیں جس کا غم کیا جائے، بلکہ اس کی روانی و چلاتی تو فرحت و انبساط کا باعث ہوتی ہے۔ نہ ہو تو حبس پیدا ہو اور دم گھٹنے لگے۔ پھر غالب نے یہ کیوں کہا کہ صبا کی آوارگی کا غم نہیں؟ ظاہر ہے کہ یہاں صبا بطور علامت ہے نہ کہ لغت۔

غالب کے ہاں ایسے ہی کسی چونکانے والے نکتے سے معنی کا سراغ ملتا ہے۔ یعنی اس طرف تو راستہ بند ہے، اب اور طرف جایئے۔ صبا کا چلنا تو باعث رنج نہیں ہوتا۔ لہٰذا کسی اور بات کی علامت ہے۔

میری تاپیز ہاے میں یہاں صبا یا ہوا کا استعارہ ہے جس میں بات ادھر سے ادھر منتشر ہو پھیلتی ہے جیسے ہوا میں خوشبو۔ شعر کے مجازی پہلو کو نظر انداز کر دیا جائے اور علامات کو شاعرانہ نہ کیا جائے تو معنی سمجھنے میں مشکل ہوتی ہے۔ بلکہ شاعری خرافات معلوم ہونے لگتی ہے۔
اسی طرح پہلے مصرعے میں عطر پیراہن بھی ایک علامت کے طور پر آیا ہے۔ عطر وہی لگائے گا جو خوش باش ہے فکر اور خوش مزاج ہوگا۔ شاعر کے پاس سوائے اپنے افکار اور بدحالی کے کیا رکھا ہے۔ کہاں کا عطر اور کیسی آرائش۔ چنانچہ شاعر نے عطر اور صبا کی علامات کو شعر میں لا کر جو بات کہی ہے وہ یہ کہ یہاں سوائے اپنی خستہ حالی کے کونسی دولت یا کونسے راز رکھے ہیں کہ اوی تشبیہ کا قہر ہو یا دنیا ذرین۔
اب بتائیے کہ پیراہن سے مراد شاعر کا پیراہن ہے یا محبوب کا؟ محبوب کے عطر پیراہن سے بیزاری کا اظہار تو ویسے بھی آداب تغزل کے خلاف ہے۔

(دیگر) نفس موج محیط بے خودی ہے
تغافل ہائے ساقی کا گلہ کیا

یہ تو درست ہے کہ ساقی شراب پلانے والے کو کہتے ہیں۔ لیکن کیا اس کے صرف اتنے ہی معنی لیے جائیں جیسا کہ شارحین نے کیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ساقی شراب نہیں دیتا تو نہ دے ہم تو ویسے ہی غفلت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ گویا بات پینے پلانے تک رہی۔ ساقی ہماری ایک پختہ روایتی علامت ہے۔ جب اقبال نے کہا: "بتا کیا تو مرا ساقی نہیں ہے" تو ظاہر ہے ان کی مراد پلانے والے سے نہیں تھی۔
مذکورہ بالا شعر کا پہلا مصرع کمال کا مصرع ہے۔ جس میں بدھ فلسفے کا نچوڑ آگیا ہے۔ جس کا ہمارے تصوف پر خاصا اثر ہے۔ جیسا کہ میں نے اپنے ایک مقالے میں تفصیل سے بیان کیا، فانی تو بدھ فلسفے سے کچھ زیادہ ہی متاثر ہیں۔ جیسے کہ شوپنہار تھا جس کا نام ان کی تنقید کے سلسلے میں لیا جاتا ہے۔ فانی کے بعض اشعار دھم پد کے اقوال کا خلاصہ یا ترجمہ معلوم ہوتے ہیں۔
(مطالعۂ فانی بطور نقد و نگارش، مکتبہ اسلوب کراچی۔ ۱۹۸۵ء)
مجملاً یہ کہ مثبت اور محکم حقیقت عدم یا فنا ہے، حیات و کائنات کا وجود عارضی و غیر حقیقی ہے

یوں سمجھیے کہ عدم کے اتھاہ سمندر میں ایک لہر یا اس کا واہمہ ہے جو بہرحال محو ہوجاتا ہے۔ غالب نے پہلے مصرع میں بعینہ یہ بات کہی ہے :

نفس موج محیط بے خودی ہے

جیسا کہ فانی نے کہا:

ملا ازل میں مجھے میری زندگی کے عوض
وہ ایک لمحۂ ہستی کہ صرف خواب ہوا

غور فرمائیے کہ لمحۂ ہستی اصلی زندگی کے عوض ملا ہے، یعنی موت جو عمرِ ابد کا نام ہے۔ یہ مضمون کلام فانی میں رچا ہوا ہے :

خود جو نہ ہونے کا ہو عدم کیا اسے جینا کہتے ہیں نیست نہ ہو تو ہست نہیں ہستی کی کیا ہستی ہے

موت جس کی حیات ہو فانی
اس شہید ستم کا ماتم کیا

یہاں کچھ مماثلت بھگود گیتا کے ساتھ بھی ہے۔ شری کرشن ارجن سے کہتے ہیں :

ہے ہر فرد اک دجود بے نمود آغاز ہستی میں
جسے ملتی ہے ہیئت صرف دورِ درمیانی میں
پھر اس کے بعد آجاتا ہے واپس اپنی منزل پر
یہ صورت ہے تو اس سے میل کیوں آئے ترے دل پر

(۲۸،۲) ترجمہ از راقم

لیکن بدھ مت کے برخلاف فانی اور غالب کے ہاں خدا کا وجود مسلّم ہے۔ اس کے بعد "ساقی" کی وضاحت ضروری نہیں رہتی۔ یہ مضمون کہ حقیقت اصلی ہم سے روگرداں ہے، تغافل برتتی ہے، غالب کے ہاں تکرار کے ساتھ آیا ہے۔ مذکورہ شعر بھی اسی کی مثال ہے۔ کہتے ہیں ہماری زندگی خود ایک خواب غفلت ہے۔ اس میں حقیقت نے اپنا جلوہ دکھایا یا نہ دکھایا، اس کی شکایت کیا۔ ساقی سے جس شراب کی توقع کی جاسکتی ہے اس کی دو تعبیریں ممکن ہیں۔ ایک تو سامان عشرت یا آسایشِ دنیوی، دوسرے معرفت، ادراک حقیقت یا حسن حقیقی کا جلوہ۔ یہاں دونوں معنی چست بیٹھتے ہیں۔

اپنے اپنے ذوق کے مطابق جو بھی جس کو قبول ہو۔ بہرحال ضروری ہے کہ الفاظ کو پوری طرح نچوڑ کر شعر کا مفہوم نکالا جائے۔

دیگر۔

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ
جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا

اس شعر کے بارے میں بھی ذہن صاف نہیں جیسا کہ نیاز صاحب نے لکھا، اگر تجھ سے مخاطب محبوب ہے تو معنی یہ ہوں گے کہ ہم خواب میں تجھ سے معاملۂ محبت اور عہد وفا لینے پر مصر تھے کہ آنکھ کھل گئی اور سارا طلسم درہم برہم ہوگیا۔ لیکن اس صورت میں "نہ زیاں تھا نہ سود تھا" کا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اگر خطاب خدا سے ہے تو مفہوم یہ ہوگا کہ کاروبار حیات سے رابطۂ محبت کو سمجھنے کی کوشش محض خواب و خیال ثابت ہوئی۔ اور ہماری بے خبری اور ناآگہی بدستور باقی رہی۔ جو سود و زیاں سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ گویا شعر ہر صورت میں ناقص ٹھہرتا ہے۔

لیکن اگر یہ گمان لاحق نہ ہوتی تو "سود و زیاں" سے خیال "گناہ و ثواب" کی طرف آسانی سے منتقل ہو سکتا تھا۔ غالب زندگی کو خواب و خیال ہی بتاتے اور بار بار اس مضمون کو دہراتے ہیں کہ عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے۔ اس مصرع کو بھی ملحوظ رکھیے کہ:

ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

زیر غور شعر میں مراد اس کے سوا کیا ہو سکتی ہے کہ یہ جزا و سزا کی باتیں یہیں تک ہیں۔ جب طلسم ہستی ٹوٹے گا تو پھر کہاں کا عذاب اور کیسا ثواب۔ یہ بھی کلام غالب کا ایک مانوس مضمون ہے جیسا کہ جنت کے بارے میں کہا کہ "دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے" وغیرہ وغیرہ

اب ذرا لفظ "معاملہ" کی بلاغت پر بھی غور کیجیے۔ یہاں بھی یہ کنایہ موجود ہے کہ تقوی نہ ہوا ایک طرح کی سودے بازی ہوئی۔ یہ بھی غالب کے جانے بوجھے افکار میں سے ہے۔

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

چنانچہ زیر نظر شعر افکار غالب کے ساتھ پوری طرح مربوط ہے۔ اتنے اشارات کے ہوتے ہوئے لفظی تشریح کرنا اور شعر کو ناقص یا بے معنی قرار دینا ناانصافی ہوگی۔

دیگر، باغ پاکر خفقانی یہ ڈراتا ہے مجھے
سایۂ شاخِ گل افعی نظر آتا ہے مجھے

کہتے ہیں کہ باغ مجھے ڈراتا ہے، تو توقع یہ کی جاتی ہے کہ باغ کی طرف سے کوئی حرکت ایسی سرزد ہوتی ہوگی جسے ڈراوا کہا جائے۔ لیکن دوسرے مصرعے میں ہے کہ سایۂ شاخِ گل خود مجھ کو افعی نظر آتا ہے۔ اس میں باغ کا تو کوئی قصور نہ ہوا۔ اپنے ہی اندر کا خفقان ہے جس نے سایۂ شاخِ گل کو افعی بنا کر دکھایا۔ فتور اپنے اندر ہے نہ کہ باہر سے کوئی دانستہ ایسی حرکت کرہا ہے جسے ڈرانا کہا جائے۔ یہ توحسن تعلیل کے برخلاف سوء تعلیل ہوا۔

مگر میری رائے ناقص میں یہی وہ نکتہ ہے جو اس شعر میں ضمناً جتایا گیا ہے۔ اپنی وحشت کا ذکر تو ہے ہی، اس کے ساتھ یہ لطیف نفسیاتی نکتہ بھی ہے کہ انسان اپنی کوتاہیوں کا الزام ماحول کو دیتا ہے، اور یہ اس ابتدائی نفسیاتی نکتے پر مستزاد ہے کہ مشاہدہ داخلیت پر مبنی ہے حقائق اعتباری ہیں نہ کہ معروضی۔ اس طرح غالب کے متفرق اشعار ان کے بنیادی فکر کے ساتھ مربوط نظر آتے ہیں کہ وجود محض وہم پر مبنی ہے۔ حقیقت اصلی ہم سے بہت دور ہے۔ ویسے شاعری میں باہم متناقض افکار و مشاہدات کی گنجائش بھی ہوتی ہے، جیسے کہ خود زندگی میں تناقض ملے ہے یہ بھی سچ ہے وہ بھی۔ حقائق اضافی یا اعتباری ہوتے ہیں۔ انسان کے پاس حق کو پرکھنے کے حتمی پیمانے اور مقدرت موجود نہیں۔ بقول میرؔ یاں وہی ہے جو اعتبار کیا۔

عشق کو جنون سے نسبت ہے۔ لہٰذا غالب کا زیرِ نظر شعر تغزل کے دائرے میں رہتا ہے یہ بھی غزل کا ایک لازمہ ہے۔ جو اقبال کی غزل سے پہلے تک مسلم تھا۔ اس پر میں نے ایک علاحدہ مقالے میں بحث کی ہے۔ (غزل کا سفر سعدی سے اقبال تک مشمولہ نقد و نگارش)

سایۂ شاخ کی مشابہت افعی کے ساتھ ایک دلچسپ تشبیہ ہے۔ شاخ بھی محض شاخ نہیں، اسے شاخِ گل کہا ہے جسے فرحت بخش ہونا چاہیے۔ مگر قلبی خفقان زندگی کو تلخ بنا دیتا ہے۔ اشیا کی ظاہری صورت کو بگاڑ دیتا ہے۔

دیگر، عجز سے اپنے یہ جانا کہ وہ بدخو ہوگا
نبضِ خس سے تپشِ شعلۂ سوزاں سمجھا

مولانا حسرت موہانی لکھتے ہیں: اپنی عاجزی کو خس سے اور اس کی بدخوئی کو شعلۂ سوزاں سے تشبیہ دی ہے۔ دوسرے شارحین نے اس پر کچھ مزید روشنی نہیں ڈالی۔

میرے فہم ناقص میں یہاں "عجز" کمال کا پرمعنی لفظ ہے جو غالب نے برتا ہے۔ یہ ایک طرف انکسار، بے بضاعتی، ہیچ میرزی کا مفہوم رکھتا ہے تو دوسری طرف بے توفیقی، عجزِ فہمی، نا سمجھی کا۔ مراد یہ کہ ہم اسے پہچاننے سے عاجز تھے، ہم نے اپنی نافہمی سے یہ سمجھا کہ خوئے یار التہابی ہوگی۔ چونکہ خود ہمارے اندر جذبات کی حرارت موجود ہے اس میں تو بہت ہی زیادہ ہوگی، اسے قہار و جبار سمجھا۔ تمام آلام اور آزمائشوں کا سرچشمہ جو پھونکے ڈال رہا ہے تو خود کتنا ملتہب ہوگا۔ اس سے ڈرنے لگے جیسے کہ خس شعلے سے خوف کھائے۔ مگر یہ ہمارا عجزِ فہم تھا کہ خود پر اس کو قیاس کرنے لگے۔

یہ نکتہ لائق غور ہے کہ غالب کے ہاں حقیقت اصلی کا تصور سراپا حسن ہے جو ہم سے حجاب روا رکھتا ہے۔ وہ اسے ایک حسین اور محبوب پیکر کی صورت میں خیال کرتے ہیں۔

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئنہ دائم نقاب میں

غالب کے ہاں آئنہ کائنات کا استعارہ ہے۔ جیسا کہ میں نے اپنے ایک مقالے میں کلام غالب کی الفاظ شماری سے واضح کیا، ان کے ہاں سب سے زیادہ جو لفظ آیا ہے وہ آئینہ ہے اس کے ساتھ اس کے بہت سے تلازمے بھی کثرت سے آئے ہیں۔ عکس، تمثال، تصویر، نقش، صورت، شکل، شبیہ، پرتو، صیقل، طوطی، زنگار، اسکندر، حلب وغیرہ۔ اس کے مضمرات میں سب سے نمایاں ان کا یہ عقیدہ ہے کہ یہ کائنات وجودِ حقیقی کا ایک پرتو ہے، حقیقی نہیں۔ وہ اس لفظ کو طرح طرح سے باندھتے ہیں مجرد بھی اور مرکبات کی صورت میں بھی جن میں بعض بڑے انوکھے ہیں۔ آئینہ دار، آئینہ داری، آئینہ خانہ، آئینہ سامان، آئینہ بندی، آئینہ ایجاد، آئینہ تعمیر، آئینہ کیفیت، آئینہ ساز، آئینہ پرداز، آئینہ کار وغیرہ۔

سعیِ خرام کاوشِ ایجادِ جلوہ ہے   جوشِ چکیدنِ عرقِ آئینہ کار تر

ان کے علاوہ اور بھی بہت سی جدت آفریں تراکیب ملتی ہیں: دلِ آئینہ، زانوئے آئینہ، چشمۂ آئینہ

بزم آئینۂ تصویر، موم آئینہ ایجاد، وحدت خانۂ آئینہ دل، کشور آئینہ، تپش آئینہ، رنگ آئینہ، پشت آئینہ، نقش بند آئینہ، فرد آئینہ، شمع آئینہ، قبلۂ آئینہ، مراد حقیقت ازلی، آب آئینہ، چرت آئینہ، گداز آئینہ، گرمی آئینہ، خاکستر آئینہ، در آئینہ، دامن آئینہ، جلوۂ آئینہ وغیرہ۔ اس طرح آئینۂ دل، آئینۂ چشم، آئینۂ ناز، آئینۂ تعمیر، آئینۂ تمثال، آئینۂ تصویر، آئینۂ خور، آئینۂ دیوار آئینۂ زانو، آئینۂ دست طبیب، آئینۂ گل، آئینۂ امتحان، آئینۂ خیال، آئینۂ بے رنگ، آئینۂ دریا آئینۂ سنگ، آئینۂ باد بہاری، آئینۂ انتظار، آئینۂ تصویرنما، بہت سی متنوع تراکیب آئینے کے ساتھ آئی ہیں۔ یہ بات یقیناً نہیں بلکہ میرے مشاہدے کی رو سے حقیقتہً درست ہے کہ فارسی یا اردو کے کسی شاعر نے، سوائے بیدل کے، اتنے آئینے اپنے کلام میں نہیں باندھے۔ اس معاملے میں ایک بیدل ہی ان کے حریف ہیں اور صحیح معنی میں حریف غالب۔

زیر نظر شعر اسی غزل کا ہے جس میں یہ متصوفانہ شعر واقع ہوا ہے:

(دیگر) یک الف بیش نہیں صیقل آئینہ ہنوز
چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا

مولانا حسرت موہانی لکھتے ہیں: "صیقل سے جو خط آئینے پر پڑ جاتا ہے وہ ہو بہو الف کی مانند ہوتا ہے۔ تو (گویا آئینہ) خط مذکور ابھی الف ہی کی مشق کر رہا ہے۔ (یعنی، ہنوز روز اول ہے" (کذا)

اسی کے ساتھ انھوں نے عبدالعلی والہ کی کتاب "وثوق صراحت" کا یہ اقتباس بھی نقل کیا ہے، جو غالب کے کلام کی سب سے پہلی شرح تھی جو ۱۸۹۴ء میں مدراس سے چھپی:

"مگر چاک گریباں اپنا کر وہ بھی بصورت الف تھا، سیکڑوں شکلیں اس کی بدل گئیں تو معلوم ہوا کہ مشق گریباں دری میں آئینہ مبتدی ہے اور حضرت غالب کا گریباں منتہی" (کذا)

مولانا حسرت مزید فرماتے ہیں: اس شعر کا مضمون صاف نہیں ہے۔ لیکن بظاہر جناب والہ کے پیش کردہ مطلب کے سوا اور کوئی مفہوم سمجھ میں نہیں آتا۔"

میرے فہم ناقص میں پہلے مصرع کا مفہوم تو سوائے اس کے کیا ہو سکتا ہے کہ وہ آئینہ یعنی آئینہ دل یا آئینۂ ادراک جس میں حقیقت اپنا جلوہ دکھاتی: اس پر بھی صرف ایک

خط کھینچا ہے۔ غالب نے جو الف کہا ہے تو غالباً اس میں کنایہ اللہ کے الف کی طرف ہے۔ یعنی حرفِ وحدت کا ادراک ہوا ہے۔ دوسرے مصرع میں، گریبان گھٹن کی علامت ہے۔ اشارہ اس وحشت کی طرف ہو اس گرفتاری، اس حصارِ تعینات کی بنا پر انسان کے متجسس ذہن کو لاحق رہتی ہے جب سے "گریبان سمجھا" کا ٹکڑا توضیح طلب ہے۔ اور اس سے مراد تعینات کا احساس ہے۔ اسے چاک کرتے رہنا گویا اس حصار یا گھٹن سے نکلنے کی کشمکش یا جہد ہو ذہنِ انسانی کرتا رہا ہے۔
اس غزل کے اشعار پر مسائلِ تصوف چھائے ہوئے ہیں۔ چنانچہ اگلے شعر میں کہتے ہیں:

تھا گریزاں مژۂ یار سے دل تا دمِ مرگ
دفعِ پیکانِ قضا اس قدر آساں سمجھا

موت سے گریزاں ہونا گویا مژۂ یار سے گریزاں ہونا ہے، کہ وہ تو محبوب سے ملانے والی ہے۔ مگر اس سے مفر کہاں۔ صاحبِ قضا و قدرت ہی آخری ملجا و ماویٰ ہے۔ کنایہ یہ بھی ہے کہ بزعمِ خود اس کی گرفت سے بچتے پھرے۔ سامنے پڑنے کا یارا یا منہ نہ تھا۔ چند الفاظ میں سب پہلو موجود ہیں۔ پھر بھی قدم تغزل سے باہر نہیں۔ بات غزل کی اصطلاحوں میں کی ہے۔ یعنی حسن سے مفر ممکن نہیں۔ وہ حاوی ہے اور عشق مجبور۔ یہ عزیز مضمون اس سطح پر ہے جہاں یہ شعر جو میرے مرحوم دوست ماحت سعید خاں چھتاری نے علی گڑھ کے زمانۂ طالب علمی میں پڑھا تھا:

حسن نے پیار کی نظروں سے ادھر دیکھ لیا
اب مفر کوئی نہیں موت نے گھر دیکھ لیا

(دیگر) زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی
کیوں ترا راہ گزر یاد آیا

غالب نے راہ گزر کو مذکر باندھ کر گویا شاہراہ کا ہم معنی کر دیا ہے: "اس کی طرف جو جائے گی وہ کوئی چھوٹی سی رہگزر یا گلی نہ ہوگی۔"

ویسے تو اس شعر کا مطلب سیدھا سادا ہے، یعنی زندگی تو جتنی جس کے نصیب میں ہے گزر ہی جاتی ہے، ہم نے ایک ایسا راستہ اختیار کیا جو زیادہ کٹھن تھا۔ ہم تیری سمت چل پڑے، تیری تلاش میں

نکل کھڑے ہوئے۔ غالب آپ حقیقت اصلی کو سمجھ سکتے ہیں، حس کی طرف پہنچنا انسان کی بضاعت سے باہر ہے کیا اپنے محدود و ناقص حواس کے ذریعے صرف عالم محسوس ہی کو کسی قدر جان سکتا ہے، وہ بھی مشتبہ طور پر۔ حقیقت اصلی ان حواس کی گرفت میں نہیں آتی۔

یہ اس شعر کی ایک تعبیر ہے۔ لیکن اس کا اطلاق کسی بھی ایسی صورت حال پر ہو سکتا ہے جہاں کسی نے کوئی دشوار راستہ اختیار کیا ہو اور اپنی زندگی کو اپنے شوق یا جذبے کی خاطر دشوار بنایا ہو بعض اوقات وہ اس پر تاسف بھی کرتا ہے کہ اپنے سر کیوں یہ مصیبت مول لی۔ مثلاً کوئی خود کو قوم کے درد یا انسانیت کی خدمت یا علمی تحقیق کے لیے وقف کردے۔ اور سکھ کی جگہ دکھ سہنا گوارا کرے یہ اس کے شوق اور ولولے کا تقاضا ہوتا ہے۔ لیکن کبھی کبھی دل اس سے گھبرا بھی سکتا ہے۔ مضمون انوکھا نہیں۔ لیکن شعر میں تعمیم کی گنجائش موجود ہے جسے ملحوظ نہ رکھا جائے تو وہی روایتی عاشق کا روایتی رونا رہ جاتا ہے۔

تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم
میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے

یہ غالب کے پسندیدہ اشعار میں شمار کیا جاتا ہے۔ اور لوگ مزے لے کر دہراتے ہیں۔ اس سے ایک عاشق بیمار کا تصور سامنے آتا ہے۔ جو عالم جدائی میں بیزار بیٹھا ہے۔ اپنے ہم جلیس کو منہ نہیں لگانا چاہتا۔ بلکہ بڑی صفائی یا بے مروتی سے کہتا ہے کہ تجھ سے بات نہیں کرنی۔ غالباً مضمون کو کچھ اس شعر کے ساتھ ربط ہے:

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا

چارہ ساز سے مراد غالباً طبیب نہیں بلکہ وہ شخص جو کار برآری میں مدد کرے۔ مشکل کو حل کرے۔ پہلے شعر میں ندیم کی نصیحت گری کا ذکر نہیں۔ اس لیے کوری بے دلی معلوم ہوتی ہے۔ عاشق بیمار کی روایتی بے کیفی اور مردم بیزاری۔ غالب کے ساتھ محض ایک مردم بیزار، عاشق بیمار کا تصور وابستہ کرنا کچھ ان کی عمومی شاعرانہ اور مفکرانہ حیثیت سے کمتر لگتا ہے۔ لیکن کہیں کہیں تو وہ میر سے زیادہ بے دماغ لگتے ہیں جنھوں نے کہا تھا۔

ہے نام عنقوں میں مرا میر ہے دماغ
از بسکہ بے دماغی نے پایا ہے اشتہار

خلاصۂ مضمون یہی ہے کہ محبوب کے ساتھ، رابطہ تھا وہی ٹوٹ گیا۔ نامہ برگم ہے پیغام ہے نہ سلام لہٰذا دل پر ایک وحشت طاری ہے۔ لیکن "چارہ سازی" کا نام نہ لینے پر بھی اس کا کنایہ موجود ہے کہ دوست ہو تو جاؤ کام کرو، نامہ بر کو ڈھونڈ کے لاؤ۔

قطرۂ مے بسکہ حیرت سے نفس پرور ہوا
خطِ جامِ مے سراسر رشتۂ گوہر ہوا

مولانا حسرت لکھتے ہیں: "جب ساغرِ مے لبِ یار سے ملا تو قطرہ ہائے مے بفرطِ حیرت منجمد ہو کر گویا گوہر بن گئے اور خطِ جام رشتۂ گوہر کی مانند ہو گیا۔"

لیکن شعر میں تو یار کے جام کو منہ لگانے کا کوئی اشارہ کنایہ نہیں۔ علاوہ ازیں منجمد تو خوف کر سکتا ہے، حیرت نہیں۔ "نفس پرور" سے منجمد ہونے کا مفہوم بھی نہیں نکلتا۔ دم سادھ لینے کے معنی میں جو کہہ میں بھی آئے ہیں کہ قطرۂ مے نے سانس سینے میں روک لیا، گویا بلبلہ بن گیا۔ بلبلہ بھی گوہر سے مشابہت رکھتا ہے، جما ہوا قطرہ ہی نہیں۔ اس میں تو وہ آب بھی نہیں ہوتی جو بلبلے میں ہوتی ہے۔ لہٰذا مضمون یہ کھلا کہ قطرۂ مے رگِ تاک سے نکل کر جام میں آیا تو حیرت سے دم سادھ کر رہ گیا کہ کس عالم میں آ گیا ہوں۔ یہ کہ اس کی وجہ سے خطِ جام رشتۂ گوہر بن گیا شاعرانہ نکتہ طرازی ہے۔
یہاں تک تو لفظی معنی کھلے۔ اب غالب کے مرغوب "مسائلِ تصوف" کی طرف آیئے تو
انسان کو جو چیزیں ودیعت ہوئی ہیں۔ ان میں سے ایک "حیرت" ہے جو اس کا طرۂ امتیاز ہے۔ دنیا میں جو جگمگاہٹ ہے وہ بڑی حد تک اسی جذبۂ حیرت کی دین ہے۔ خطِ جام گویا وہ حدود قیود جو نوعِ انسانی پر عائد ہیں۔ ان حدود تک جو کرشمے اس کی حیرت پیدا کر سکتی تھی وہ ہیں، بتا، اس وضاحت کی ضرورت نہیں کہ تمام علمِ انسانی کی بنیاد میں حیرت ہی کارفرما ہے نصابی ملاحوں میں

(دیگر) گر نہ اندوہِ شبِ فرقت بیاں ہو جائے گا
بے تکلف داغِ مہ مہرِ دہاں ہو جائے گا

مولانا حسرت لکھتے ہیں کہ "مطلب اس شعر کا صاف نہیں ہے:"

آیئے سوچنا شروع کرتے ہیں۔ تو ظاہر ہے کہ دماغ مہ چاند ہی کا مہر دہاں بن سکتا ہے کسی اور کے منہ پر تو جا کے نہیں لگ سکتا۔ اس کا مطلب یہ کہ چاند بات کرنا بند کردے گا۔ یعنی ہم نے اس سے بولنا چھوڑ دیا۔ اپنا حال دل اس کو نہ سنایا تو وہ بھی ہم سے نہ بولے گا۔ تغزل کی حد تک تو یہی مفہوم ہے کہ شب فرقت میں ہم چاند سے باتیں کرتے ہیں۔ جیسا کہ راقم الحروف نے بھی کہا تھا:

صبح شب فرقت ہے اے چاند خدا حافظ
یہ چار پہر اچھے کیا خوب بہم گزرے

لیکن اطلاق اس مضمون کا صرف اسی حد تک نہیں۔ یہاں بھی اسی جذبے کا ذکر ہے جو پچھلے شعر میں تھا۔ اگر ہم حقیقت سے دوری پر صبر کر کے بیٹھ رہے۔ اور دھوم نہ مچائی کہ یہ دوری ہمارے لیے کتنی باعث اندوہ ہے۔ تو کائنات بھی ہمیں کچھ نہ بتائے گی۔ اپنے راز نہیں کھولے گی حقائق فطرت ہم پر منکشف نہیں ہوں گے جب تک کہ پہل ہماری طرف سے نہ ہو۔

اگر مضمون یہاں تک نہیں پہنچتا تو غالب کو یاوہ گو ماننا پڑے گا۔ اور شاعری کو خرافات مرزا صاحب اپنا سا منہ لے کر رہ جائیں گے۔ اس سے زیادہ کیا کہیں گے جو پہلے ہی کہہ چکے ہیں۔

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

غالب اور انقلاب ۱۸۵۷ء

مصنفہ

ڈاکٹر معین الرحمٰن

مرزا غالب نے انقلاب ۱۸۵۷ء کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے۔ اس کتاب میں ایسی تمام تحریروں کو یکجا کر دیا ہے۔

"دستنبو" بھی مرزا غالب کا نثری کارنامہ ہے اس میں غالب نے ابتدائے ۱۸۵۷ء سے ۳۱ جولائی ۱۸۵۸ء تک اپنی سرگذشت رقم کی تھی۔ کتاب فارسی زبان میں تھی۔ غالب اور انقلاب ۱۸۵۷ء میں "دستنبو" کی پہلی اشاعت کا متن فوٹو آفسیٹ کے ذریعے شامل کیا گیا ہے اور ساتھ ہی فارسی متن کا اردو ترجمہ ہے جو رشید حسن خاں نے کیا ہے۔ مصنف نے اپنے عالمانہ تفصیلی مقدمے میں دستنبو کے زمانہ تحریر اور وجود تحریر کے متعلق سیر حاصل بحث کی ہے۔

صفحات۔ ۳۶۸

قیمت۔ ۶۰ روپے

رشید حسن خاں

انشاے غالب کا خطّی نسخہ

مرزا غالب کے منتخب کلامِ نظم و نثر پر مشتمل یہ ایک مختصر سی کتاب[1] ہے۔ یہ انتخابی مجموعہ کئی لحاظ سے اہم ہے۔ اس کی ایک اہمیت تو یہ ہے کہ یہ خود مرزا صاحب کا مرتب کیا ہوا ہے۔ یہ اہمیت بھی ہے کہ "یہ خطوطِ غالب کا سب سے پہلا مجموعہ ہے" اور یہ بھی کہ کلامِ غالب کے بعض اجزا کے لیے اِس کی حیثیت واحد ماخذ کی یا پھر اوّلین ماخذ کی ہے۔ مرزا صاحب نے اِس انتخابی مجموعے کی تمہیدی عبارت میں لکھا ہے:

"یہ کتاب جو دو باب کی ہے، حقیقت یہ اِس کتاب کی ہے کہ پہلے باب میں دو دیباچے اور کئی لطیفے اور کئی مکتوب ہیں۔ اگر میرے لکھے ہوئے نہ ہوتے تو میں کہتا کہ بہت خوب ہیں۔ دوسرا باب اشعار کا ہے کہ وہ بھی کلام اِسی خاکسار کا ہے۔ اگر کوئی خط اُردو زبان میں لکھا جائے، اُن اشعار میں سے شعر محل و مقام کے مناسب درج کیا جائے۔"

---

[1] مرتبہ راقم الحروف، ناشر: مکتبہ جامعہ نئی دہلی، سالِ طبع: ۱۹۹۳ء۔ یہ کتاب اِس سے پہلے تین بار چھپ چکی ہے۔ دو بار "انتخابِ غالب" کے نام سے اور ایک بار "انتخابِ رقعات و اشعارِ غالب" کے نام سے۔ انشاے غالب کے پیش لفظ میں اِن اشاعتوں سے متعلق ضروری تفصیلات لکھی گئی ہیں۔

یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے اختصار کے ساتھ اس انتخابی مجموعے کی وجہِ ترتیب* پر کچھ روشنی ڈالی جائے اور اس پر بھی گفتگو کی جائے کہ اس کا خطی نسخہ؛ مثلاً کہاں تھا، کیا مولوی ضیاالدین خاں دہلوی کے پاس تھا۔ یہ اس لیے ضروری ہے کہ اس گفتگو کے بغیر اصل موضوع کی وضاحت نہیں ہو پائے گی۔

شمس العلماء ڈاکٹر مولوی ضیاءالدین خاں دہلوی مرزا غالب کے ہم عصر تھے۔ انھوں نے "انشاے اردو" کے نام سے ایک نصابی مجموعہ مرتب کیا تھا۔ میں نے یہ کتاب نہیں دیکھی۔ مالک رام صاحب نے دیکھی تھی اور اس سے متعلق کچھ ضروری باتیں انشاے غالب (شائع کردہ مکتبہ جامعہ، نئی دہلی) کے مقدمے میں لکھی ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی عبارت کے ضروری اجزا کو نقل کر دیا جائے:

"۱۸۶۶ء میں حکومت کی طرف سے مولوی ضیاالدین خاں کو ایما ہوا کہ وہ اردو کا ایسا نصاب مرتب کریں جو نووارد فوجی افسروں کو اُردو پڑھانے کے لیے موزوں ہو۔ اس پر اُنھوں نے مختلف نثر نگاروں کی تحریروں سے مضامین منتخب کیے اور غالب سے درخواست کی وہ اپنے چند خطوط اور کچھ نثر عنایت کریں کہ اُنھیں بھی نصاب میں شامل کیا جا سکے۔ اس پر غالب نے یہ زیرِ نظر مجموعہ (انشاے غالب) مرتب کیا۔۔۔۔ اُنھوں نے یہ کتابچہ کاتب سے خوش خط لکھوایا اور نظرِ ثانی کے بعد اسے مولوی ضیاالدین خاں کے حوالے کر دیا۔۔۔۔ یہی غالب کا مرسلہ خطی نسخہ مولوی ضیاالدین خاں نے اپنی انشاے اردو کے لیے مسودے کے طور پر استعمال کیا تھا اور اسی سے کاتب نے کتابت کی تھی۔ اس میں بعض جگہ حاشیے پر صفحات کے نمبر اب بھی موجود ہیں جو بالعموم کاتب اپنی یادداشت کے لیے حاشیے میں لکھ دیتا ہے۔۔ مولوی ضیاالدین خاں نے صرف دس خط انشاے اردو میں لیے ہیں، بقیہ تمام مواد نظم و نثر اُنھوں نے نظر انداز کر دیا۔۔۔۔ مولوی صاحب موصوف نے خطوں کی

---

* اس وجہِ ترتیب سے متعلق میں اپنی رائے اس تحریر کے آخر میں پیش کروں گا۔

عبارت میں حسبِ منشا تبدیلی کر لی تھی۔ بعض الفاظ کاٹ دیے، کچھ بدل ڈالے۔ بعض جگہ سطروں کی سطریں خارج کر دیں :

حسنِ اتفاق سے مرزا صاحب کا مرتب کیا ہوا اور تصحیح کیا ہوا وہ خطی نسخہ دہلی میں محفوظ رہا اور ۱۹۲۳ء کے آس پاس کسی وقت دہلی سے حیدر آباد پہنچا اور وہاں سے ۱۹۳۹ء میں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے پاس پہنچا جو اُس زمانے میں ڈھاکہ یونی ورسٹی میں تھے۔ یہی خطی نسخہ ہمارا موضوعِ بحث ہے۔

اوپر جو کچھ لکھا گیا ہے اور جو ضروری تفصیلات پیش کی گئی ہیں، اُن سے یہ تو واضح طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ خطی نسخہ اصلاً مولوی ضیاء الدین خاں کے پاس تھا، مگر قطعیت کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انشائے اردو کی ترتیب کے بعد بھی وہ انھی کے پاس رہا۔ البتہ قیاس یہی کہتا ہے کہ یہ نسخہ مولوی صاحب ہی کے ذخیرۂ کتب میں محفوظ رہا اور اُس ذخیرے کی کتابیں جب بہ غرض فروخت بالاقساط حیدر آباد لائی جانے لگیں تو یہ خطی نسخہ بھی اُسی سلسلے میں حیدر آباد پہنچا تھا۔ (میرے قیاس کی بنیاد عبدالرزاق صاحب کے بیان پر ہے جس کو اِس عبارت کے بعد ہی نقل کیا گیا ہے)

اِس خطی نسخے کے سلسلے میں سب سے پہلا بیان ہمارے سامنے محمد عبدالرزاق صاحب کا ہے جنھوں نے اِس نسخے کو مکمل صورت میں پہلی بار ۱۳۴۵ھ (۱۹۲۶-۲۷ء) میں "چشتیہ پریس چھتہ بازار حیدر آباد دکن" میں چھپوایا تھا (اِس اشاعت سے متعلق ضروری باتیں اِس تحریر کے آخری حصے میں لکھی جائیں گی)۔ اُنھوں نے "تقریب" کے عنوان سے اپنے پیش لفظ میں لکھا تھا:

> "اِس کا مسوّدہ دہلی کالج کے پروفیسر ضیاء الدین ایل ایل ڈی کے وسیع کتب خانے سے برآمد ہوا ہے اور اب جناب منشی سید سجاد صاحب ایم۔ اے کے قبضے میں ہے۔ جناب موصوف عثمانیہ یونی ورسٹی میں اُردو کے اسسٹنٹ پروفیسر ہیں۔ آپ کو اُردو کے قدیم سرمایے کی حفاظت کا خاص ذوق ہے۔ ہم آپ کے نہایت ممنون ہیں کہ آپ نے یہ مجموعہ اشاعت کی غرض سے ہمیں عنایت فرمایا ہے۔ . . . ہم نے اِس کا نام "انتخابِ غالب" تجویز کیا ہے"۔

عبدالرزاق صاحب کے اِس بیان سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ (۱) اصل خطی نسخہ سید سجاد

صاحب کے قبضے میں تھا۔ (۲) یہ نسخہ مولوی ضیاء الدین خاں کے وسیع کتب خانے سے برآمد ہوا ہے۔ (۳) سیّد سجاد صاحب نے اشاعت کی غرض سے یہ نسخہ عبدالرزاق صاحب کو دیا تھا۔ (ان بیانات کا جائزہ ابھی لیا جائے گا)۔

زمانی ترتیب کے لحاظ سے اِس سلسلے کا دوسرا بیان ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کا ہے۔ صدیقی صاحب نے مالک رام صاحب کے نام ایک خط میں لکھا تھا:

"رقعاتِ غالب (انتخاب) میرے پاس بہت مدّت سے ہے۔ جب وہ نسخہ میری ملک میں آ رہا تھا، اُسی دوران میں ایک صاحب نے اسے مستعار لے کر نقل کر لیا (چھوٹا سا تو رسالہ ہے) اور چھپوا ڈالا۔ جو شخص میرے ہاتھ بیچ رہا تھا، اُس نے بے خبری۔ میں نے باوجود اس سلوک کے اُسے لیا۔ بعد کو چھپا ہوا نسخہ دیکھا، غارت کر کے چھاپا تھا۔ پھر ایک شخص نے اُن حضرت کی اجازت سے لاہور میں چھاپا۔ صورت بہتر لیکن غلط جیسا وہ تھا ویسا یہ۔ اب میں خود چھپوانے کا ارادہ کر رہا ہوں"[۱]۔

یہ خط ۸ فروری ۱۹۵۴ء کا ہے۔ صدیقی صاحب نے بہت اختصار سے کام لیا اور اس کی وضاحت نہیں کی کہ "جو شخص میرے ہاتھ بیچ رہا تھا" وہ کون تھا۔ اِس طرح قیاس آرائی کے لیے گنجایش نکل آئی۔ اِس کا حق ادا کیا مالک رام صاحب نے اور اِس طرح کہ اُس مبہم واقعے کے بیان میں کہانی جیسی دل چسپی پیدا ہو گئی۔ مالک رام صاحب نے اِس سلسلے میں لکھا ہے:

---

[۱] میرے سامنے اصل خط کی نقل ہے جو ڈاکٹر صدیقی کے صاحب زادے مسلم صدیقی صاحب کے قلم سے ہے۔ خط طویل ہے، مگر اُس کا بیش تر حصہ دوسرے معاملات سے متعلق ہے۔ میں نے ضروری عبارت نقل کی ہے۔ یہ مکمل خط رسالہ نقوش (لاہور) کے خطوط نمبر کی تیسری جلد میں ۱۹۶۸ء میں چھپ چکا ہے۔ مطبوعہ خط اور اس کی محوّلۂ بالا نقل کے متن کا جب میں نے مقابلہ کیا تو دونوں میں کچھ فرق نہیں پایا۔ اِسی خطوط نمبر کی تیسری جلد میں صدیقی صاحب کا ایک اور خط بھی چھپا ہے جو قریشی صاحب کے نام ہے، مورخہ ۸ ستمبر ۱۹۴۳ء۔ یوں تو اُس مکتوب (بہ نام قریشی صاحب) میں بھی "انتخاب غالب" کا ذکر آیا ہے، مگر اُس میں ایسی کوئی بات نہیں جو اِس بحث میں ہمارے کام کی ہو۔ اِس لیے میں نے اِس مکتوب بہ نام مالک رام صاحب کو اِس لحاظ سے پہلا خط کہا ہے

"حسنِ اتفاق سے غالب کے انتخاب کا یہ خطی نسخہ "انشار اردو" کی ترتیب و اشاعت کے بعد مولوی ضیاالدین خاں کے ذخیرے میں محفوظ رہا۔ اُن کی وفات کے بعد اُن کی کتابوں سے یہ برآمد ہوا اور ایک صاحب اسے لے کر حیدرآباد پہنچے۔ وہاں اُنھوں نے اسے محمد عبدالرزاق راشد کو دکھایا اور انھیں بتایا کہ وہ اسے بیچنا چاہتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ وہ نسخے کو دیکھ کر اس کی اہمیت تو بھانپ گئے لیکن وہ اس کے لیے کچھ دینا نہیں چاہتے تھے۔ اُنھوں نے مالک سے کہا کہ اِتنے مختصر وقت میں اسے دیکھنا محال ہے، آپ اسے چھوڑ جائیے، میں اطمینان سے دیکھ کر فیصلہ کر سکوں گا کہ آیا اس میں کوئی نئی چیز ہے یا نہیں اور اس کی قیمت کیا ہونا چاہیے۔

بات معقول تھی، مالک اس پر راضی ہو گیا اور نسخہ اُن کے حوالے کر کے چلا آیا۔ مختصر سی چیز تھی، راشد صاحب نے راتوں رات اس کی نقل لے لی اور جب مالک اگلے دن اُن کی خدمت میں حاضر ہوا، تو یہ کہہ کر کہ اس میں کوئی اہم اور نئی چیز نہیں ہے، اُنھوں نے خطی نسخہ اسے واپس کر دیا۔

اُس کے دو چار دن بعد وہ شخص اسے لے کر ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے پاس پہنچا۔ یہ اُن دنوں وہاں عثمانیہ یونیورسٹی کالج کے پرنسپل تھے۔ اُنھوں نے الٹ پلٹ کر اسے دیکھا تو فوراً جان گئے کہ یہ مجموعہ خود غالب کا مرتب کیا ہوا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اُنھوں نے مالک کو اس کے لیے دس روپے پیش کیے۔ ۔ ۔ ۔ اُس نے ان ۲۹ صفحات کے لیے ڈاکٹر صدیقی سے یہ دس روپے بھی بہت غنیمت خیال کیے اور اُن کی پیش کش قبول کر لی۔ یوں یہ نسخہ ڈاکٹر صاحب کی تحویل میں آ گیا۔[۱]

۱۔ مالک رام صاحب کی کتاب ذکرِ غالب کے چوتھے ایڈیشن (مکتبہ جامعہ، ۱۹۶۴ء) میں تصنیفاتِ غالب کے تحت صرف یہ عبارت ملتی ہے: "غالب نے جو نسخہ مولوی ضیاالدین خاں کے

(مقدمۂ انتخابِ غالب، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، ۱۹۹۳ء، ص ۳۴-۳۵)

تفصیلات اور جزئیات اِس طرح مرتب صورت میں سامنے آئی ہیں کہ اُن پر یقین کر لینے کو جی چاہتا ہے، مگر مالک رام صاحب نے یہ کہیں نہیں بتایا کہ یہ تفصیلات اُنھیں معلوم کیسے ہوئیں اور کب معلوم ہوئیں۔ ظاہر ہے کہ حوالے کے بغیر اِن تفصیلات کی کوئی حیثیت نہیں تھی، انھیں تسلیم نہیں کیا جاسکتا تھا؛ لیکن اِس سلسلے میں کہیں اور تفصیلات نہیں ملتی تھیں، اِس لیے اُن کے اِس بیان کے لیے یہ فرض کر لیا گیا کہ وہ درست ہوگا۔

صدیقی صاحب کے ذخیرے میں بہت سے معروف لوگوں کے خطوط اچھی خاصی تعداد میں محفوظ تھے۔ اُن کے فرزند جناب مسلم صدیقی نے کچھ خطوط میرے پاس بھیج دیے، مگر یہ اُس وقت کی بات ہے جب میں "انتخابِ غالب" کو مرتب کر کے برائے اشاعت بھیج چکا تھا۔ اُن خطوں میں سید سجاد دہلوی (استادِ شعبۂ اردو، عثمانیہ یونی ورسٹی کالج حیدرآباد) کے بھی چھے[1] خط تھے۔ یہ سب خط ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے نام ہیں۔ بعض خط طویل ہیں۔ فل اسکیپ سائز کے کاغذ پر باریک لکھائی کے کل ۴۳ صفحے ہیں۔ پہلا خط ۲۴ر اگست ۱۹۲۶ء کا ہے اور آخری خط ۲۹ جنوری ۱۹۲۷ء کا۔ میرے پاس خطوں کا جو پلندا آیا تھا، اُس میں کئی حضرات کے خط تھے۔ کچھ وقت تو اُن کے پڑھنے میں نکل گیا۔ جب سید سجاد صاحب کے خط پڑھنے بیٹھا تو اُس وقت تک انتخابِ غالب چھپ کر آچکی تھی۔ بہت قلق ہوا، خاص کر یوں کہ میں نے عدمِ واقفیت کی بنا پر مالک رام صاحب کی روایت کو درست سمجھ لیا تھا اور عبدالرزاق صاحب کے بیان کو یکسر غیر معتبر فرض کر لیا تھا۔ اگر ان خطوں کو پہلے دیکھ لیا ہوتا تو ان دونوں باتوں سے متعلق تفصیلات کسی اور طرح معرضِ بیان میں آتیں اور صورتِ حال کی وضاحت کی جاتی۔ اِن خطوں کو پڑھنے سے معلوم ہوا کہ یہ تو داستان ہی دوسری ہے، بات ہی بدلی ہوئی ہے اور یہ کہ اِس قضیے میں مرکزی حیثیت

(بقیہ پچھلے صفحے کا) سے لکھوایا اور اُنھیں دیا تھا۔ یہاں اُن کے کتاب خانے سے دست یاب ہوا اور کسی طرح عارضی طور پر جناب محمد عبدالرزاق صاحب کے ہاتھ آگیا، اُنھوں نے اسے مرتب کر کے ۔۔۔۔شائع کر دیا: (ص ۲۱۸)

[1] یہ مجموعہ شائع ہوا ہے ۱۹۹۳ء میں، لیکن مالک رام صاحب کے مقدمے کے آخر میں "۲۱، ستمبر ۱۹۷۲ء" لکھا ہوا ہے، یعنی یہ مقدمہ اُنھوں نے ۱۹۷۲ء میں لکھا تھا۔

سید سجاد صاحب کی تھی۔ صدیقی صاحب کے خط میں "جو شخص میرے ہاتھ بیچ رہا تھا" سے مراد سید سجاد صاحب ہیں۔

اِن خطوں سے کئی باتیں معلوم ہوئیں: (۱) دہلی سے کوئی صاحب سید صاحب کے پاس کتابیں بہ غرضِ فروخت حیدر آباد بھیجا کرتے تھے اور سید صاحب اُن کتابوں کو مختلف افراد اور کتاب خانوں کو دیا کرتے تھے۔ (۲) سید صاحب نے ایک ایک دو خطوں میں یہ بھی لکھا ہے کہ یہ کتاب اِس وقت تو یہاں موجود نہیں، جب میں دہلی جاؤں گا تب تلاش کروں گا یا لاؤں گا۔ (۳) سید صاحب نے اُن صاحب کا نام نہیں لکھا جو کتابیں بہ غرضِ فروخت بھیجا کرتے تھے (یا جن سے سید صاحب کتابیں منگایا کرتے تھے)، مگر اندازِ بیان سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ وہ صاحب کوئی قابلِ ذکر حیثیت رکھتے تھے (۴) ایک خط کے ساتھ دو صفحوں پر مشتمل ۴۴ کتابوں کی فہرست بھی ہے۔ اِس فہرست میں ۴۲ پر "غالب کے دو خطوط" بھی ہیں جن کے لیے لکھا گیا ہے کہ یہ غالب کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں اور "جہاں تک میں سمجھتا ہوں نامطبوعہ"۔ (۵) جس خط کے ساتھ یہ فہرست منسلک ہے اُس میں ایک جگہ سید صاحب نے لکھا ہے:

"آپ کے ارشاد کے مطابق اب کے پھیرے میں ساطعِ برہان، تیغِ تیز، سعادت علی اور سیّاح کی تحریریں دہلی میں تلاش کروں گا اور کامیابی ہوئی تو آپ کی خدمت میں عرض کروں گا، لیکن یہ جملہ امور دہلی جانے پر موقوف ہیں۔"

یعنی لوگ سید صاحب سے کتابوں کی فرمایش بھی کیا کرتے تھے اور سید صاحب خود بھی دہلی میں قابلِ فروخت کتابوں (وغیرہ) کی تلاش کیا کرتے تھے۔ ۳۰ ستمبر کے خط میں لکھا ہے:

"آپ کی مطلوبہ کتب میں سے تین کتابیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ حیدر آباد میں موجود نہیں ہیں۔ ان کا مجھے دہلی سے انتظار تھا ۔ ۔ ۔ ان کے مالک نے گذشتہ تین ماہ میں ان کے بھیجنے کے متعلق دو مرتبہ لکھا ۔ ۔ مگر وعدہ پورا نہ کیا۔ شاید اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ اپنی پہلی کتابوں کی فروخت اور ان کی رقم پہنچ جانے کے منتظر ہیں ۔ ۔ ۔ یہ کتابیں اُن کے پاس موجود ہیں اور مجھے یقین ہے کہ وہ اُن کو میرے سوا کسی کے ہاتھ نہیں بیچیں گے۔"

ان اقتباسات سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ سید سجاد صاحب کتابوں کی باقاعدہ خرید و فروخت
کیا کرتے تھے اور عموماً کتب دہلی سے آتی تھیں یا وہ خود جاکر تلاش کرکے لاتے تھے ۔
"انشائے غالب" کے خطی نسخے کا ذکر ان کے ۲۳ اگست ۴۶ء کے خط میں موجود ہے۔ غالب
کے دو خطوں اور بعض دوسری کتابوں کے متعلق اطلاع دیتے ہوئے لکھا ہے:

"میرے پاس غالب کے رقعات و تقاریظ اور اشعار کا ایک مختصر سا انتخاب پہنچا
ہے۔ مجھے یاد نہیں کہ میں اپنے سابقہ عریضے میں اس کا ذکر کرچکا ہوں یا نہیں۔ یہ انتخاب
خاص غالب کی قلم کا لکھا ہوا تو نہیں ہے لیکن کیا ہوا انھیں کا ہے۔ اس لیے کہ اس
کے شروع میں غالب نے اپنے طرزِ خاص میں ایک دیباچہ اور آخر میں ایک خاتمہ
تحریر فرمایا ہے۔ دیباچے میں وجہ یا ضرورتِ انتخاب کی صراحت کی ہے۔ یہ
دونوں عبارتیں بالکل نئی چیزیں ہیں۔ تقاریظ تمام مطبوعہ ہیں، لیکن خطوط
میں ایک خط اردوئے معلیٰ کی کسی اڈیشن میں نہیں اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں یہ بھی نیا ہے
یہ بھی خدمتِ والا میں مرسل کرتا ہوں۔ چاہے آپ اس کو خرید لیں یا اس کی
نقل لے لیں یا نقول کی ایک قلیل سی قیمت ادا فرمادیں اور اصل کو واپس فرمادیں
خطوط و انتخاب کے مالک پر میرا تھوڑا سا زور ہے میں اس سے کام لے سکتا
ہوں۔ یا آپ کی اجازت ہو تو میں ان کی قیمت ادا کردوں ...."

یہ خط تین ورق یعنی چھ صفحے کا ہے۔ آخری صفحے پر ختمِ عبارت کے بعد حاشیے پر یہ عبارت لکھی
گئی ہے: "خط آج ڈاک میں ڈال رہا ہوں۔ کل رجسٹری کے ذریعے سے (۱) غالب کے اصل خطوط
(۲) خط مطبوعہ ۱۸۶۵ (۳) انتخاب (۴) برہانِ قاطع بھیجوں گا۔ آج رجسٹری کا وقت نہیں
رہا" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انشائے غالب کے زیرِ بحث مخطوطے کو سید صاحب نے ۲۵ اگست
۴۶ء کو بذریعہ رجسٹری بھیجا ہوگا۔ صدیقی صاحب اُس زمانے میں ڈھاکہ یونیورسٹی میں تھے۔
اگلا خط ۳۰ ستمبر ۴۶ء کا ہے، اُس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ (اور کتابوں کے ساتھ) یہ
خطی نسخہ بھی صدیقی کے پاس پہنچ گیا تھا۔ صدیقی صاحب نے اِس دوران قیمت کے متعلق
دریافت کیا ہوگا، اِس خط میں اُس سلسلے میں یہ عبارت ملتی ہے:

"انتخاب، خطوط نامطبوعہ اور نامۂ غالب کی قیمت میں نے دریافت کی تھی۔ یہ جواب آیا کہ ان کی قیمت ہی کیا! اس کا دار و مدار خریدار کی ضرورت اور ذوق پر ہے۔ گویا قیمت مجھے کچھ نہ معلوم ہو سکی۔ میری رائے میں آپ اپنے اندازے سے ان سب کی ایسی قیمت مقرر فرما کر بھیج دیجیے جس میں آپ کو نقصان کا اندیشہ نہ ہو، اُس کے بعد دیکھا جائے گا۔"

زیر بحث خطّی نسخے کے سلسلے میں سب سے اہم خط ۱۸ ر نومبر ۱۹۲۶ء کا ہے۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ سیّد صاحب نے یہ خطّی نسخہ پہلے عبد الرزّاق صاحب کو دیا تھا اور بعد کو اسے صدّیقی صاحب کے پاس بھیجا۔ جب عبد الرزّاق صاحب نے اُسے چھاپ لیا تو اُس کے فوراً بعد انھوں نے اِس کی اطلاع صدّیقی صاحب کو دی۔ سیّد صاحب کے الفاظ یہ ہیں:

"انتخابِ رقعات و اشعارِ مرزا غالب، جس کا مسوّدہ آپ کی خدمت میں بھیج چکا ہوں، اس کے متعلق ایک عجیب واقعہ پیش آیا ہے اور اس کی اطلاع مجھے کل ہی ملی ہے۔ یہ مسوّدہ میرے پاس دو ڈھائی سال سے تھا۔ گذشتہ سال مولوی عبد الرزّاق صاحب .... میرے پاس تشریف لائے اور اپنے پرچے کے لیے .... مضمون مانگا۔ میں اُن ایّام میں حیدر آباد کے باہر جا رہا تھا۔ عجلت میں مضمون تو کیا لکھ سکتا تھا، میں نے یہ مسوّدہ ان کے حوالے کیا اور کہا نایاب چیز ہے، آپ اسے دیکھ کر اس پر ایک نوٹ مرتّب فرما لیجیے۔ وہ اسے لے گئے اور بجائے نوٹ ترتیب دینے کے، مسوّدے کی پوری نقل لے لی اور بغیر میری اجازت کے اپنے پرچے میں، جو کل ہی شائع ہوا ہے، اسے نقل کر دیا۔ اور نہ صرف اسی مہربانی پر قناعت کی، بلکہ اس کے سو نسخے علاحدہ چھپوا کر اسے دکن کی ایک انجمن ارباب ادب کے سلسلے میں داخل کر دیا۔ اس کے شائع ہونے کا تو مجھے رنج نہیں ہے، لیکن اشاعت نے جو صورت اختیار کی، وہ قابلِ افسوس ہے۔ بہر حال وہ مسوّدہ اب آپ کے لیے بے کار ہو گیا۔ آپ اسے اپنے مجموعے میں شامل نہ فرمائیں اور عنایت فرما کر اسے واپس فرما دیں۔

نیز خط وغیرہ کی قیمت جیسے اس کی قیمت وضع فرمالیں:

سید صاحب کے لکھنے کے مطابق یہ خطی نسخہ "دو ڈھائی سال سے" اُن کے پاس تھا، یعنی ۲۲ء کے اواخر میں آیا ہوگا۔ انھوں نے "گذشتہ سال" اسے عبدالرزاق صاحب کو دیا تھا، یعنی یہ واقعہ ۲۵ء کا ہے۔ یہاں مجھے دو باتوں پر تعجب ہے۔ سید صاحب خطی نسخوں کی عمومی قدر و قیمت سے خوب واقف تھے، اور اس نسخے کی اہمیت سے بھی بے خبر نہیں تھے۔ اِس صورت میں ایسے اہم مخطوطے کو اِس آسانی کے ساتھ کسی کے حوالے کر دینا کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ پھر یہ بھی دیکھیے کہ معذرتی الفاظ کس قدر کم زور اور کس قدر رسمی ہیں۔ اِسی سلسلے میں یکم دسمبر ۲۶ء کے خط میں سید صاحب نے لکھا ہے:

> اِس وقت تو مجھے اس کے متعلق ایک خفیف سی پریشانی یہ ہے کہ عبدالرزاق نے نہ اس کے چھاپنے کی اجازت لی اور نہ اس کے دام ادا کیے .... اور مسودہ ایک بڑے جھگڑالو حضرت کا ہے۔ ان کو معلوم ہوا کہ مسودہ اس طرح چھاپ لیا گیا ہے اور اس کے بعد انھیں نہ دام پہنچیں اور نہ مسودہ، تو ممکن ہے کہ وہ کچھ سر اُٹھائیں۔ میں کوشش کر رہا ہوں کہ عبدالرزاق اس کی کچھ قیمت ادا کر دیں۔ اگر وہ وصول ہو گئی تو پھر مسودہ آپ اپنے ہی پاس رکھیے گا:

"اور نہ اس کے دام ادا کیے" سے بہ ظاہر تو یہ مترشح ہوتا ہے کہ شروع ہی میں مخطوطے سے متعلق داموں کی کچھ بات اُن سے ہوئی تھی، یہ الگ بات ہے کہ عبدالرزاق صاحب زیادہ سمجھ دار نکلے اور اُنھوں نے مسودہ واپس کر دیا، خریدا نہیں، اور پھر کچھ وقفے کے بعد اُسے چھاپ لیا۔ جنوری کے خط سے میرے اِس شک کی تائید ہوتی ہے:

> "انتخاب کا معاملہ طے شدہ تصور نہ فرمائیے۔ عبدالرزاق صاحب کے پاس سے مجھے ہنوز کچھ نہیں وصول ہوا۔ دو ایک بار آدمی بھی بھیجا، مگر انھوں نے یہ کہلوا دیا کہ میں خود آ کر ملوں گا اور اس کا جواب دوں گا۔"

سید سجاد صاحب کے بیانات سے واقعے کی مکمل صورت گری نہیں ہو پاتی۔ یقین کے ساتھ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ یہ واقعہ اُسی طرح واقع ہوا تھا جس طرح اُسے سید صاحب نے لکھا ہے۔ سید صاحب حیدرآباد میں موجود تھے، عبدالرزاق صاحب بھی حیدرآباد میں تھے جب

عبدالرزاق صاحب نے "انتخابِ غالب" کے پیش لفظ میں یہ لکھا تھا کہ یہ مخطوطہ "جو مولوی ضیاء الدین خاں کے کتب خانے سے آیا ہے" اب سید سجاد صاحب کے "قبضے میں ہے" اور:

"ہم آپ کے نہایت ممنون ہیں کہ آپ نے یہ مجموعہ اشاعت کی غرض سے ہمیں عنایت فرمایا ہے۔"

اس سے یہ بات تو واضح طور پر سامنے آجاتی ہے کہ عبدالرزاق صاحب کو معلوم تھا کہ سید صاحب کے پاس دہلی سے کتابیں آتی ہیں۔ انھیں سے یہ بھی معلوم ہوا ہوگا کہ یہ خطی نسخہ مولوی ضیاء الدین خاں کے کتب خانے کا ہے۔ اس صورت میں اس خیال کا پیدا ہونا ناگزیر سا معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب نے یہ خطی نسخہ محض نوٹ تیار کرنے کے لیے نہیں دیا ہوگا۔ کچھ اور بات ہوئی ہوگی، جس کا ہمیں علم نہیں۔

سید سجاد صاحب کے بیانات میں ایک اور الجھن سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ انھوں نے ۱۸ نومبر کے خط میں صدیقی صاحب کو مطلع کیا ہے کہ گذشتہ سال میں نے عبدالرزاق صاحب کو "انتخابِ رقعات و اشعارِ مرزا غالب" کا مسودہ دیا تھا اس غرض سے کہ وہ اپنے رسالے میں چھاپنے کے لیے اس پر ایک نوٹ مرتب کر لیں۔ انھوں نے نوٹ مرتب کرنے کے بجائے مسودے کی پوری نقل لے لی اور اسے چھاپ دیا ـــــ اس کے بعد یکم دسمبر ۲۶ء کے خط میں اسی خطی نسخے کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"میں نے اس کے متعلق عبدالرزاق صاحب کو ایک نوٹ دیا تھا۔ انھوں نے اسے بھی اپنے نام سے چھاپ ڈالا۔ اور جب مجھ سے ملے تو فرمایا کہ میں نے ایسا کیا ہے۔ چاہے اسے سرقہ سمجھیے یا کچھ اور۔"

پہلے خط میں سید صاحب نے اس نوٹ کا ذکر نہیں کیا۔ اگر یہ صحیح ہے کہ انھوں نے اس مخطوطے سے متعلق ایک نوٹ بھی تیار کرکے دیا تھا، تو پھر ان کے اس بیان سے کیا مطلب نکالا جائے گا جس میں انھوں نے لکھا ہے کہ میں نے یہ مسودہ عبدالرزاق صاحب کو اس لیے دیا تھا کہ وہ اس سے متعلق ایک نوٹ مرتب کر لیں۔ جب نوٹ مرتب کرکے دے دیا گیا تھا تو پھر نوٹ مرتب کرنے کا مطلب کیا تھا؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب نے پورا واقعہ اس طرح نہیں

تھا جس طرح وہ واقع ہوا تھا۔ ہمارے پیش نظر اس وقت یہ معلوم کرنے کی کوئی صورت نہیں کہ اصلاً کیا بات ہوئی تھی اور کیا طے ہوا تھا۔

ایک بات اور : سید صاحب کے اس بیان کی روشنی میں کہ نوٹ میں نے مرتب کر کے دیا تھا اور عبدالرزاق صاحب نے اُسے بھی اپنے نام سے چھاپ ڈالا، بظاہر تو یہی بات سامنے آتی ہے کہ عبدالرزاق صاحب کے چھاپے ہوئے "انتخابِ غالب" میں ان کے نام سے جو پیش لفظ بعنوانِ "تقریب" ہے، اُس کا بیش تر حصہ اُن کا لکھا ہوا نہیں، بل کہ سید سجاد صاحب کا مرتب کیا ہوا ہے، جسے اُنھوں نے اجازت کے بغیر چھاپ لیا۔

اب رہی مالک رام صاحب کی روایت، سو وہ محض کہانی معلوم ہوتی ہے۔ سب سے بڑی بات اُس میں یہ ہے کہ اُس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عبدالستار صدیقی صاحب اُن دنوں حیدرآباد میں تھے جب وہ شخص اُن کے پاس خطی نسخہ بہ غرضِ فروخت لایا تھا اور دس روپے پر قناعت کر لی تھی؛ لیکن صدیقی صاحب اُن دنوں ڈھاکہ یونی ورسٹی میں تھے، حیدرآباد میں تھے ہی نہیں۔ یہ بات خود مالک رام صاحب نے بھی لکھی ہے۔ تذکرۂ معاصرین کی دوسری جلد میں صدیقی صاحب کے حالات کے ذیل میں انھوں نے لکھا ہے:

"۱۹۲۴ء میں وہ حیدرآباد سے ڈھاکہ یونی ورسٹی کے بلاوے پر شعبۂ عربی و علوم اسلامی کے صدر بن کر وہاں چلے گئے... ڈھاکے میں تقریباً چار برس کے قیام کے بعد وہ ۱۹۲۸ء میں صدرِ شعبۂ عربی و فارسی کی حیثیت سے الٰہ آباد آ گئے: (ص ۶۴)۔

مقالاتِ صدیقی جلدِ اول کے آغاز میں اُس کے مرتب اور صدیقی صاحب کے صاحبزادے جناب مسلم صدیقی نے بھی یہی لکھا ہے۔ سید سجاد صاحب کے خط میں صراحتاً مذکور ہے کہ یہ خطی نسخہ (بعض اور کتابوں کے ساتھ) ڈاک سے رجسٹری کے ذریعے اُن کے پاس بھیجا گیا تھا۔ اِس صورت میں ایک صاحب کا مخطوطہ لے کر آنا، پہلے عبدالرزاق صاحب کے پاس جانا، اُن کا رات بھر میں اُس کی نقل لے لینا اور پھر اُسے لوٹا دینا، دوسرے دن اُن صاحب کا صدیقی صاحب کے پاس آنا، پوری کہانی سنانا اور پھر دس روپے قبول کر لینا؛ یہ سب داستانی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

صدیقی صاحب تو حیدرآباد تھے ہی نہیں، دس روپے کس نے دیے اور بات کس سے ہوئی۔ معلوم نہیں یہ کہانی مالک رام صاحب کو کس نے سنائی تھی۔ مرحوم کی یہ عادت تھی کہ وہ سُنی سنائی روایتوں پر بہ آسانی اعتبار کر لیتے تھے، اُنھیں درجِ کتاب کر لیا کرتے تھے اور حوالہ دیتے نہیں تھے۔ میں نے ایک بار اِس پر اعتراض کیا تھا تو اُنھوں نے اُس کا جواب یہ دیا تھا کہ اپنا اپنا طریقۂ[1] کار ہے۔ اِسی طریقۂ کار کے باعث (جو سراسر غیر تحقیقی ہے) تذکرۂ معاصرین کی چاروں جلدوں میں بہت سی کمزور یا غیر معتبر روایتیں شامل ہو گئی ہیں اور اِس نے اِن کتابوں کی (اور اُن کی اور بہت سی تحریروں کی) استنادی حیثیت کو بے حد مشکوک بنا دیا ہے۔ وہی صورتِ حال یہاں بھی رونما ہوئی ہے۔

اِس بحث کی تلخیص اِس طرح کی جا سکتی ہے: (۱) انشائے غالب کا مخطوطہ سید سجاد صاحب کے بیان کے مطابق ۱۹۲۳ء میں کسی وقت اُن کے پاس آیا ہوگا۔ (۲) یہ مخطوطہ دہلی سے آیا تھا اور اِس کے مالک کوئی عام تاجرِ کتب نہیں تھے، کوئی خاص حیثیت رکھتے تھے۔ اگر عبدالرزاق صاحب کے بیان کو تسلیم کر لیا جائے (اور جس کے ماننے میں بہ ظاہر کوئی قباحت نظر نہیں آتی) تو یہ خطّی نسخہ دہلی سے مولوی ضیاءالدین صاحب کے کتب خانے سے آیا تھا (۳) سید سجاد صاحب کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اُنھوں نے ۲۵ اگست ۲۶ء کو (یا اِس کے ایک دو دن بعد) اُس خطّی نسخے کو ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے پاس بہ غرضِ فروخت بہ ذریعۂ ڈاک بھیجا تھا۔ (صدیقی صاحب اُس زمانے میں ڈھاکہ یونی ورسٹی میں تھے) (۴) ۱۸ نومبر ۲۶ء کے خط میں سید صاحب نے صدیقی صاحب کو مطلع کیا کہ میں نے عبدالرزاق صاحب کو وہ خطّی نسخہ "گذشتہ سال" (یعنی ۲۵ء میں کسی وقت) دیا تھا اور اب اُنھوں نے اِسے اپنے رسالے میں چھاپ

---

[1] تذکرۂ معاصرین حصّۂ دوم کے مقدّمے میں اُنھوں نے لکھا ہے: "میرے نزدیک ہر جگہ حوالہ دینے کی ضرورت نہیں۔ جو اصحاب اِس کے خلاف رائے رکھتے ہیں، میں اُن پر بھی اعتراض نہیں کر سکتا۔ وہ اُن کا طریقۂ کار ہے اور یہ میرا"۔ اِس سے پہلے تذکرۂ معاصرین حصّۂ اوّل پر میرا تبصرہ شائع ہو چکا تھا اور بہ ظاہر یہ بات اُسی سلسلے میں لکھی گئی ہے۔

لیا ہے میری اجازت کے بغیر ہو اُس کے سو نسخے الگ سے بھی چھاپ لیے ہیں۔ (۵) عبدالرزاق صاحب کا بیان ہے کہ سید صاحب نے وہ خطی نسخہ مجھے چھاپنے کے لیے دیا تھا۔ (۶) یہ بات بھی خطوں سے معلوم نہیں ہو سکی کہ جب صدیقی صاحب نے اِس تمادی کے باوجود خطوط کو اپنے پاس رکھنا چاہا، اور رکھا، اُس کے لیے کتنی رقم ہوائی تھی؟

اس سلسلے کی دو باتیں وضاحت طلب ہیں۔ پہلی بات انشائے غالب کی وجہِ تالیف سے متعلق ہے۔ مالک رام صاحب نے اس سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے، اُسے ابتدائے مضمون میں نقل کیا جا چکا ہے۔ اُس سے واضح طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مولوی ضیاءالدین خاں کی فرمائش کے نتیجے میں غالب نے اس کتاب کو مرتب کیا تھا۔ میں یہ بات پہلے ہی لکھ چکا ہوں کہ مولوی صاحب کی مرتب کی ہوئی نصابی کتاب انشائے اردو میں نے نہیں دیکھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ مولوی صاحب نے اُس کے دیباچے میں اس سلسلے میں کچھ لکھا ہے۔ اگر وہاں کچھ مرقوم نہیں، تو پھر یہ سوال پیدا ہوگا کہ اس سلسلے میں محولۂ بالا عبارت میں جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ کہاں سے معلوم ہوا؟

سب سے بڑھ کر یہ سوال سامنے آتا ہے کہ مولوی صاحب نے اگر مرزا صاحب سے محض نثر کی فرمائش کی تھی تو پھر مرزا صاحب نے یہ طریقہ کیوں اختیار کیا کہ نثر اور نظم، دونوں پر مشتمل باقاعدہ ایک کتاب مرتب کی، اُس پر مقدمہ لکھا اور مقدمے میں یہ بھی لکھا:

"یہ مجموعہ نذر اُس جناب رفعت مآب کی ہے جس سے عزت و توقیر فنانشل کمشنری پنجاب کی . . . . . حضرت فلک رفعت مکلوڈ صاحب بہادر۔"

یہی نہیں یہ بھی لکھا:

پس یہ کتاب اگر اُن کے حکم سے چھاپی جائے گی، تو صاحبانِ تازہ واردِ ولایت کے پڑھنے کے کام آئے گی:

اس کے بعد اپنے چچا کی "سرداری اور ریاست" کا کچھ حال لکھا اور پھر اس خواہش کا اظہار کیا: "البتہ میں اس کا مستحق ہوں کہ کورنس پوٹ گنا جاؤں":

مرزا صاحب نے اس کے لیے لفظِ "مجموعہ" اور پھر لفظِ "کتاب" استعمال کیا ہے۔ اُن

کے مقدمے کی عبارت کو پڑھ کر نا گزیر طور پر یہ خیال ذہن میں آتا ہے کہ مرزا صاحب نے اصلاً ایک باقاعدہ نصابی مجموعہ مرتب کیا تھا، جسے پنجاب کے فنانشل کمشنر کے نام معنون کیا۔ اس کا امکان ہے کہ ان کو کسی ذریعے سے یہ معلوم ہوا ہو کہ حکومت وقت نو واردِ انگریز افسروں کے لیے ایک نصابی مجموعہ مرتب کرانا چاہتی ہے۔ انھوں نے اسے "مدعا برآری" کا ایک اچھا وسیلہ سمجھا ہو اور اسی خیال کے تحت اس کتاب کو مرتب کیا ہو۔

ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے عرشی صاحب کے نام ایک خط میں ("معنی کی تشریح کے سلسلے میں) ضمنی طور پر اس سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے، اس سے بھی یہی مترشح ہوتا ہے۔ صدیقی صاحب کے خط کی متعلقہ عبارت یہ ہے:

"میرے پاس ایک اور قلمی چیز ہے۔ غالب کو خیال ہوا کہ "صاحبانِ تازہ واردِ ولایت کے پڑھنے" کے لیے ایک اردو کتاب بنائیں۔ چنانچہ اپنے لکھے ہوئے دو دیباچے اور کئی رقعے کاتب سے نقل کروائے۔ شروع میں اس کتاب کا خطبہ لکھ کر لگایا۔۔۔۔ اس کا جو نسخہ میرے پاس ہے، اس میں تقریباً ہر رقعے کی ابتدائی سطروں کے مقابل حاشیے پر "نوشتہ شد" اور لال روشنائی سے "مقابلہ نمودہ شد" لکھا ہوا ہے۔ کہیں کہیں کوئی عبارت قلم زد کی گئی ہے، کہیں کوئی لفظ۔ دو رقعے سراسر کاٹ دیے گئے۔۔۔۔ اس کتاب میں جہاں کہیں حک و اصلاح ہوئی ہے، مرزا غالب کے قلم سے معلوم ہوتی ہے۔ اصلاح کے لفظ جو کہیں کہیں آئے ہیں، انھیں کے خط میں ہیں۔۔۔"

(نوشتہ ۸، ستمبر ۴۳ء ــ نقوش خطوط نمبر، جلد سوم، ص ۲۵)

یعنی غالب نے "صاحبانِ تازہ واردِ ولایت" کے لیے ایک باقاعدہ نصابی "کتاب" مرتب کی تھی ــــ میری رائے میں یہی بات مرجّح حیثیت رکھتی ہے۔

یہ بات طے شدہ ہے کہ مولوی ضیاء الدین خاں نے اپنی نصابی کتاب انشائے اردو میں غالب کی جو نثر شامل کی، وہ اسی "کتاب" سے ماخوذ تھی۔ یہ بھی طے شدہ ہے کہ یہ مجموعہ ان کے پاس تھا اور انھوں نے اسی مجموعے کو کتابت کے لیے کاتب کے حوالے کر دیا تھا۔

کاتب نے اسی نسخے پر "نوشتہ شد" لکھا ہے اور کاتب ہی نے یا مصحح نے "مقابلہ کردہ شد" کے الفاظ لکھے ہیں۔ مکمل کتاب مولوی صاحب کے پاس کس طرح پہنچی؟ اس کا احوال معلوم نہیں۔ اس کا امکان ہے کہ مولوی صاحب نے مرزا صاحب سے اجزائے نثر کی فرمائش کی ہو اس غرض کے ساتھ کہ ایک نصابی کتاب میں انھیں شامل کر لیا ہے۔ مرزا صاحب نے کچھ اور خیال کیا ہو اور پوری کتاب مرتب کر کے بھیج دی ہو۔ اس کا بھی امکان ہے کہ مرزا صاحب نے بہ طورِ خود کتاب مرتب کی ہو اور جب صحیح صورتِ حال کا علم ہوا ہو تو مولوی صاحب کی فرمائش کے سلسلے میں اِس مجموعے کو اُن کے پاس بھیج دیا ہو کہ وہ خود انتخاب کر لیں۔ یہ سب قیاسات ہیں۔ جو معلومات سامنے ہیں، اُس کی روشنی میں فی الوقت قطعیت کے ساتھ کوئی بات نہیں کہی جا سکتی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ مرزا غالب کا مرتب کیا ہوا وہ مجموعہ مولوی صاحب کے پاس محفوظ رہا اور اُن کے انتقال کے بعد، جب اُن کے کتب خانے کی کتابیں بہ غرضِ فروخت حیدر آباد جانے لگیں سید سجاد صاحب کے توسط سے، تب یہ مجموعہ بھی حیدر آباد پہنچ گیا۔

دوسری وضاحت طلب بات ہے عبدالرزاق صاحب کے چھاپے ہوئے "انتخابِ غالب" اور رسالۂ تحفہ کے اُس مشترک شمارے کا سنہ طباعت جس میں اصلاً یہ "انتخابِ غالب" شائع ہوا تھا۔

میرے سامنے رسالۂ تحفہ (حیدر آباد) کا وہ شمارہ ہے جس کے ساتھ "انتخابِ غالب" شائع ہوا تھا۔ اُس کے سرورق کی تیسری سطر میں "نمبر ۱۰ و ۱۱ و ۱۲" لکھا ہوا ہے۔ اسی سطر میں، اِس کے آگے "شوال ذی قعدہ ذی حجہ ۱۳۴۳" لکھا ہوا ہے۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تین مہینوں کا مشترک شمارہ ہے۔

اِسی صفحے پر اِس کے بعد فہرستِ مضامین ہے۔ اِس فہرست کا آخری اندراج "انتخابِ غالب" ہے۔ اِس اندراج سے پہلے "حصۂ نظم" کے عنوان کے آگے صفحے کا نمبر "۴۸" لکھا ہوا ہے۔ "انتخابِ غالب" کے عنوان کے سامنے کوئی صفحہ نمبر درج نہیں۔ رسالہ ص ۴۸ پر ختم ہو جاتا ہے (یا یوں کہیے کہ مکمل ہو جاتا ہے)۔ اس کے بعد نیا سرورق لگا یا گیا ہے، جس

کے مندرجات کی تفصیل یہ ہے: "سلسلۂ انجمن احبابِ اردو / نمبر (۲) / انتخابِ غالب یعنی مرزا اسد اللہ خاں غالب دہلوی کے خطوط، لطائف، اشعار اور نقلوں کا ایک مختصر مجموعہ جس کو انھوں نے خود مرتب کیا تھا اور / جواب تک طبع نہیں ہوا / بہ تحشیہ و مقدمہ / از / محمد عبد الرزاق ایچ. سی. ایس، / مددگار محاسب سرکارِ عالی حکومت آصفیہ / ۱۳۴۵ھ / مطبوعہ چشتیہ پریس چھتہ بازار حیدر آباد دکن"

یعنی رسالۂ تحفہ (حیدرآباد) کے مشترک شمارۂ ۱۰، ۱۱، ۱۲ (شوال، ذی قعدہ، ذی حج) کے آخر میں اِس مجموعے کو "انتخابِ غالب" کے نام سے ایک الگ رسالے کی صورت میں، الگ سرورق کے ساتھ چھاپا گیا تھا اور پھر اُسی حصے کو رسالے کے اُس شمارے سے الگ کرکے مستقل رسالے کی صورت میں لے آیا گیا۔ چوں کہ رسالۂ تحفہ کا یہ شمارہ بیش تر لوگوں کی نظر سے نہیں گزرا تھا، اِس لیے اِس غلط فہمی نے رواج پایا کہ یہ انتخاب حیدرآباد میں دو بار چھپا تھا، ایک بار رسالۂ تحفہ میں اور ایک بار الگ سے کتابی صورت میں۔ یہ غلط فہمی بھی پھیلی کہ یہ انتخاب رسالۂ تحفہ کے تین شماروں میں (قسط وار) چھپا تھا۔ صحیح صورتِ حال یہ ہے کہ عبد الرزاق صاحب نے حیدرآباد میں اِسے ایک ہی بار چھاپا تھا رسالۂ تحفہ کے ساتھ رسالۂ تحفہ کا یہ شمارہ تینوں کا مشترک شمارہ تھا۔ ساتھ ہی "انتخابِ غالب" کے حصے کو الگ سے کتابی شکل میں پیش کیا گیا اور اِس طرح یہ ایک مستقل کتاب بن گئی[1]۔ سید سجاد صاحب نے اپنے ۱۸ نومبر ۳۶ء کے خط میں یہ بھی لکھا ہے کہ اِس کے سو نسخے علاحدہ چھپوائے گئے تھے۔

اِس سلسلے کی دوسری بات ہے سنہ طباعت۔ رسالۂ تحفہ کے سرورق پہ صرف یہ مرقوم ہے: "شوال ذی قعدہ ذی حج ۱۳۴۴ھ" اِس کا واضح طور پر مطلب یہ ہے کہ یہ اُن تین مہینوں کی نشاندہی ہے جن کا تعلق اِس خاص شمارے سے ہے۔ "۱۳۴۴ھ" سنہ طباعت نہیں۔ یعنی

---

[1] اِس طریقۂ کار سے آج کل بھی کام لیا جاتا ہے۔ ایک خاص حصے کو کسی رسالے کے آخر میں شامل کیا گیا اور اُس حصے کی الگ سے بھی کچھ زائد کاپیاں چھپوالی گئیں۔ یوں رسالہ بھی رہا اور ایک مستقل کتاب بھی سامنے آگئی۔

نہیں کہہ سکتے کہ یہ شمارہ ۱۳۴۴ھ میں چھپا تھا۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ ۱۳۴۴ھ کے اُن آخری تین مہینوں کا یہ مشترک شمارہ ہے ________ "انتخابِ غالب" کے سرورق پر سالِ طبع "۱۳۴۵ھ" مرقوم ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ رسالۂ تحفہ "مع انتخابِ غالب" ۱۳۴۵ھ میں چھپا تھا۔

سید سجاد صاحب نے ۱۸ نومبر ۲۶ء کے خط میں صدیقی صاحب کو "انتخابِ غالب" کے چھپ جانے کی اطلاع دیتے ہوئے لکھا ہے کہ عبدالرزاق نے اسے "بغیر میری اجازت کے اپنے پرچے میں، جو کل ہی شائع ہوا ہے، اسے نقل کر دیا۔" "کل ہی شائع ہوا ہے" کا مطلب بظاہر یہی ہے کہ ۱۷ نومبر ۲۶ء کو رسالۂ تحفہ کا وہ شمارہ شائع ہوا تھا جس کے ساتھ "انتخابِ غالب" چھپا تھا۔ (اس تعین میں زیادہ سے زیادہ ایک دو دن کا فرق ہو سکتا ہے) میرے سامنے انجمن ترقی اردو پاکستان کی شائع کی ہوئی تقویم ہے۔ اُس کے مطابق ۱۳۴۵ھ مشتمل ہے ۱۲ جولائی ۱۹۲۶ء سے ۳۰ جون ۱۹۲۷ء کے عرصے پر۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ۱۳۴۴ھ کے آخری تین مہینوں پر مشتمل رسالۂ تحفہ کا شمارہ ۱۳۴۵ھ کے پانچویں مہینے میں شائع ہوا تھا۔ یہی سنہ اشاعت "انتخابِ غالب" کا قرار پاتا ہے، یعنی "انتخابِ غالب" عبدالرزاق صاحب کے اہتمام سے نومبر ۱۹۲۶ء میں شائع ہوا تھا۔

ذیل میں سید سجاد صاحب دہلوی کے خطوں کا مکمل متن پیش کیا جاتا ہے۔ اس کے دو مقصد ہیں: ایک تو یہ کہ سید صاحب کے یہ خط محفوظ ہو جائیں کہ ان میں کام کی کچھ باتیں ہیں۔ دوسرے یہ کہ انتخابِ غالب کے خطی نسخے سے متعلق سید صاحب نے جو کچھ لکھا ہے، وہ سامنے آ جائے۔ جیسا کہ لکھا جا چکا ہے، یہ سب خط ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے نام ہیں، جو اُن دنوں ڈھاکہ یونی ورسٹی میں تھے۔ خط ۱ کے ساتھ ایک ورق الگ سے منسلک تھا جس کے دونوں طرف کتابوں کے نام لکھے ہوئے ہیں، بعض کے سامنے قیمتیں بھی لکھی گئی ہیں۔

اِس خط میں اِس کا حوالہ بھی آیا ہے۔ اِس ورق کے دونوں صفحے عکسی صورت میں اِس خط کے ساتھ ہی پیش کیے گئے ہیں۔

(۱)

کنگ کوٹھی روڈ حیدرآباد دکن

۲۳ اگست ۲۶ء

جناب مخدومی شفیقی زاد لطفہ   آداب عرض۔

والا نامہ مجھے کل شام کو ملا اور نوکر نے یہ بیان فرمایا کہ یہ کل کا آیا ہوا رکھا ہے۔ آج پوسٹ مین سے تحقیقات کی اور لفافے کی مہر کو دیکھا تو یہ ۱۲ اگست کا حیدرآباد پہنچا ہوا ہے۔ یہ عجیب ماجرا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ نوکر اسے رکھ کر بھول گیا۔ افسوس ہے آپ اب تک اس کے جواب کے انتظار کی زحمت اٹھا رہے ہوں گے۔

غالب کے خطوں کے متعلق آپ کو یہ معلوم کر کے افسوس ہوگا کہ میں نے ان دونوں کی نقلیں مولوی عبدالحق صاحب کے پاس رسالۂ اردو میں چھپنے کے لیے بھیج دیں۔ تین ہفتے ہوئے وہ حیدرآباد تشریف لائے تھے۔ اُن خطوں کو اور اُن کے نامطبوعہ ہونے کو دیکھ کر بے چین ہوئے اور مجھ سے نقلوں کی فرمائش کی۔ میں نے فوراً اس کی تعمیل کر دی۔ خدا جانے وہ ان کو جولائی کے نمبر میں چھاپیں گے یا اکتوبر کے نمبر میں۔ جولائی کا پرچہ ہنوز کتب خانے میں موصول نہیں ہوا، تاہم میں اصل خطوط آپ کی خدمت گرامی قدر میں بھیجے دیتا ہوں۔ آپ بھی انھیں ملاحظہ فرمالیں اور ایک ایسی قلیل قیمت پر خرید فرمالیں جس کا مجھے علم نہیں لیکن جو مالکِ خطوط کو بہت زیادہ ناگوار نہ گزرے۔ آپ کو ایسی چیزوں کا وسیع تجربہ ہے اور قیمت کے متعلق آپ کا فیصلہ میرے نزدیک نہایت معتبر ہوگا۔

میں نے غالب ہی کا ایک خط اور نکالا ہے اور وہ عن قریب حیدرآباد آنے والا ہے۔ میں اُسے بجنسہٖ جناب کی خدمت میں روانہ کر دوں گا اور عبدالحق صاحب کو نہ دوں گا اس لیے کہ مجھے یہ معلوم کر کے نہایت مسرت ہوئی کہ آپ کے[1] اس قطعے کے اور رقعات موجود ہیں اور آپ

---

[1] بہ ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اِس کے بعد لفظ "پاس" لکھنے سے رہ گیا ہے۔

ان کو طبع فرمانے کا قصد رکھتے ہیں۔

میرے پاس غالب کا ایک خط نہایت طویل تقریباً ۲۰ یا ۲۵ صفحے کا ہے۔ اسے میں خدمت میں بھیجتا ہوں۔ یہ مطبوعہ رقعات میں شامل نہیں ہے۔ لیکن جیسا کہ آپ ملاحظہ فرمائیں گے ۱۸۷۵ میں ایک مرتبہ خود غالب کی حیات میں چھپ چکا ہے۔ اس کی نقل حکیم احسن اللہ خاں غدار نے کرائی تھی اور یہ وہی نقل ہے۔ ۵۰ سال کے بعد اور نایاب ہونے کی وجہ سے یہ بھی تقریباً نیا ہے۔ خواہ آپ اس کو خرید لیں خواہ اس کی نقل حاصل فرمالیں۔ اگر آپ خرید لیں تو زیادہ مناسب ہے۔

میرے پاس غالب کے رقعات، تقاریظ اور اشعار کا ایک مختصر سا انتخاب بھی پہنچا ہے۔ مجھے یاد نہیں کہ میں اپنے سابق عریضے میں اس کا ذکر کر چکا ہوں یا نہیں۔ یہ انتخاب خاص غالب کی قلم کا لکھا ہوا تو نہیں ہے لیکن کیا ہوا انھیں کا ہے۔ اس لیے کہ شروع میں غالب نے اپنی طرزِ خاص میں ایک دیباچہ اور آخر میں ایک خاتمہ تحریر فرمایا ہے۔ دیباچے میں وجہ یا ضرورتِ انتخاب کی صراحت کی ہے۔ یہ دونوں عبارتیں بالکل نئی چیزیں ہیں۔ تقاریظ تمام مطبوعہ ہیں لیکن خطوط میں ایک خط اردوئے معلیٰ کی کسی اڈیشن میں نہیں نکلا اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں یہ بھی نیا ہے۔ اس انتخاب میں رقعات کے بعد دو ایک نقلیں اور ایک ... حکایت بھی ہے۔ ان کا ذکر مولوی حالی نے یادگارِ غالب میں فرمایا ہے لیکن نہایت سرسری طور پر۔ غالب نے انھیں کو اپنی عبارت اور ظرافت کے پیرایے میں لکھا ہے۔ بہ ہر حال آپ ان باتوں کو خود ہی دریافت فرمالیں گے۔ میں نے انتخاب کے مواد کا مقابلہ اردوئے معلیٰ کی چار مختلف اڈیشنوں سے کیا ہے۔ یہ بھی خدمتِ والا میں مرسل کرتا ہوں۔ چاہے آپ اس کو خرید لیں یا اس کی نقل لے لیں یا نقول کی ایک قلیل سی قیمت ادا فرما دیں اور اصل کو واپس فرما دیں۔ خطوط و انتخاب کے مالک پر میرا تھوڑا سا زور ہے میں اس سے کام لے سکتا ہوں۔ یا آپ کی اجازت ہو تو میں ان کی قیمت ادا کر دوں آپ صرف نقول حاصل فرمالیں لیکن آپ ان کو اپنے مجموعے میں طبع ضرور فرما دیں۔

قاطعِ برہان کا نسخہ میرے ساتھ حیدرآباد میں ہے، اس کی قیمت صرف پانچ روپے ہے

اسے آپ خود دیکھ لے لیں۔ بعد اگر کوئی دوسرا نسخہ دست یاب ہوگیا تو یونیورسٹی کے لیے بھیج دوں گا لیکن مجھے امید مطلق نہیں۔ اسے بھی بذریعۂ رجسٹری خدمت گرامی میں بھیج رہا ہوں۔

شرح قصائدِ سودا تین یا چار روز گزرے الٰہ آباد یونیورسٹی کے پروفیسر اردو میرے ایک دوست سید حفیظ صاحب کے پاس بھیج چکا ہوں۔ اسے سید صاحب نے ۲۵ روپے میں خرید لیا۔ چھوٹی سی کتاب تھی۔ کچھ قصائد اور مثنویات وغیرہ کی شرح تھی۔ میں نے اسے بھی نہایت کارآمد پایا تھا۔ اس میں اشعار متن بھی درج تھے جو مطبوعہ کلیاتِ سودا انتخاب کلیات میں عام طور سے غلط ملتے ہیں۔ اس کی نسبت میں نے تحریک کی ہے اسے چھپوا دیا جائے۔

دیوانِ صائب دہلی میں ایک صاحب کے پاس ہے۔ میں نے اس کو نہایت عجلت کی نظر سے دیکھا تھا اور مجھے اس کی قیمت بھی معلوم نہیں۔ اب کوشش کر کے حیدرآباد منگائے لیتا ہوں۔ مزید تفصیل اور قیمت سے جناب کو مطلع کروں گا۔ فوائد الافکار کا حال کسی اور عریضے میں عرض کروں گا۔ باقی کتابوں کی قیمت ایک دوسرے پرچے پر درج کرتا ہوں۔ ان میں سے بعض کتب مثلاً دو سو روپے والی پند و نصائح اور تذکرۂ شعرا کے لیے مولوی عبدالحق صاحب نے اور طبقات الشعرا کے لیے سید حفیظ صاحب نے فرمایش کی ہے۔ مولوی صاحب نے پند و نصائح کی قیمت پر اعتراض کیا ہے اور میں نے اس اعتراض کو مالک کتاب کے پاس بھیج دیا ہے۔ دیکھیے کیا جواب آتا ہے۔ اگر آپ کی یونیورسٹی کو بھی بعض قیمتیں زیادہ معلوم ہوں تو مجھے ضرور مطلع فرمائیے لیکن میں ان کو اُن صاحب کے ہاتھ فروخت کروں گا جن کی بولی سب سے زیادہ ہوگی۔ اس لیے کہ جہاں میرا ایک جانب ضروری فرض یہ ہے کہ انھیں محفوظ کر دیا جائے وہاں یہ فرض بھی ہے کہ کتاب کے مالکان کو قیمت میں نقصان نہ پہنچے۔

جو کتابیں آپ کے ہاں خرید لی جائیں گی اُن کی قیمت ادا ہونے سے قبل میں اُن کو آپ کی خدمت میں بیمے کے ذریعے بھیج دوں گا۔ آپ نے ان کو ایسا ہی پایا جیسا میں بتلا چکا ہوں تو اس کے بعد آپ قیمت بھیجنے کا انتظام فرما دیں۔ سخت تعجب ہے کہ ریاضی وغیرہ کی کتابوں پر آپ کی یونیورسٹی نے توجہ نہیں کی۔ یہ تو تمام کتابوں سے زیادہ ضروری ہیں خاص کر دہلی سوسائٹی کی کتابیں تو انمول ہیں۔ یہ نسخے کہیں نکل گئے تو پھر کہاں سے آئیں گے اور بغیر ان کے

آپ کی یونیورسٹی میں تحقیقات زبان و ادب اردو کیوں کر ممکن ہوگی۔ آپ کے ارشاد کے مطابق میں ان کے لیے لکھنؤ، اعظم گڑھ وغیرہ لکھوں گا۔ مجھے ان کتابوں کی جدائی کا بڑا صدمہ ہے۔

میں نے ڈاکٹر عبدالحق صاحب کو آپ کی ہدایت کے خلاف آپ کا پیام و سلام نہیں پہنچایا۔ انھوں نے آپ کی مہربانیوں اور پے در پے طلبیوں کو پروفیسر مارگولیتھ کی تائید و ثنا خواہی و اپنی خوبی و لیاقت پر محمول فرمایا ہے اور اس کا چرچا جا بجا کیا ہے۔ حالانکہ جس زمانے میں میں نے آپ کی خدمت گرامی قدر میں ان کے متعلق عریضہ لکھا ہے تو یہ محکمے کی بے اعتنائیوں اور سخت بے التفاتیوں سے بغایت نالاں تھے اور ڈھاکے کے موقع کو ایک نعمت خیال فرماتے تھے بلکہ اگر میرا ظن، ظن بد نہیں ہے تو آپ کی مہربانی کا آفرنہ آنے کی صورت میں شاید دس سال تک ان کو پروفیسری کا گریڈ نہ ملتا اگر ڈھاکے کا معاملہ پیش نہ آتا اور اگر آیا تھا اور یہاں اس کے ساتھ یہ سلوک نہ کرتے تو مجھے ان کی ترقی سے بے حد خوشی ہوتی لیکن اب تو ایک شکایت سی پیدا ہو گئی ہے۔ میں آپ کی نظروں میں اپنے آپ کو بھی کسی قدر نادم سمجھتا ہوں۔ میں نے ان سے اس معاملے میں ڈھاکے کے خط کے بعد کوئی ذکر نہیں کیا اس سبب سے آپ کا پیام پہنچانے سے بھی قاصر رہا۔ مولوی غلام اور محمد ابراہیم صاحب ان کے ماتحت کر دیے گئے ہیں، دونوں سرکشی پر تلے ہوئے ہیں۔

حیدرآباد کے حالات آپ نے اخباروں میں ملاحظہ فرمائے ہوں گے۔ یہاں اس پرسش کو ایک خطرۂ عظیم سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ خدا کرے جو کچھ ہو مسلمانوں کی بہتری کے لیے ہو۔ امید کہ مزاج والا بعافیت ہوگا۔

خادم سید سجاد

خط آج ڈاک میں ڈال رہا ہوں، کل رجسٹری کے ذریعے سے (۱) غالب کے اصل خطوط (۲) خط مطبوعہ ۱۸۶۵ (۳) انتخاب غالب (۴) برہان قاطع بھیجوں گا۔ آج رجسٹری کا وقت نہیں رہا۔

فہرست

(۱) [illegible] قطعہ [illegible] [illegible] جس [illegible] اور [illegible] آگرہ [illegible] مطبوعہ ۱۸۸۵ صفحات ۱۳۱

(۲) The Principles of Hydrostatics
by T. Tate [illegible]
یعنی اصول [illegible] ترجمہ [illegible] پرشاد
[illegible] دہلی [illegible]
صفحات ۲۵۰ -

(۳) [illegible] الجبر [illegible] صاحب [illegible]
[illegible] انجیری [illegible]
صفحات ۱۵۴ - [illegible] دہلی [illegible]
[illegible]

(۴) [illegible] شرح [illegible] صاحب [illegible]
[illegible] مطبوعہ ۱۸۴۳ صفحات ۲۲۵

(۵) [illegible] شرح [illegible] صاحب [illegible]
[illegible] ۸۱
[illegible] صفحات [illegible]

(۶) [illegible] مطبوعہ ۱۸۷۹

(۷) Practical Land Surveying
ترجمہ [illegible] مطبع [illegible]
[illegible] صفحات ۱۸۴

(۸) [illegible] مطبوعہ ۸۲

(۹) [illegible] آکسفورڈ [illegible]

(۱۰) [illegible]
[illegible]
[illegible] ۱۸۸۵ صفحات [illegible]
[illegible] ۱۸۵ [illegible]

(۱۱) [illegible] مطبوعہ ۸۶۲

(۱۲) [illegible]
[illegible] مطبوعہ ۱۸۶۹ صفحات ۲۲۰

(۱۳) [illegible]
[illegible] مطبوعہ ۱۸۲۶ صفحات ۳۴۴ جلد

(۱۴) [illegible] Bodies of [illegible] – Photographed
[illegible] manuscript prepared under the
[illegible] of T. J. [illegible] Further collated
[illegible] original manuscript & annotated
A. Rogers. London. Sampson Low
Marston & Co.

[illegible]

Grammar of the Hindustani Language (?) by John Shakespeare Printed 18[illegible].

A Grammar of the Persian Language (?) by William Jones Printed 1775.

Grammar of the Hindustani Lang (?) by Duncan Forbes Printed 1866

Grammar of Hindustani or Urdu Lang (19) by John T Platts Printed 1874

Gilchrist[1] General Grammar of the Hindustani Language P. 1796.

[illegible]

دیوان غالب [illegible]

[illegible]

(۲)

حیدرآباد

۳۰، ستمبر ۴۶ء

مخدومی و مکرمی زاد لطفہ آداب عرض۔

والا نامہ مجھے دو پہر قبل مل گیا تھا۔ آپ کی عنایت و توجہ کا شکریہ۔ میں یہ جواب خدمت گرامی میں بہت تعویق کے بعد بھیج رہا ہوں۔ اس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ آپ کی مطلوبہ کتب میں سے تین کتابیں طبقات الشعراء، شعرائے عرب اور تاریخ ابوالفدا میرے پاس حیدرآباد میں موجود نہیں ہیں۔ ان کا مجھے دہلی سے انتظار تھا۔ اور دوسرا سبب یہ کہ کامل ایک عشرے سے میری طبیعت ناساز ہے۔ میں کالج بھی نہیں جا رہا ہوں۔ آج بڑی ہمت کر کے یہ عریضہ لکھنے بیٹھا ہوں لیکن افسوس ہے کہ مذکورالصدر کتب ابھی تک دہلی سے وصول نہیں ہوئیں۔ ان کے مالک نے گذشتہ تین ماہ میں ان کے پہنچنے کے متعلق مجھے دو مرتبہ لکھا اور دو مرتبہ سخت منتظر رکھا مگر وعدہ پورا کر کے نہ دیا۔ شاید اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ اپنی پہلی کتابوں کے فروخت ہونے اور ان کی رقم پہنچ جانے کے منتظر ہیں۔ اس کے بعد وہ ان کتابوں کو روانہ فرمائیں گے۔ یہ کتابیں ان کے پاس موجود ہیں اور مجھے یقین ہے کہ وہ اُن کو میرے سوا کسی صاحب ہاتھ نہیں بیچیں گے۔

میرا ارادہ تھا کہ جو کتابیں میرے ساتھ حیدرآباد میں ہیں وہ حسب الارشاد آپ کی خدمت میں بھیج دوں گا مگر آپ کو یہ معلوم کر کے افسوس ہوگا کہ میں نے یہ ارادہ اب ترک کر دیا ہے۔ چند روز ہوئے میں نواب صدر یار جنگ شروانی صاحب سے ملا تھا۔ دوران گفتگو میں ان سے ان کتابوں کا ذکر بھی آیا اور جب ان کو یہ علم ہوا کہ میں انھیں عنقریب آپ کی خدمت میں ارسال کرنے والا ہوں تو وہ بہت برہم ہوئے اور کہا کہ ان کتابوں پر پہلے عثمانیہ یونیورسٹی کا حق ہے، اس کے بعد کسی اور کتب خانے کا۔ میں نے یہاں کی مشکلات بیان کر دیں تو انھیں رنج ہوا اور پھر یہ کہا کہ میں بالفعل وطن جا رہا ہوں، واپسی پر میں خود کوشش کر کے انھیں کالج کے کتب خانے میں ضرور داخل کرا دوں گا۔ آپ ان کتابوں کو اپنے پاس محفوظ رکھیں۔

جناب کو یاد ہوگا کہ میں ان کتابوں کو اپنے ہی کام کے لیے اور اپنی ضرورت سے لایا تھا، لیکن جب میں یہاں سے مایوس ہوگیا تو میں نے آپ کی خدمت والا قدر میں عریضہ بھیجا تھا اب یہ صورت پیدا ہوگئی ہے اس لیے مجھے امید ہے کہ از راہ شفقت و ہمدردی آپ میرے اس عمل کو خلاف طبع گرامی محسوس نہ فرمائیں گے اور شیروانی صاحب نے جو وعدہ فرمایا ہے اس کے پورا ہونے کا موقع عطا فرمائیں گے۔ تاہم قاطع القاطع جو خاص آپ کی ضرورت کی کتاب ہے بذریعہ رجسٹری خدمت میں بھیجتا ہوں۔ اس کی رسید سے اطلاع بخشیں۔ اس کے سوا کوئی اور کتاب جو قاطع القاطع کی مانند خاص آپ کے کام کی ہو اس کے نام سے آگاہ فرمائیں تو شیروانی صاحب کی ہدایت کے باوجود میں اسے بھی آپ کی خدمت میں ضرور بھیج دوں گا۔

طبقات، عرب اور ابوالفدا کی نسبت ایک خط میں عرض کر چکا ہوں کہ اس کے نسخے میں نے اپنے کتب خانے میں دو سال پہلے داخل کرا دیے ہیں۔ جن نسخہ جات کا مجھے دہلی سے انتظار ہے وہ آپ کی خدمت میں بھیج سکتا ہوں، اس لیے جب وہ موصول ہو جائیں گی تو آپ کے پاس روانہ کر دوں گا۔

آپ کے ارشاد کے مطابق اب کے پھیرے میں ساطع برہان، تیغ تیز، سعادت علی اور سیاح کی تحریریں دہلی میں تلاش کروں گا اور کامیابی ہوئی تو آپ کی خدمت میں عرض کروں گا۔ مجھے ۱۸۵۹ کی چھپی ہوئی ایک اردوے معلی کا پتا لگا ہے۔ یہ ہاتھ آگئی تو اس کا حال آپ کو لکھوں گا اور اردوے معلی کے اصل مواد کے متعلق بھی تحقیقات کروں گا لیکن یہ جملہ امور دہلی جانے پر موقوف ہیں۔

"انتخاب" کا مقابلہ میں نے جن چار اڈیشنوں سے کیا ہے وہ حسب ذیل ہیں: (۱) مطبوعہ کلکتہ لوہے کا چھاپہ ۱۸۸۲۔ (۲) مطبوعہ لکھنؤ (۳) الہ آباد اور (۴) لاہور۔ نامطبوعہ خط غالب وہی ہے جس کی آپ نے نشاندہی فرمائی ہے مجھے جو کچھ یاد ہے وہ یہ ہے کہ نامطبوعہ خط ما قبل آخر یا اس سے قبل کا خط ہے۔ دیباچے، خاتمے اور نقل و حکایت کے سوا باقی تقاریظ و رقعات مطبوعہ ہیں۔ "انتخاب" کے پہلے ورق کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا اڑا ہوا ہے۔ میرے پاس بھی اسی حالت میں پہنچا تھا۔

قاطع القاطع کی قیمت ۸ ہے۔ قاطع برہان اور اس کی قیمت میں سے کب کا جو مزاج چاہے، وہ کم کر دیجیے۔ مالک نے کمی کو منظور کر لیا تو آپ کو مطلع کر دوں گا۔ انتخاب خطوط مطبوعہ اور نامۂ غالب کی قیمت میں نے دریافت کی تھی۔ یہ جواب آیا کہ اعلیٰ قیمت ہی کیا۔ اس کا دارو مدار خریدار کی ضرورت اور ذوق پر ہے۔ گویا قیمت مجھے پھر نہ معلوم ہو سکی۔ میری رائے میں آپ اپنے اندازے سے ان سب کی ایسی قیمت مقرر فرما کر بھیج دیجیے جس میں آپ کو نقصان کا اندیشہ نہ ہو۔ اس کے بعد دیکھا جائے گا۔

امید ہے کہ مزاج گرامی بعافیت ہو گا۔

خادم
سید سجاد

(۴)

حیدرآباد
۱۴ اکتوبر ۲۶ء

مخدومی و شفیقی زاد لطفہ۔ آداب عرض۔

تین چار روز ہوئے آپ کا تفصیلی عنایت نامہ اور کل ایک کارڈ صادر ہوا۔ آپ کا شکر گزار ہوں کہ کتابوں کے خدمت میں نہ پہنچنے کو آپ نے شکایت کا موجب قرار نہ دیا۔ جن کتابوں کے دوہرے دوہرے نسخے ہاتھ آئیں انھیں آپ کی خدمت میں ضرور پیش کروں گا اور آیندہ قیام دہلی میں آپ کی ضرورت کی تمام چیزیں تلاش کروں گا۔

اردوے معلیٰ مطبوعہ ۱۸۵۹ کا نسخہ دہلی کے قریب سے ایک صاحب کے پاس حیدرآباد میں پہنچا ہے، لیکن افسوس ہے کہ ہنوز میں نے اس کو نہیں دیکھا۔ بظاہر ہے کہ اس میں رقعات کی تعداد کم ہو گی۔ بہرحال جب میں اسے دیکھ لوں گا تو پورا حال آپ کی خدمت گرامی میں پہنچا دوں گا۔ کلکتہ ۱۸۸۴ کا نسخہ جو ہمارے کتب خانے میں موجود ہے، وہ آپ ہی کے زمانے کا ہے۔ لکھنؤ کی اڈیشن بہت پرانی ہے، اسے نولکشور نے چھاپا ہے۔ اس میں رقعات کے دونوں حصے ہیں لیکن اس کا کاغذ ناقص، لکھائی چھپائی بری اور کتابت کی غلطیاں بے شمار۔

ل بظاہر "آئیں گے" ہونا چاہیے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "گے" لکھنے سے رہ گیا ہے۔

دہلی کی ایڈیشن سال کی ہے۔ تو باری دو دونہ مبارک علی کتب فروش نے چھاپی ہے۔ یہ بھی دونوں
حصوں پر مشتمل ہے اور لکھنؤ کی اڈیشن سے بدرجہا بہتر ہے۔

۔ دہلائے میری سمجھ میں بھی نہیں آیا۔ مجھے یقین نہیں کہ مولوی محمد جان نے DELHI کو
اردو میں اس طرح لکھا ہو یا اس کا ترجمہ کیا ہو۔ یہ محض راہن ہے اور مولوی محمد جان کی طبیعت اور وضع داری
کے منافی ہے۔ ان کا مطبع جہاں تک مجھے یاد ہے، محلہ رودگران میں واقع تھا۔ یہ محلہ نہایت وسیع ہے
اس میں ایک جگہ مدرسہ کہلاتا ہے۔ مولوی صاحب کا مکان اور ان کی اور جائیداد خود اس میں اور
اس کے قریب کی تھی (کذا)۔ گرد و پیش کی گلیوں میں ایک گلی میر مداری ہے، ایک احاطہ گھمن کا
ایک محلے کا کنواں زیادہ مشہور ہیں۔ رودگران کا بہت بڑا حصہ میری والدہ کی ننھیال کی ملکیت تھا
میں اس کے ایک ایک گھر سے واقف ہوں، لیکن یہاں "دہلائے" نام کا کوئی مقام نہیں۔ عکس
سے غالباً آپ کی مراد فوٹو گراف ہے، لیکن یہ عکس عجیب قسم کا ہے کہ اس میں مولوی صاحب کے
نام کا جزو "محمد" (جیسا کہ آپ نے تحریر فرمایا ہے "انو" اترا ہے۔ بہرکیف اگر آپ چیستان "دہلائے"
کو حل فرمانے کی سخت ضرورت تصور فرمائیں تو مجھے اطلاع دیجیے، میں مولوی صاحب مرحوم کے
صاحبزادے یا ایک اور معتبر شخص ڈاکٹر رام سنگھ کے لڑکے حکیم فضل الدین سے دریافت کر کے
صحیح حال خدمت گرامی میں حاضر کر دوں گا۔

قاطع القاطع کے پہنچنے کا علم ہوا، مجھے اس امر سے بے حد خوشی ہے کہ اس قسم کا مواد آپ کے
جیسے ہاتھوں میں محفوظ ہو گیا۔ خطوط اور کتابوں کی جو مجموعی قیمت آپ نے تجویز فرمائی ہے
وہ میرے نزدیک مطلق درست ہے۔ میں اس باب میں مشورہ دینا عبث سمجھتا ہوں۔ آپ
دونوں ہاتھوں سے چھوٹے میزان کی رقم میرے پاس بھیج دیجیے۔ میں اسے مالک کے پاس فی الفور
کر دوں گا۔ کوئی بات نکلی تو میں خود ہی اس کو طے کر دوں گا۔ اور اگر کوئی خاص اور نہایت ضروری
اعتراض پیدا ہو گیا تو آپ کی خدمت میں اطلاع بھیج دوں گا۔ بالفعل آپ اس مواد کا معاملہ
طے کیجیے اور جس طرح سے مزاج چاہے، اس سے کام لیجیے، تامل مطلق نہ فرمائیے حضرت ملک
کو جب میں آپ کی رقم بھیجوں گا تو یہ لکھوں گا کہ فلاں فلاں چیزیں میں نے فروخت کر دیں اور
ان کی یہ رقم ملی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس صورت میں اگر ان کے دل میں رقم کے متعلق کوئی

اختلاف وارد ہوگا، تو یہ کہہ کر کہ اب تو سودا ہو چکا ہے، وہ اسے زبان تک نہ لائیں گے یہ غالباً ازراہ اخلاقی دھکا دینا نہ ہوگا بلکہ ان کی نیت کو ڈانواڈول ہونے سے بچانا ہوگا۔

ہاں وہ تیسرا خط جس کا میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا، ابھی تک مجھے وصول نہیں ہوا، حالانکہ اس کے مالک نے مجھے اس کی نسبت دو خط لکھے تھے اور بھیجنے کا حتمی وعدہ کیا تھا۔ آپ جو رقم ہر سال فرمائیں اُس میں سے اس کی قیمت وضع فرمالیں۔ مجھے امید ہے کہ دو ایک ہفتے میں اس کے بہم پہنچنے کا انتظام کروں گا انشاء اللہ۔

میری طبیعت بفضلہ اب درست ہے۔ میں گذشتہ دو سال سے علیل چلا آتا ہوں۔ پچھلے برس ایک انتڑی کے زخم میں بمبئی جاکر آپریشن بھی کرایا اور اس کی سخت تکلیفیں جھیلیں مگر اب کچھ روز سے میں نے معالجے کا غیر معمولی انتظام کیا ہے۔ خدا سے امید ہے کہ جناب والا کا مزاج گرامی بخیریت ہوگا۔

خادم سید سجاد

(۴)

کنگ کوٹھی روڈ حیدر آباد

۱۸ نومبر ۲۶ء

مخدومی و مکرمی زاد عنایتہ۔

گرامی نامے اور پوسٹ کارڈ کے جواب میں میں نے ایک عریضہ آپ کی خدمت میں بھیجا تھا۔ اس بات کو شاید کئی ہفتے گزر چکے ہیں لیکن آپ کا خیریت نامہ موصول نہیں ہوا۔ امید ہے کہ مزاج بعافیت ہوگا۔

انتخاب رقعات و اشعار مرزا غالب، جس کا مسودہ آپ کی خدمت عالی میں بھیج چکا ہوں۔ اس کے متعلق ایک عجیب واقعہ پیش آیا ہے اور اس کی اطلاع مجھے کل ہی ملی ہے۔ یہ مسودہ میرے پاس دو ڈھائی سال سے تھا۔ گذشتہ سال مولوی عبدالرزاق صاحب مددگار صدر محاسب جنہوں نے اقبالؔ کے کلام پر ایک مبسوط مقدمہ لکھا ہے اور پورا کلام کلیات اقبال کے نام سے شائع کیا ہے، میرے پاس تشریف لائے اور اپنے ایک پرچے کے لیے، جس کی عنان ادارت

اُنھی زمانے میں ان کے سپرد کی تھی۔ مضمون مانگا۔ میں اُن ایام میں حیدرآباد کے باہر جارہا تھا عجلت میں مضمون تو کیا لکھ سکتا تھا میں نے یہ مسودہ اُن کے حوالے کیا اور کہا یہ نایاب چیز ہے آپ اسے دیکھ کر "اس پر ایک نوٹ مرتب فرمالیجیے" وہ اسے لے گئے اور بجائے نوٹ ترتیب دینے کے مسودے کی پوری نقل لے لی اور بغیر میری اجازت کے اپنے پرچے میں، جو کل ہی شائع ہوا ہے، اسے نقل کر دیا۔ اور نہ صرف اسی مہربانی پر قناعت کی، بلکہ اس کے سولہ نسخے علاحدہ چھپوا کر اُسے دکن کی ایک انجمن ارباب ادب کے سلسلے میں داخل کر دیا۔

اس کے شائع ہونے کا تو مجھے رنج نہیں ہے لیکن اشاعت نے جو صورت اختیار کی، وہ قابل افسوس ہے۔ بہرحال وہ مسودہ اب آپ کے لیے بے کار ہو گیا، آپ اسے اپنے مجموعے میں شامل نہ فرمائیں اور عنایت فرما کر اسے واپس فرمادیں۔ نیز خط وغیرہ کی قیمت میں سے اس کی قیمت وضع فرمادیں۔

امید ہے کہ آپ کا مزاج بخیریت ہوگا۔ والسلام

خادم

سید سجاد

(۵)

حیدرآباد یکم دسمبر[1]

مخدومی و مکرمی زاد لطفہ۔ آداب عرض۔

گرامی نامہ صادر ہوا۔ میں نے مبارک سے اسی وقت کہا ہے کہ عبدالرزاق صاحب کے پاس سے انتخاب کا ایک نسخہ خرید کر لے آئیں۔ امید ہے کہ وہ آج یا کل تک لے آئیں گے۔

---

[1] اس خط میں سنہ موجود نہیں۔ اس کی پیشانی پر "(۱۹۴۳ء)" لکھا ہوا ہے اور یہ غالباً ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے قلم سے ہے۔

آجائے گا تو خدمت میں بھیج دوں گا۔ اصل مسودے کو بالفعل تو آپ اپنے پاس رہنے دیجیے بعد میں اگر اس کی ضرورت نہ ہوئی تو مستقل طور پر آپ اسے اپنے ہی پاس رکھیے گا۔ اس وقت تو مجھے اس کے متعلق ایک خفیف سی پریشانی یہ ہے کہ عبدالرزاق صاحب نے نہ اس کے چھاپنے کی اجازت لی اور نہ اس کے دام ادا کیے اور اسے اپنی انجمن کے سلسلۂ مطبوعات میں داخل کر لیا ہے اور مسودہ ہے ایک بڑے جھگڑالو حضرت کا۔ ان کو معلوم ہوا مسودہ اس طرح سے چھاپ دیا گیا ہے اور اس کے بعد انھیں درم نہیں پہنچیں تو ممکن ہے کہ وہ کچھ سر اٹھائیں۔ میں کوشش کر رہا ہوں کہ عبدالرزاق صاحب اس کی کچھ قیمت ادا کر دیں اگر وہ وصول ہو گئی تو پھر مسودہ آپ اپنے ہی پاس رکھیے گا، مجھے اس میں خوشی ہوگی۔

میں نے اس کے متعلق عبدالرزاق صاحب کو ایک نوٹ دیا تھا۔ انھوں نے اسے بھی اپنے نام سے چھاپ ڈالا۔ اور جب مجھ سے ملے تو یہ فرمایا کہ میں نے ایسا ایسا کیا ہے۔ چاہے اسے سرقہ سمجھیے یا کچھ اور۔ مجھے اس امر کا تھوڑا سا قلق رہے گا کہ ایک چیز جو میں نے خدمت عالی میں بھیجی تھی، وہ میری ہی غفلت سے ناقص ہو کر رہ گئی۔

معلوم نہیں آپ کی یونی ورسٹی میں ممتحنین کا تقرر کس زمانے میں ہوتا ہے۔ اگر نامناسب نہ ہو تو میں ممتحن ہونے کے لیے درخواست بھیج دوں۔ میں دو سال سے ایم۔ اے میں بھی کام کر رہا ہوں بلکہ آپ کے تشریف لے جانے کے بعد ایم۔ اے میں ہسٹری آف پرشین لٹریچر کا شعبہ بھی میرے سپرد کر دیا گیا تھا۔ جب سے ڈاکٹر نظام الدین آئے ہیں، وہ اس کام کو انجام دے رہے ہیں۔

کیا مثنوی گلشن عشق شیخ نصرتی (۱۰۶۸ ہجری بیجاپور) کا کوئی نسخہ آپ کے پاس موجود ہے؟ نہ ہو تو اطلاع بخشیے۔ امید ہے کہ آپ کا مزاج گرامی بخیریت ہوگا۔

خادم

سید سجاد

(۶)

کنگ کوٹھی روڈ

حیدرآباد ۲۹ جنوری[1]

مخدومی و مکرمی زاد لطفہ

آپ کے دو عنایت نامے اور پندرہ روپے کا منی آرڈر وصول ہوا۔ خدمت میں شکریہ لیکن براہ کرم انتخاب کا معاملہ طے شدہ تصور نہ فرمایئے عبدالرزاق صاحب کے پاس سے مجھے ہنوز کچھ نہیں وصول ہوا۔ دو ایک بار آدمی بھی بھیجا تھا مگر انھوں نے یہ کہلوا دیا کہ میں خود آکر ملوں گا اور اس کا جواب دوں گا۔

گلشن عشق کی بابت آپ نے جو سطر ایک لفافے کی پشت پر تحریر فرمائی تھی، اس کا ضروری حصّہ ڈاک خانے کی مہر میں آگیا اور باوجود کوشش کے مجھ سے پڑھا نہ گیا اگر اس میں کوئی بات ضروری اور جواب طلب تھی، تو عنایت فرما کر پھر لکھ دیجیے۔ خدمت عالی میں جواب بھیج دوں گا۔

آپ کی تقریر بمبئی کا نہایت مختصر بلکہ ادھورا سدھورا اقتباس بمبئی کے اخبار انڈین ڈیلی میل میں آیا تھا۔ میں نے صرف اسی کو دیکھا ہے۔ اگر آپ کا لکچر طبع ہوا ہو یا اُس کی کوئی فالتو کاپی آپ کے پاس موجود ہو تو عنایت فرما کر اسے میرے پاس بھی بھیج دیجیے اور اگر آپ کی مرسلہ کاپی فالتو نہ ہوئی تو دیکھنے کے بعد میں اسے آپ کے پاس واپس بھیج دوں گا۔

امید ہے کہ آپ کا مزاج گرامی بخیریت ہوگا

خادم

سید سجاد

---

[1] سنہ مذکور نہیں۔ اوپر بائیں طرف "۲ جنوری ۱۹۳۶ء" مرقوم ہے۔ یہ غالباً ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے قلم سے ہے۔

ڈاکٹر خلیق انجم

قاضی عبدالودود، ماہرِ غالبیات

بیسویں صدی کی نئی نسل کے محققوں میں چار نام قابلِ ذکر ہیں، حافظ محمود شیرانی، امتیاز علی خاں عرشی، قاضی عبدالودود اور مالک رام۔ دل چسپ حقیقت یہ ہے کہ ان میں شیرانی صاحب کو چھوڑ کر باقی تین حضرات کا شمار ماہرینِ غالب میں ہوتا ہے۔ عرشی صاحب اور مالک رام صاحب کو ماہرِ غالب ہونے کا اعزاز اپنی زندگی ہی میں حاصل ہو گیا تھا۔ لیکن قاضی عبدالودود کو ابھی تک یہ حیثیت حاصل نہیں ہوئی۔ عرشی صاحب کی عربی، فارسی اور اردو میں تقریباً بیس تصنیفات و تالیفات اور لگ بھگ ایک سو پچاس مضامین ہیں۔ ان میں پچاس مضامین غالب کی شخصیت اور فن پر ہیں۔ لیکن عرشی صاحب کو ان کی دو تصنیفات "مکاتیبِ غالب" اور "دیوانِ غالب" (نسخۂ عرشی) نے ماہرِ غالب بنایا ہے۔ اگرچہ غالب پر ان کی دو کتابیں اور ہیں "فرہنگِ غالب" اور "انتخابِ غالب" لیکن ان دونوں کو نسبتاً کم شہرت حاصل ہوئی۔ مالک رام صاحب مرحوم نے غالب پر کئی کتابیں تصنیف یا مرتب کی ہیں۔ مثلاً "گلِ رعنا"، "فسانۂ غالب"، "ذکرِ غالب"، "گفتارِ غالب"، "سبدِ چیں"، "تلامذۂ غالب" اور انگریزی میں مرزا غالب پر ایک کتاب۔ لیکن مالک رام صاحب کی شہرت کا مدار "ذکرِ غالب" اور "تلامذۂ غالب" پر ہے۔ قاضی عبدالودود نے قدیم اور جدید اردو، فارسی تصنیفات پر تبصرے کر کے ان کی خامیوں اور تحقیقی غلطیوں کی طرف توجہ دلائی تو ان کے بارے میں عام تصور یہ ہو گیا ہے کہ اُن کا سارا کام منفی تحقیق اور تنقید ہے۔

یہ تصور ہمارے اُن حضرات کا پیدا کردہ ہے جن کی کتابوں پر اُنھوں نے تبصرے کیے تھے اور اُن کی تحقیقی غلطیوں کی نشاندہی کی تھی۔ اُن تبصروں کو منفی تحقیق کہنا ہرگز مناسب نہیں ہے۔ لیکن اگر منفی تحقیق واقعی کوئی چیز ہے تو اس کے موجد قاضی صاحب سے پہلے محقق شیرانی صاحب ہیں جنھوں نے علامہ شبلی کی "شعرالعجم" پر طویل تبصرہ کیا تھا جو انجمن ترقی اردو (ہند) کے سہ ماہی رسالہ "اردو" میں ۱۹۲۳ء سے ۱۹۲۷ء تک قسط وار شائع ہوتا رہا۔ بعد میں اسے کتابی صورت میں چھاپا گیا۔ شیرانی صاحب کا ادبی کارنامہ صرف یہ کتاب ہی نہیں ہے بلکہ وہ محققانہ اور عالمانہ کتب ہیں اور بے شمار مضامین بھی ہیں، جو ادبی، تاریخی اور علمی موضوعات پر لکھے گئے ہیں۔ خدا نے اُن کے پوتے ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی کو یہ توفیق دی ہے کہ وہ اپنے دادا کے تمام مضامین غیر معمولی سلیقے کے ساتھ مرتب کر کے شائع کر رہے ہیں۔ اس طرح اردو رسالوں میں بکھرا ہوا یہ بیش بہا ادبی سرمایہ محفوظ ہو گیا ہے۔

مالک رام مرحوم نے اپنی آخری زندگی میں بڑا کام یہ کیا کہ اپنے تقریباً تمام مضامین مرتب کر کے مکتبہ جامعہ سے مختلف کتابوں کی صورت میں شائع کر دیے۔ اس طرح یہ قیمتی سرمایہ بھی محفوظ ہو گیا۔

اردو تحقیق کی خوش نصیبی ہے کہ قاضی مرحوم کو ڈاکٹر عابد رضا بیدار جیسا اسکالر مل گیا جو قاضی صاحب کے زبردست معتقد ہیں۔ جن کی وجہ سے قاضی صاحب کی تمام تحریریں محفوظ ہو گئی ہیں۔ یہ انتہائی افسوس کی بات ہے کہ عرشی صاحب کو کوئی پوتا ملا نہ ادارہ۔ ان کی کتابوں کا کوئی نیا ایڈیشن شائع نہیں ہوا اور اُن کے مضامین آج بھی رسالوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ کاش رضا لائبریری (رام پور) عرشی صاحب کی تمام کتابوں کا نیا ایڈیشن چھاپے اور ان کے تمام مضامین مرتب کر کے کتابی صورت میں شائع کر دے۔

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ اردو میں قاضی صاحب کو محض ایک منفی محقق کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ ہمارے ممتاز محقق اور نقاد بھی انھیں صرف محقق ہی سمجھتے رہے ہیں۔ عام خیال ہے کہ قاضی صاحب نے "جہانِ غالب" کے نام سے غالب پر مختصر تحریریں قلم بند کی ہیں اور غالب کی کتاب "قاطع برہان" کے بارے میں کچھ لکھا ہے۔

میں نے جو کچھ عرض کیا، اس کا ثبوت یہ ہے کہ غالب انسٹی ٹیوٹ نے ۱۹۸۵ء میں قاضی صاحب کی علمی خدمات کے اعتراف کے طور پر ایک طلائی تمغہ اُن کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ جناب مالک رام، پروفیسر مسعود حسین خاں، پروفیسر سید امیر حسن عابدی، پروفیسر محمد حسن، گوپال متل صاحب، رشید حسن خاں صاحب، پروفیسر گوپی چند نارنگ اور راقم الحروف نے اس موقع پر قاضی صاحب کو تحریری طور پر خراجِ تحسین پیش کیا تھا اور یہ تحریریں ایک کتابچے کی صورت میں شائع کی گئی تھیں۔ ان تمام تحریروں میں غالب پر قاضی صاحب کی تحقیق کا ذکر بہت کم کیا گیا ہے۔ مالک رام صاحب مرحوم ماہرِ غالب ہونے کی حیثیت سے غالب پر قاضی صاحب کے کام سے بخوبی واقف تھے۔ لیکن انھوں نے اپنی تحریر میں کچھ مضامین کا ذکر کرتے ہوئے قاضی صاحب کے دو مضامین "جہانِ غالب" اور "غالب بحیثیت محقق" کا حوالہ دیا ہے۔ کچھ لوگوں نے ان تحریروں میں غالب پر قاضی صاحب کے کام کا ذکر تک نہیں کیا اور کچھ نے صرف ایک آدھ مضمون کا حوالہ دینا کافی سمجھا۔ اس کتابچے کے شروع میں ایک سپاس نامہ شامل کیا گیا ہے، جس میں البتہ غالبیات کے سلسلے میں قاضی صاحب کی تحقیق کا ذکر ہے۔ میں نے اِس مقالے کے آخر میں سپاس نامے کی متعلقہ عبارت نقل کی ہے۔

پروفیسر نذیر احمد کی تجویز اور ذاتی کوششوں سے غالب انسٹی ٹیوٹ نے قاضی صاحب کی شخصیت اور فن پر ایک سیمینار بھی منعقد کیا تھا۔ اس سیمینار کے مقالے پہلے انسٹی ٹیوٹ کے رسالے "غالب نامہ" میں اور پھر کتابی صورت میں شائع ہوئے تھے۔ اس سیمینار میں کوئی ایسا مقالہ نہیں پڑھا گیا، جس میں غالب پر قاضی صاحب کی جملہ تحریروں کا جائزہ لے کر ماہرِ غالب کی حیثیت سے ان کا تعین کیا جاتا۔ مقالہ نگاروں نے غالب پر قاضی صاحب کے کام کا بہت سرسری سا ذکر کیا ہے۔ رشید حسن خاں صاحب نے مختلف موضوعات پر قاضی صاحب کے مقالوں کا حوالہ دیتے ہوئے "جہانِ غالب" اور "غالب بحیثیت محقق" کا ذکر کیا ہے اور بس۔ نثار احمد فاروقی صاحب نے "جہانِ غالب" کا ذکر کرتے ہوئے صرف اتنا لکھا ہے کہ غالبیات میں اُن کا کارنامہ "جہانِ غالب" ہے، جو مختلف اوقات میں کسی ترتیبی رعایت کے بغیر لکھا گیا ہے۔ پروفیسر نذیر احمد نے دو تین سطروں میں "جہانِ غالب" کا اور پروفیسر نورالحسن انصاری مرحوم نے اتنی ہی سطروں میں "قاطع برہان" کا ذکر کیا ہے۔ اِس کتابچے کے کسی بھی مضمون سے یہ اندازہ

نہیں ہوتا کہ قاضی صاحب نے غالب پر ایسی بنیادی تحقیق کی تھی کہ انھیں ایک ممتاز ماہرِ غالب ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔

یہاں اس حقیقت کا ذکر بھی ضروری ہے کہ کرنل بشیر حسین زیدی مرحوم نے مالک رام صاحب کی ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر "مالک نامہ" نام سے ایک کتاب مرتب کی تھی، جس کے تقریباً تمام مضامین میں غالب پر مالک رام صاحب کی تحقیق کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں مندرجہ ذیل عنوانات پر جو مضامین شامل کیے گئے ہیں، اُن سے ثابت ہوتا ہے کہ مالک رام صاحب ماہرِ غالب تھے :

گفتارِ غالب ——————— ڈاکٹر گیان چند جین

غالبیات میں ادبیاتِ مالک رام ——————— کالی داس گپتا رضاؔ

سوانحی تحقیق اور مالک رام ——————— ایم۔ حبیب خاں

(اس مقالے میں مالک رام صاحب کی "ذکرِ غالب" اور "تلامذۂ غالب" کا تعارف کرایا گیا ہے)

غالب شناس مالک رام ——————— شیخ سلیم احمد

باقی مضامین میں بھی غالب پر مالک رام صاحب کی کتابوں اور مضامین کا ذکر کیا گیا ہے۔ میں نے "مالک نامہ" کا حوالہ اس لیے دیا ہے کہ غالب پر قاضی عبدالودود کے مضامین زیادہ محققانہ ہیں۔ اس کے باوجود ہمارے محققین قاضی صاحب کا شمار ماہرِ غالب میں نہیں کرتے۔

قاضی صاحب کی مشکل یہ تھی کہ انھوں نے کبھی کسی موضوع پر مربوط اور مستقل کام نہیں کیا۔ ترتیبِ متن کا کام کیا تو ایسے شعرا کے کلام یا دیوان مرتب کیے، جن کی اردو ادب میں کوئی زیادہ اہمیت نہیں تھی۔ مرحوم نے ولاؔ، رضاؔ عظیم آبادی اور جوششؔ کا کلام مرتب کیا۔ ان کا مرتب کیا ہوا "دیوانِ جوشش عظیم آبادی" ۱۹۲۱ء میں انجمن ترقی اردو (ہند) سے شائع ہوا تھا۔ اس دیوان کی فروخت کا یہ حال ہے کہ آج بھی انجمن کی بک ڈپو میں اس کے نسخے موجود ہیں۔ بقول ڈاکٹر عابد رضا بیدار :

"مرزا غالب، قاضی صاحب کے پسندیدہ شعرا میں سے تھے، بلکہ شاید یوں صحیح ہو کہ سب سے زیادہ پسندیدہ شاعر، کہتے تھے کہ ایک زمانے

میں نصف سے زیادہ دیوان حفظ تھا۔ آخر میں دس پندرہ غزلیں پوری پوری یاد تھیں۔"[1]

بیدارؔ صاحب نے غالبؔ پر قاضی صاحب کی تحقیق کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے :

"قاضی صاحب شاعر غالبؔ کو جتنا بڑا شاعر مانتے تھے محقق غالبؔ کو اتنا ہی چھوٹا جانتے تھے اور پھر بھی اس لاگ اور لگاؤ میں کچھ زیادہ فاصلہ نہیں تھا۔ اسی لیے تو قاضی صاحب نے اپنے پیچھے جو سرمایہ چھوڑا ہے اس کا ایک بڑا حصہ ایک چوتھائی کسی نہ کسی طرح غالبؔ سے کوئی تعلق ضرور رکھتا ہے۔ غالبؔ انھیں اتنا عزیز تھا کہ اس کے تعلق سے ہر وہ چیز جو غالبؔ کے مطالعے میں ذرا سی بھی مدد دے سکتی، وہ اسے اپنی یادداشت میں پرو لیتے اور پھر رفتہ رفتہ یہ اتنا بڑا سرمایہ ہوتا چلا گیا کہ اس سب کو انھوں نے 'جہانِ غالبؔ' کے عنوان سے مختلف رسالوں میں شائع کرایا۔"[2]

بیدارؔ صاحب کا یہ خیال درست معلوم ہوتا ہے کہ قاضی صاحب کی ایک چوتھائی تحریریں غالبؔ اور متعلقاتِ غالبؔ پر ہیں۔ "کچھ غالبؔ کے بارے میں" کی دونوں جلدوں میں قاضی صاحب کی غالبؔ پر چونسٹھ مختصر اور طویل تحریریں شامل ہیں۔

قاضی صاحب غالبؔ کی شاعری اور اُن کی مکتوب نگاری کے زبردست مدّاح تھے۔ وہ غالبؔ کو اردو کے عظیم شاعروں میں شمار کرتے تھے۔ غالبؔ کے صد سالہ جشن کے موقع پر بین الاقوامی سیمینار منعقد ہوا تھا۔ اس سیمینار میں انگریزی میں قاضی صاحب نے خطبۂ افتتاحیہ پڑھا اس میں غالبؔ کے بارے میں کہا :

"میں غالبؔ کو اردو کے عظیم شاعروں میں شمار کرتا ہوں۔ مکتوب نگاری کے فن میں اُن کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ طنز نگاری اور مزاح نگاری

---

[1] قاضی عبدالودود۔ "کچھ غالب کے بارے میں" حصّہ اوّل، ص ۴۔

[2] 〃 〃 〃 〃 پٹنہ ۱۹۹۵ء، ص ۳۔

یہ لوگ کا کوئی معتقد اُن کا ہم پلہ نہیں تھا۔ شاعر کی حیثیت سے اپنے معاصرین اور پیش رو شاعروں کے مقابلے میں اُن کا شعری افق زیادہ وسیع ہے۔ اُن کی شاعری میں فکر و جذبے کا خوشگوار امتزاج ہے۔ وہ ہمارے غم کو کم کرتے ہیں اور زندگی کی خوشیوں میں اضافہ کرتے ہیں۔ ہمیں دوسروں کے غم آلام میں شریک ہونے کی تعلیم دیتے ہیں۔ وہ کوئی باقاعدہ مفکر نہیں ہیں لیکن وہ اپنے معاصرین اور پیش رو شاعروں کے مقابلے میں ہماری فکر کو زیادہ متحرک کرتے ہیں۔ اور اُن کی شاعری ہماری بصارت و سماعت کو غیر معمولی لذتوں سے آشنا کرتی ہے۔" [1]

ڈاکٹر عابد رضا بیدارؔ نے قاضی صاحب کا ایک انٹرویو شائع کیا ہے، جس میں غالب سے اپنی دل چسپی کا ذکر کرتے ہوئے قاضی صاحب کہتے ہیں :

"تو ابھی تک اس بات کا پتہ نہیں چلا ہے۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ میں خود بھی غالبؔ کے کلام کو ایک مدت دراز سے پڑھتا آرہا ہوں۔ ایک زمانہ میں مجھے غالبؔ کا پورا دیوان، اپنے الفاظ کو مجھے واپس لینا چاہیے، پورا دیوان نہیں لیکن یہ کہ غزلیں، شاید ہی کوئی ایسا شعر ہو جو مجھے یاد نہ ہو۔ اور یہ کثرتِ مزاولت کی وجہ سے، یہ نہیں کہ میرا حافظہ بہت قوی ہے، کہ ایک مرتبہ پڑھا اور یاد رہ گئی بات۔ یہ بات نہیں تھی؛ بلکہ اتنی مرتبہ میں نے دیوانِ غالب پڑھا تھا کہ تقریباً شاید ہی کوئی شعر ہو جو مجھے یاد نہیں ہو، یعنی جہاں تک غزلوں کا تعلق ہے۔ اب حالاں کہ، زمانہ گزرنے کے ساتھ اور بھی دیکھتا رہتا ہوں۔ مگر اتنا حافظہ قوی نہیں رہا، عمر کی وجہ سے۔ بہر صورت تو مطلب یہ ہے کہ آخر کوئی اسکالر کی حیثیت سے نہیں پڑھتا تھا میں جو اس زمانے میں غالبؔ کے کلام کا اس قدر کثرت کے ساتھ مطالعہ کیا کرتا تھا، تو ایک اسکالر کے نقطۂ نظر

---

[1] قاضی عبدالودود: "کچھ غالب کے بارے میں" حصہ ۲، پٹنہ ۱۹۹۵ء، کتاب کے آخری دو صفحے۔

سے نہیں۔ نہ میری یہ غرض تھی کہ اس کی خوبیاں لوگوں کو ظاہر کروں یا بتاؤں۔ یہ نہیں۔ بلکہ، یہ کوئی چیز تھی اس کی جو مجھے اپیل کرتی تھی۔ اور دوسرے شعراء میں وہ بات نہیں تھی ؛ اردو کے دوسرے شعراء میں نہیں تھی۔ اور اگر تھی تو کمتر درجے میں تھی۔ یا یہ کہیے کہ اس زمانے تک ان لوگوں کے کلام تک میری رسائی نہیں ہوئی تھی۔ یہ سب POSSIBILITIES ہیں۔ بہر صورت اگر میں نہ سمجھتا خود، غالب کو، ایک بڑا شاعر، تو اپنا اتنا وقت اس پہ صرف نہیں کرتا۔

اس کے بعد جب مجھے کچھ ریسرچ کا شوق ہوا، تو میں نے غالب کا ایک ایک لفظ پڑھا۔ یعنی وہ چیزیں چھوڑ دیجیے جو کہیں چھپی نہیں ہیں۔ اور کسی خاص شخص کے قبضہ میں ہیں اور میری رسائی اب تک نہیں ہوئی ہے۔ اُسے اگر آپ چھوڑ دیجیے تو کوئی چیز ایسی نہیں ہے، غالب کی، جسے بار بار میں نے نہیں پڑھا۔ اور بہت سے معاملات تھے جن سے متعلق اپنی رائے تبدیل کرنی پڑی۔ ایک وہی شخصیت کا معاملہ تھا غالب کا، جس کے متعلق مجھے بہت کچھ اپنی رائے تبدیل کرنی پڑی۔"[1]

قاضی صاحب نے غالب کا مطالعہ کرنے کے لیے فارسی ادب پڑھا اور کسی قدر پہلوی زبان بھی سیکھی۔ قاضی صاحب لکھتے ہیں :

"بعد کو غالب سے متعلق تحقیقات مد نظر ہوئی تو میں نے فارسی ادب کا مطالعہ کیا اور کسی قدر پہلوی بھی سیکھی .... اب پہلوی رسم الخط بھی بھول گیا۔"[2]

اسی سوانح عمری میں قاضی صاحب نے ایک اور جگہ پر لکھا ہے :

---

[1] "کچھ غالب کے بارے میں" حصہ ۱، ص ۹۸/۲ ۔

[2] معاصر، قاضی عبدالودود نمبر، ۱۹۷۶ء، ص ۷ ۔

"وہ جب غالب کے متعلق تحقیقات کا شوق ہوا تو فارسی کی طرف توجہ ہوئی اور میں نے فارسی زبان وادب کا باقاعدہ مطالعہ کیا۔"[1]

اس طرح تمام ہتھیاروں سے لیس ہو کر قاضی صاحب مطالعۂ غالب کے میدان میں اترے۔ قاضی صاحب کی زندگی میں غالب پر اُن کی دو کتابیں "مآثر غالب" اور دوسری "قاطع برہان و رسائل متعلقہ" شائع ہوئی تھیں۔ "قاطع برہان و رسائل متعلقہ" میں قاضی صاحب نے غالب کی تصنیف "قاطع برہان" اور اس سے متعلق رسائل کا متن پیش کیا ہے۔ غالب سے متعلق ان کے مضامین مختلف رسالوں میں بکھرے ہوئے تھے۔ ہم شکر گزار ہیں خدا بخش لائبریری کے ڈائرکٹر ڈاکٹر عابد رضا بیدار کے، جنھوں نے قاضی صاحب کی تقریباً تمام تحریریں کتابی صورت میں شائع کردی ہیں۔ یہ کتابیں یہ ہیں:

(۱) غالب بحیثیت محقق

(۲) مآثر غالب (نیا اڈیشن جسے ڈاکٹر حنیف نقوی نے مرتب کیا ہے)

(۳) جہانِ غالب

(۴) کچھ غالب کے بارے میں (جلد اوّل)

(۵) کچھ غالب کے بارے میں (جلد دوم)

قاضی صاحب نے جتنے بھی تحقیقی و تنقیدی مضامین لکھے ہیں اُن میں بڑا حصہ غالب کی شخصیت اور فن سے متعلق ہے۔

اب میں غالب پر قاضی عبدالودود کے کتابوں و مضامین کا مختصر سا تعارف کراتا ہوں۔ قاضی صاحب کا "غالب بحیثیت محقق" کے عنوان سے ایک طویل مقالہ لکھا تھا جو علی گڑھ میگزین میں شائع ہوا تھا۔ قاضی صاحب نے اس مقالے میں غالب کی "برہانِ قاطع" کا تنقیدی و تحقیقی جائزہ لیا ہے اور فارسی الفاظ کے سلسلے میں غالب کی غلطیوں کی نشاندہی کی ہے۔ ایسا محققانہ مقالہ صرف وہی شخص لکھ سکتا ہے جو قدیم فارسی فرہنگوں، قدیم فارسی ادب

---

[1] معاصر، قاضی عبدالودود نمبر، ص ۲۰۔

ایران کی تاریخ، ایران کے مختلف مذاہب اور وہاں کی تہذیب اور تمدن پر گہری نظر رکھتا ہو۔ قاضی صاحب کا یہ طویل مقالہ غالب کے "قاطع برہان" پر اردو اور فارسی میں اس انداز کی پہلی محققانہ اور عالمانہ تحریر تھی۔ بعد میں پروفیسر نذیر احمد نے "قاطع برہان" کا تنقیدی جائزہ لیا، جو "نقد قاطع برہان" کے نام سے کتابی صورت میں ۱۹۸۵ء میں غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی سے شائع ہوا۔ چوں کہ پروفیسر نذیر احمد کی کتاب اس موضوع پر قاضی صاحب کی تحریر کے بعد شائع ہوئی ہے، اس لیے زیادہ وقیع اور جامع ہے۔

پروفیسر مختار الدین احمد نے جب غالب پر مختلف مضامین کا مجموعہ "نقد غالب" کے نام سے مرتب کیا تو اس میں قاضی صاحب کا یہ مضمون بھی شامل کر لیا۔ مضامین کا یہ مجموعہ انجمن ترقی اردو (ہند) نے ۱۹۵۲ء میں چھاپا تھا۔ اس مجموعے میں شامل اپنے مقالے پر قاضی صاحب نے نظر ثانی کی تھی۔

جہانِ غالب

قاضی عبدالودود کی اس کتاب کے مرتب ڈاکٹر عابد رضا بیدار ہیں۔ انھوں نے بڑی محنت اور جستجو کے ساتھ وہ تمام تحریریں یکجا کی ہیں، جنھیں قاضی صاحب نے "جہانِ غالب" کے عنوان سے مختلف رسالوں میں شائع کرایا تھا۔ یہ بیدار صاحب کی انکساری ہے کہ انھوں نے کتاب پر مرتب کی حیثیت سے اپنا نام نہیں دیا۔ انھوں نے پیش لفظ کے طور پر کتاب کے شروع میں "حرفِ چند" کے نام سے جو کچھ لکھا ہے، اُس کے آخر میں اپنا نام "ع۔ ر۔ ب" لکھا ہے۔ "جہانِ غالب" کے عنوان سے قاضی صاحب نے جو مختصر اور طویل تحریریں لکھی ہیں، اُردو میں قاضی صاحب سے قبل ان کی اور کوئی مثال نہیں ملتی۔

قاضی صاحب کو لکھنے سے زیادہ پڑھنے کا شوق تھا۔ اور کسی مستقل موضوع پر کتاب لکھنا اُن کے مزاج کے خلاف تھا۔ انھوں نے "دلدار"، رضا عظیم آبادی اور جوشش کے کلام کو مرتب کیا۔ لیکن کسی ایک موضوع پر مستقل کتاب نہیں لکھی۔ حالاں کہ اپنے مطالعے اور غیر معمولی حافظے کی بنیاد پر انھوں نے ایسے مقالے لکھے تھے اور ایسی تحریریں قلم بند کی تھیں، جو بیشتر

کئی برس پر حاوی ہیں۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا کہ مستقل موضوع پر کتاب لکھنا قاضی صاحب کے مزاج کے خلاف تھا۔ اس لیے انھوں نے مقالوں اور چھوٹی تحریروں پر اکتفا کیا۔ غالب سے متعلق قاضی صاحب کی تحریریں طویل مضامین پر بھی مشتمل ہیں اور ایک ڈیڑھ سطر کی بھی ——— "جہانِ غالب" کے عنوان کے تحت لکھی گئیں تمام تحریریں غالبیات کا اہم ترین حصہ ہیں۔ ۱۹۵۱ء میں قاضی صاحب نے "جہانِ غالب" کے نام سے مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا جو مختلف رسالوں میں شائع ہوتے رہے۔ یہ سلسلہ ۱۹۷۳ء تک جاری رہا۔ بقول عابد رضا بیدار:

"آخر کے پندرہ بیس برس میں تو یہ ہو گیا تھا کہ لکھتے تھے اور پھینک دیتے تھے۔ کبھی کسی کی فرمائش آئی تو اس رسالے کو بھیج دیتے تھے اور بھیجنے کے بعد بھول جاتے تھے کہ کن کن مباحث پر لکھا جا چکا ہے۔"

(جہانِ غالب ص ۳ اور ۴)

"جہانِ غالب" کی حیثیت کچھ اس طرح کی ہے جیسے کوئی انتہائی ذمہ دار محقق کسی موضوع پر کتاب لکھنے کے لیے نوٹس اکٹھا کرے یا جیسے کوئی محقق کسی کتاب کے حواشی لکھے۔ قاضی صاحب کی یہ تحریریں جن مختلف رسائل میں شائع ہوئی تھیں اُن کی فہرست بیدار صاحب نے "مآخذ" کے عنوان سے "جہانِ غالب" میں دے دی ہے۔

ادب میں قاضی صاحب جتنے سخت گیر تھے، عام زندگی میں اتنے ہی نرم، مہذب اور با اخلاق تھے۔ اگر کوئی اڈیٹر اپنے رسالے کے لیے قاضی صاحب سے مضمون کی درخواست کرتا تو رسالہ کا معیار دیکھے بغیر اپنا مضمون بھیج دیتے۔ اس لیے جن رسالوں میں یہ تحریریں شائع ہوئی ہیں ان میں ایک دو کو چھوڑ کر باقی رسالوں کے فائل ہندوستان کی ایک دو لائبریریوں کے علاوہ کہیں نہیں ملتے اور بعض رسالے تو ایسے ہیں جن کے فائل شاید ہی ہندوستان کی لائبریری میں موجود ہوں مثلاً "خاور" (ڈھاکہ)، "اشارہ" (پٹنہ)۔

"جہانِ غالب" میں غالب نے ان افراد کے بارے میں لکھا ہے جن کا غالب نے اپنے فارسی، اردو خطوط اور دوسری تحریروں میں ذکر کیا ہے یا جن کا غالب سے شاگرد، دوست،

رشتہ دار، سرپرست وغیرہ کی حیثیت سے تعلق تھا۔ قاضی صاحب نے غالب کی اپنی، ان سے متعلق تعلیقات اور ان تعلیقات اور لغات کے متعلق بھی لکھا جن کا ذکر غالب کی تحریروں میں آیا ہے اس لیے "جہانِ غالب" کی تمام تحریریں غالب پر کام کرنے والوں کے لیے نعمتِ عظمیٰ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

کچھ غالب کے بارے میں (دو جلدوں میں)

قاضی صاحب کی ایسی تحریریں خاصی تعداد میں ہیں جو غالب پر ہیں اور "جہانِ غالب" کے عنوان کے تحت نہیں لکھی گئیں۔ ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے اِن تمام تحریروں کو بھی دو جلدوں میں مرتب کرکے شائع کر دیا ہے۔ ان تحریروں کی تعداد چونسٹھ ہے۔ اِن میں بھی ایسے مضامین ہیں جو غالب کی مطبوعات اور غالب سے متعلق افراد اور واقعات پر لکھے گئے ہیں۔ اِن میں "برہانِ قاطع" اور اس سے متعلق رسائل پر بھی تبصرے ہیں۔ ان کے علاوہ خطوطِ غالب (مرتبہ مہیش پرشاد۔ دو قسطوں میں)، نادراتِ غالب (مرتبہ آفاق حسین آفاق)، نادر خطوطِ غالب (مرتبہ رسا ہمدانی)، مکاتیبِ غالب (مرتبہ مولانا امتیاز علی خاں عرشی۔ تین قسطوں میں)، ذکرِ غالب (مرتبہ مالک رام)، احوالِ غالب (مرتبہ مختار الدین احمد)، مطالعۂ غالب (مرتبہ جعفر علی خاں اثر)، سرگذشتِ غالب (مرتبہ سید محی الدین قادری زورؔ) پر تبصرے شامل ہیں۔ یہ تمام تبصرے بھی اردو تحقیق کی اعلاترین مثال ہیں۔ اِن میں قاضی صاحب نے ایسی معلومات فراہم کی ہیں، جو غالب پر کام کرنے والوں کے لیے بہت مفید ہیں۔

مآثرِ غالب

۱۹۳۹ء میں ڈاکٹر مختار الدین احمد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طالب علم تھے اور یونیورسٹی سے شائع ہونے والے رسالے "علی گڑھ میگزین" کے اڈیٹر تھے۔ انھوں نے اس میگزین کا غالب نمبر شائع کرنے کا پروگرام بنایا تو قاضی صاحب سے بھی مقالے کی فرمائش کی۔ قاضی صاحب نے غالب کی متفرق اردو فارسی کی نادر و نایاب تحریریں (نظم و نثر) مرتب کرکے بھیج دیں، جو اس رسالے

میں "آثارِ غالب" کے عنوان سے شائع ہوئیں۔ یہ تحریریں ضمیمے کے طور پر شائع ہوئیں۔ انہی دنوں میں شیخ محمد اکرام کی کتاب اسی نام سے شائع ہوئی۔ قاضی صاحب کی خواہش پر بقول پروفیسر مختار الدین احمد اس ضمیمے کے سو دو سو نسخے الگ چھپوائے گئے تھے۔ میگزین میں شامل ضمیمے کے سرورق پر اس مجموعے کا نام "آثارِ غالب" چھاپا گیا تھا۔ لیکن بعد میں جو آف پرنٹس اٹھوائے گئے تو اس کے ٹائیٹل پر "مآثرِ غالب" چھاپا گیا۔ اس کتاب میں غالب کی تحریروں پر قاضی صاحب نے بہت اہم حواشی لکھے ہیں اور بقول ڈاکٹر مختار الدین احمد :

> "غالب کی تحریراتِ نظم و نثر کے ہر حصے کے متعلق ایسے بیش قیمت معلومات انھوں نے پیش کیے ہیں کہ تقریباً نصف صدی گزرنے کے بعد بھی ان پر اضافہ مشکل نظر آتا ہے"۔ [۱]

اس کتاب کے پہلے حصے میں لطائفِ غیبی اور تیغِ تیز کے دیباچے، ایک استفتا، میر دلی کے نام ایک خط، دو فارسی شعروں کے مطالب' جو غالب نے خود لکھے تھے، "اسعد الاخبار" آگرے کے ۱۴ مارچ ۱۸۴۹ء کے شمارے میں پنج آہنگ کا وہ اردو منظوم اشتہار جو خود غالب کی تصنیف ہے، غالب کی ایک غیر معروف اردو غزل، بہجو سعادت علی (دو اشعار)، فردیات اردو (دو اشعار) دیے گئے ہیں۔ دوسرے حصے میں غالب کے بتیس فارسی خطوط شامل ہیں۔ ان میں تین خطوط خواجہ محمد حسن کے نام، ایک ایک مولوی سراج الدین احمد اور خواجہ فخر اللہ کے نام اور چھبیس خطوط مرزا احمد بیگ تپاں کے نام ہیں۔ ان بتیس خطوط میں چار خطوط پروفیسر مسعود حسین رضوی مرحوم کی کتاب میں کچھ متنی اختلافات کے ساتھ شامل ہیں۔ باقی اٹھائیس خطوط پہلی بار قاضی صاحب نے مرتب کر کے شائع کیے ہیں۔ ڈھاکے میں ایک مشہور حکیم اور مصنف تھے حکیم حبیب الرحمٰن خاں، ان کے ذاتی کتب خانے میں ایک بیاض تھی جس میں یہ خطوط نقل کیے گئے تھے۔ قاضی صاحب نے یہ خطوط اسی بیاض سے حاصل کیے تھے۔

"مآثرِ غالب" کے یہ آف پرنٹس پہلے ایک کتابچے کی صورت میں ۱۹۴۹ء میں شائع ہوا تھا

---

[۱] قاضی عبدالودود۔ مآثرِ غالب، پٹنہ، ۱۹۹۵ء، ص ۸۳۔

اور ڈاکٹر بیدار نے ڈاکٹر حنیف نقوی سے اس کو مرتب کرا کے خدا بخش لائبریری پٹنہ سے دوسرا اڈیشن شائع کیا۔

میں آخر میں ڈاکٹر عابد رضا بیدار کا شکریہ ادا کرتا ہوں، جنھوں نے غالب پر قاضی صاحب کی تقریباً تمام تحریروں کو یکجا کرکے شائع کردیا ہے۔ تقریباً کا لفظ میں نے اس لیے استعمال کیا ہے کہ اب بھی قاضی صاحب کی کچھ تحریریں ایسی ہوں گی، جن تک بیدار صاحب کی رسائی نہیں ہوسکی ہوگی۔ بیدار صاحب کی وجہ سے اردو اور فارسی ادب میں ماہرِ غالب کی حیثیت سے قاضی صاحب کے مرتبے کا تعین ہوگیا ہے۔

میرے علم میں نہیں ہے کہ کسی نے کوئی ایسا مقالہ لکھا ہو، جس میں غالب پر قاضی صاحب کی تحقیق کا جائزہ لیا گیا ہو۔ ۱۹۸۳ء میں جب قاضی صاحب کو غالب انسٹی ٹیوٹ نے طلائی تمغہ دیا تھا، تو اس موقع پر ایک کتابچہ بھی شائع کیا گیا تھا، جس کا اوپر ذکر کیا جاچکا ہے۔ اس کتابچے کی پہلی تحریر سپاس نامہ ہے۔ جو تمغے کے ساتھ قاضی صاحب کو پیش کیا گیا۔ سپاس نامہ انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے ہے۔ اس لیے اس کے مصنف کا نام نہیں دیا گیا۔ مگر یہ تحریر جیسی عالمانہ انداز میں لکھی گئی ہے اور جس طرح اس میں قاضی صاحب کی تمام ادبی فتوحات کا اعتراف کیا گیا ہے، اُس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا مصنف کوئی ایسا عالم ہے، جس نے خود غالب پر اعلا درجے کا کام کیا ہے۔ اس لیے میرا خیال ہے کہ یہ مصنف صرف پروفیسر نذیر احمد ہی ہوسکتے ہیں اُنھوں نے غالب پر قاضی صاحب کی تحقیق کو ان الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے:

> ۰ اردو اور فارسی کے ممتاز ترین شاعر و ادیب غالب دہلوی کے مطالعے میں قاضی صاحب نے تخصص کا درجہ حاصل کرلیا ہے۔ یوں تو غالب اور متعلقاتِ غالب کے سلسلے میں جملہ تحریروں کی ایک ایک سطر اُن کے مطالعے میں آئی ہے، لیکن غالب کی فرہنگ نگاری پر نقد و تبصرہ ان کا محبوب مشغلہ رہا ہے اور اسی پر انھوں نے اپنی عمر کے کئی سال صرف کیے ہیں۔ اس سلسلے میں قدیم ایران کی تاریخ، مذہب، تہذیب، زبانیں اور فارسی فرہنگیں ان کی مرکزِ توجہ قرار پائیں اور ان امور میں انھوں نے جو گہری بصیرت حاصل

کی اس کا اعتراف فُضلائے ایران نے بڑی فراخ دلی سے کیا ہے۔ اس لحاظ سے ہندوستان میں کوئی دانش ور اُن کے پایے کا نہیں اور ایران میں بھی بہت کم ان کے مرتبے کو پہنچ سکیں گے .... غالب کے تعلق سے اُن کے تین کارنامے قابلِ ذکر ہیں، اول "نقدِ غالب" میں شامل اُن کا وہ مضمون جو ایک مستقل کتاب ہے، دوسرا "جہانِ غالب" کے عنوان سے اُن کے مسلسل مضامین، تیسرے "قاطع برہان" کی تصحیح۔ اس ضمن میں یہ بات خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے کہ غالب کے بارے میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اور جس نہج سے لکھا ہے، وہ اتنا وقیع ہے کہ غالب کے زمانے سے آج تک کوئی بھی اس طرح سوچ نہیں سکا ہے، اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ اُن کی شائع شدہ تحریریں خواہ کتاب کی شکل میں ہوں یا مضامین کی شکل میں، ان کی علمی مرتبے کا پوری طرح احاطہ نہیں کر سکتیں اس لیے کہ جو کچھ شائع ہو چکا ہے وہ ان کی منتشر یادداشتوں کا محض ایک حصہ ہے اور جو اُن کے سینے میں مدفون ہے، اُس کا تو ذکر ہی کیا۔" [1]

---

[1] پروفیسر نذیر احمد (مرتب)، قاضی عبدالودود، تحقیقی و تنقیدی جائزے، نئی دہلی، ۱۹۹۱ء، ص ۲۵۲-۲۵۳

شعیب اعظمی

"فارسی بین تا ببینی نقشہائے رنگ رنگ"

خوبہ بیداد کردہ ام غالب — عید نوفیروان نیخواہم
باصلیم فتادہ کار بدہر — علم کادیان نیخواہم
باز نگوئی کہ باچنیں خواری — ترک ہندوستان نیخواہم
ہاں نمانی کہ در نظر گر خویش — زمزم و ناودان نیخواہم
ہاں نمانی کہ صدر یثرب را — سجدہ بر آستان نیخواہم
پائی فرسود در رکاب ہنوز — دست خود بر عنان نیخواہم
سخن از عالمی دگر دارم — ہمدم و رازدان نیخواہم
گر بود خود سروشی وحی سرائی — باخودش ہمزبان نیخواہم

سینہ صافم قلندرم مستم
راز خود را نہان نیخواہم

غالب کے قصاید میں آخری قصیدہ نمبر۳۴ سے مندرجہ بالا متفرق ابیات ان کے احساسات شدت جذبات اور ایک اعلیٰ ہنرور کی درونی اور ذہنی کیفیت کا بہترین عطیہ ہیں۔ یہ اس شخص کا خیال ہے جس کے بارہ میں بروایت حالی ضیاء الدین خاں نے کہا تھا۔

"ہندوستان میں فارسی شاعری کی ابتدا ایک ترک لاچین یعنی امیر خسرو سے ہوئی اور ایک ترک ایبک یعنی مرزا غالب پر اس کا خاتمہ ہوگیا۔"[1]

اور یہ وہی غالب تو تھے جنھوں نے خسرو اور اپنے زمانے کے بیشتر نامور شعرا، عرفی شیرازی، ظہوری ترشیزی، طالب آملی، نظیری نیشاپوری، صائب تبریزی اور شیخ علی حزین کی تمام تر شاعرانہ صفات سے متصف ہو کر فخریہ طور پر کہا تھا۔

اکنوں بہ یمن فرہ پروری آموختگی این گروہ فرشتہ شکوہ کلک رقاص من نغزامش تذروست و بنامش موسیقار۔ بجلوہ طاؤس است، و بپرواز عنقا، آنچہ در ملک اوراق از قطعہ و مثنوی و قصیدہ و غزل و رباعی فراہم آمدہ ہمگی دہ ہزار و چہار صد و بست و چہار بیت است، کہ ہر یک از روئے شوخی تا فیر و خوبی تقریر، پیرایہ گلوئی بسمل و آویزہ گوش دل تواند بود یارب این متاع صحرا نہادہ و این گنجینہ در کشادہ را از دستبرد دستی دزدان و ترکتاز غلط نگاران در امان، و گہرہائی آبدار این ذخیرہ را بدان روش متانہ برزبانہا روان داری، کہ ہر چہ در عرض پیمائش ابریشم بیان، از فرط صفا بہ لغزد و تا لغزد ول فرو نرود از غلطانی باز نہ ایستد۔ رباعی:

گر ذوق سخن بدہر آئین بودی — دیوان مرا شہرت پروین بودی
غالب اگر این فن سخن دین بودی — آن دین را ایزدی کتاب این بودی

پہلے دستبرد زمانہ اور دندان ترکتاز سے ان گہرہائے آبدار کو خدا کی امان میں رکھنے کی آرزو ان کی صفا و درخشندگی کہ شانہ وار لوگوں کی زبانوں اور دماغوں میں رواں اور اتر جانے کی دعا کے بعد شاعرانہ ذوق کو دنیا کا دستور قرار دے کر اپنے دیوان کو پروین کی شہرت بخش کر اور سخنوری کو مذہب کا مقام دے کر اپنے مجموعہ کلام کو صحیفۂ آسمانی کا درجہ دینے کا اعلان کرتا کیا صرف شاعرانہ عادت، مبالغہ تھا یا واقعی حقیقت سے قریب تھا۔

غالب کو پڑھئے تو ان کے بیان میں صداقت اور دردمندی کا دریا موجزن ملے گا۔ بحیثیت عظیم شاعر اصناف سخن میں ان کی مہارت، انفرادیت بیان، جولانی طبع، فکر کی گہرائی، طبع رسا، وسعت نظر، کشادگی قلب، بے نیازی اور وسیع المشربی، کفر و ایمان کی مشترک حدیں، توحید اور وحدانیت سے

حقائق اور حقیقت کے ہزار جلوے ان کے قطعات، مثنویات، قصاید، غزلیات اور رباعیات میں پنہاں نظر آئیں گے۔ ان کی مثنویاں ذہن و دیدہ کے بستر پر بچے واکر دیتی ہیں۔ وجد و کیف کے عالم میں سرخوشی اور نشاط کے گہوارے میں ایسے عالموں کی سیر کراتی ہیں جو شاذ و نادر میسر آتے ہیں۔ قصاید میں کلام کی بلاغت، الفاظ کی فصاحت، تراکیب کی جدت اور صناعات کی لذت بصارت اور سماعت کو دلکشا آہنگ اور لحن خیریں بخشتے ہیں اور غزلیات کی ترنم ریزی نغمات کی دلآویزی، موضوع کی رنگارنگی اور جذبات کی طرفگی کے ساتھ اس کی اثر پذیری غالب کے دل سے نکل کر بقول غالب :

ہاد ندم ز شیرینیٔ سخن غالب
بلسان موم زاجزائی انگبین پیداست

شہد اور شیر کے اس آمیزہ میں ان کی ظرافت اور خاموش متانت سے جو پر کیف موسیقی اور ملاحت آمیز تکلم و ترنم برآمد ہوتا ہے وہ ہر اس دل میں اترجاتا ہے جو بالغ، عاقل، بذلہ سنج اور معقولیت پسند بلکہ نیک، سنجیدہ معصوم اور بے ضرر ہوتا ہے۔ اور اسے ہم خواص و عوام کا نام دیدیتے ہیں۔

رباعیاں جو پند و نصائح اور اخلاقیات کے لیے مختص ہوتی ہیں۔ اس میدان میں بھی غالب، جدت، ندرت اور ظرافت کے پیرایہ میں وہ سب کچھ کہنا چاہتے ہیں جو ان کے دل کو گدگدا رہا ہو۔ مثلاً سماج میں غیرضروری رسوم و روایات ایک چیستاں بن کر اٹھ کھڑی ہوتی ہیں کہ ان کے بغیر دلکش ادب کا تصور ممکن نہیں۔

ان کا بیان دلکش اور خوبصورت دنیا کے لیے اس کیفیت کا لطیف انداز بے ساختہ ورود کے لائق ہے۔ جس میں انھوں نے اس کیف کے عالم میں سوال و جواب کی خوب صورت صنعت کی رعایت برتی ہے اور وجود کفر، طریقت، نمود اشیا، مخالفت و مداہنت اور جاہ و منصب کی وجاہت کے بعد اپنے سفر کلکتہ قیام گاہ، شہروں کی ناقدری، شعر و شاعری کی بے حیثیتی اور مغربی حسیناؤں کی آہن دل کے ذکر کے ساتھ اپنا مذاق اڑایا ہے۔

گفتمش چیست منشاء سفرم؟ — گفت مہر و جفائی اہل وطن
گفتم اکنوں بگو کہ دلی چیست؟ — گفت جانست وایں جہانش تن
گفتمش چیست ایں بنارس گفت! — شاہدیست کہ گل چیدن
گفتمش چوں بود عظیم آباد! — گفت رنگین تر از فضائی چمن
حال کلکتہ باز جستم گفت! — باید اقلیم ہفتمش گفتن
گفتم آدم بہم رسند ز دوی! — گفت از ہر دیار و از ہر فن
گفتم اینجا چہ فضل سود دہد! — گفت از ہر کہ بست ترسیدن
گفتم ایں جا چہ کار باید کرد! — گفت قطع نظر ز شعر و سخن
گفتم ایں ماہ پیکراں چہ کس اند؟ — گفت خوباں کشور لندن
گفتم اینان مگر دلی دارند؟ — گفت دارند لیک از آہن
گفتم اکنوں مراچہ زیبد گفت — آستیں بر دو عالم افشاندن
گفتمش باز کو طریق نجات — گفت غالب بکربلا رفتن

ترکیب بند کا نمونہ ملاحظہ کرنا ہو تو غالب کی بادشاہ وقت سے عقیدت اور اس کے خردسال شاہزادہ کی بے وقت وفات اور رنج واندوہ کا بے پایاں اظہار خاقانی (م ۵۹۵ھ) کے خود اپنے بیٹے کی ناگہانی اور نا وقت موت پر کہے گئے مرثیہ کی ردیف میں دیکھا جا سکتا ہے۔

ای نور دو عالم بالا چگونۂ — ما بی تو در ہمیم تو بی ما چگونۂ
از سایہ در غم تو سبز پوش شد ہما — ای خفتہ در نشیمن عنقا چگونۂ
زاں پس کہ باتو آب ہوائی جہاں بساخت — در روضہ جناں بتماشا چگونۂ
با گمرہان دہر وفائی نداشتی — با حوریان آئینہ سیما چگونۂ
ما بی تو داں بحلقہ ماتم نشستہ ایم — از خویشتن بگوئی کہ تنہا چگونۂ
ای مطرب و ندیم و غلامان خوردسال — بی باغ و قلعہ و لب دریا چگونۂ
بعد از تو شاہ قلیل ترا برقرار داشت — اینجا عزیز بودۂ آنجا چگونۂ
ای بعد مرگ راتبہ خوار تو عالمی — پروانہ چراغ مزار تو عالمی

اس قدر سادہ اور موثر انداز میں مرحوم کی، رقاقت اور رسائی، عالم بالا میں اس کا مرتبہ ومقام اور پھر یہاں اس کے غم میں ایک عالم کا سوگوار ہونا مثالب کے پرکار قلم کی سحر انگیزی نہیں تو اور کیا ہے

اسی طرح مخمس میں جو، بندوں کا ہے اپنی شاعرانہ صلاحیت کے ساتھ جس میں آسمان وزمین شمس وقمر اور کواکب کو بہادر شاہ ظفر کی ثناخوانیت اور نوکری کا جھنڈا دیا ہے، وہ خود اپنی استادی اور قلمکارانہ مہارت کو فراموش نہیں کرسکے ہیں،

نطق من آئینہ زدایدہمی — تاچہ دگر روئی نمایدہمی
مائدہ آرائی معانی سخن — از تنعیم زار بایدہمی
ناطقہ آن لیلیٔ شیریں ادا — سوی من از مہر گرایدہمی
نازکشی برگہر من رواست — بر سخنم ناز نشایدہمی
تازشکوہ کہ سخن میرود — چرخ بر ہ ناصیہ سایدہمی
دل ز زباں آمدہ منت پذیر — تا بزبان نام کر آیدہمی
ہست ز دستوری دل گرزباں — مدح شہنشاہ سرآیدہمی

تکیہ گہ دولت ودین .بو ظفر

خضر رہ علم ویقین .بو ظفر

سرو بینش، دود دماغ، چراغ دیر، رنگ وبو اور برگ وبار میں غالب اس فضائی رنگ وبو، جہاں بازیگری، اصامی وودی بیکل جن وپری، فرشتہ سیرتی، مردم فریبی اور کلبۂ احزان آدم صفتی کا ایک ایک پردہ اٹھاتے جاتے ہیں اور "ہر ورقی دفتریست معرفت کردگار" کے صفحہ ہائے رنگارنگ میں اپنی بے بسی، بے چینی اور ہیچی اور بے مائگی کا اعتراف کرتے ہیں؛

غالب افسردہ دل وجاں بیا — ای سرو پا در صف رنداں بیا
بے خبراں را خبری بازدہ — زاں می دیرین قدحی باندہ
آں اثرہ پردہ ساز عجم شد — نغمہ ز خارا گداخت چہ شد
آں ز جنوں پردہ کشائیت کو — ولولۂ سلسلہ خائیت کو

اس لائق نہ تھے کہ وہاں حاضر ہوں اور ایک شخص ان پر معترض بھی ہوتا ہے مگر بادشاہ ان کی مجبوری اور پریشانی کا سبب خود کو قرار دیتا ہے۔ اور غالب رند قدح خوار، معترض، خاکِ نشیں جسا ان نہ اکو بیانیہ بتاکر، روزِ قیامت کا ذکر چھیڑ کر صاحب استطاعت گروہ کے ساتھ بینواؤں اور مستی بھروالے گروہ میں خود داخل ہو کر زبان کھولتے ہیں۔ اپنی نارسائی، ناکردہ گناہی اور چاروں نامکمل خواہشات کی حیثیت گناہ کا لبادہ اوڑھ کر جو کچھ کہتے ہیں۔ کس قدر موثر پر معنی دلنشیں اور جاہ و جلال کے ساتھ جمال و تمکنت کا آئینہ دار ہے۔ سوال و جواب، پرسش اور سزا سے خوف کے باوجود خدا کے ذوالجلال جو سب کچھ جانتا ہے دیکھتا ہے زبان اور طاقت گفتار اسی کی دین ہے تو پھر غالب کو یہ کیوں نہ کہنا پڑے:

همانا تو دانی که کافر نیم — پرستار خورشید و آذر نیم
من اندوهگین و می اندہ ربائی — چہ می کردم ای بندہ پرور خدائی
حساب می و رامش و رنگ و بوئی — ز جمشید و بہرام و پرویز جوئی
نہ از من کہ از تاب می گاہ گاہ — بدریوزہ رخ کردہ باشم سیاہ
نہ بستان سرائی نہ میخانہ — نہ دستان سرائی نہ جانانہ
نہ رقص پری پیکران بر بساط — نہ خوشنائی رامش گران در رباط
تمنائی معشوق و بادہ نوش — تقاضائی بیہودہ میفروش
بہاران و من در غم برگ و ساز — در خانہ از بینوائی فراز
جہان از گل و لالہ پر بو و رنگ — من و حجرہ و دامنی زیر سنگ
دم عیش جز رقص بسمل نبود — باندازہ خواہش دل نبود
چہ خواہی ز دلق می آلود من — ببین جسم خمیازہ فرسود من
سر از منت ناکسان زیر خاک — لب از خاکبوس خسان چاک چاک
بجان عمر ناخوش کہ من داشتم — ز جان خار در پیراہن داشتم

غالب اس دنیا کے وسیع و عریض کرہ پر ایک ایستادہ فریادی بن کر اپنی نامرادیوں، حسرتوں اور محرومیوں کا جو شکوہ کر رہے ہیں وہ فقط ان کی آواز نہیں، بیشمار فنکاروں کی

دل آرزو ہے۔ وہ یہاں اس حد تک پریشان دل برداشتہ ہو چکے ہیں کہ وعدہ کی فردوس فردا کی نعمتوں تنعم اور تعیش کی تمام چیزوں کو بے حیثیت کر دیتے ہیں۔ یہاں کی تب و تاب، لذت گناہ، گستاخ نظر بازی اور دھول دھپا، ابر بہاری کی جلوہ نمائیاں اور دختِ رز کی مستی و پرکیفی اور یہاں کے پری زادوں کے مقابلہ میں وہاں کا ہر جلوہ بے رنگ ہر فصل پاکیزہ ہر نظر پھیکی اور ہوش و خرد میں حوران بہشتی اور غلمان جنت کی معصومیت کس کام کی۔ جنت وہ آسودہ نہیں رہ سکیں گے۔

چون آن نامرادی بیاد آیدم — بفردوس ہم دل نیاسایدم
در آن پاک میخانہ بی خروش — چہ گنجایش شورش نای و نوش
سیہ مستی ابر و باران کجا — خزان چون نباشد بہاران کجا
اگر حور در دل خیالش کہ چہ — غم ہجر و ذوق وصالش کہ چہ
چہ منت نہد ناشناسا نگار — چہ لذت دہد وصل بی انتظار
گریزد دم بوسہ اینش کجا — فریبد بسوگند دینش کجا
نظر بازی و ذوق دیدار کو — بفردوس روزن بدیوار کو
نہ چشم آرزومند دلدار — نہ دل تشنہ ماہ پرکار
چہ پرسش رگی را بکاود ز دل — دو صد دجلہ خونم ز تار و دندل
بہر جرم کز دوق دفتر رسد — ز من حسرتی در برابر رسد
برین مویہ در روز امید و بیم — مگر ہم بدانسان کہ عرش عظیم
شود از تو سیلاب را چارہ جوئی — تو بخشی بدان گریہ ام آبروی
دگر خون حسرت بدر کردہ ای — ز پاداشش قطع نظر کردہ ای
گذشتم ز حسرت امیدیم ہست — سپید آب روی سپیدیم ہست
کہ البتہ این رند ناپارسا — کہ اندیشہ بر مسلمان نما
پرستار فرخندہ منشور تست — ہوادار و فرزانہ منشور تست
بہ بند امید استواری ز تست — بہ غالب خط رستگاری ز تست

ملاحظہ فرمایئے یہ حوصلہ، یہ جرأت اس شخص کی جو رندی اور قلندری اور ملامت کے تمام نشیب و فراز طے کر گیا ہو "کافر نتوانی شد ناچار مسلمان شو" جیف کافر مُردن و آوخ مسلمان زیستن، آذری جس کا پیشہ ہو ژند و پاژند کی قسم کھاتا ہو، اوستا کو صحف آسمانی سمجھتا ہو اور زردشت کو برتر عظیم سمجھنے کے ساتھ کفر و زندیق کے صدہا کلمات کر گیا ہو، رستگاری اور نجات کا خواہاں بھی ہے مگر کیوں اس لیے ہی نہیں کہ نعت رسول اور منقبت خلفا حضرت محمد صلعم کی داستان معراج اور حضرت علیؓ کی بے مثال شخصیت کے بارے میں بھی اپنے قلم کی سیاہی خشک کر دی ہے اور فکر و فن کا وہی بھرپور استعمال کیا ہے۔ جس کا مظاہرہ مظاہر خداوندی کی تعریف اور شاہان وقت کی مدح میں کیا ہے بلکہ غالب خدا کو کریم، رحیم، غفار اور پروردگار عالم اور رب العالمین بھی گردانتے ہیں۔ وہ شاکی بھی ہیں اور شرمسار بھی ہیں گنہگار ہیں اور توبہ استغفار کے ساتھ عاقبت کی اچھائی کے طلبگار بھی۔

مداحی و قصیدہ گوئی وقت کا تقاضا بھی تھا اور اپنی حیثیت منوانے کے لیے شاعر کے لیے لازم بھی۔ غالب نے ہر وہ رعایت برتی جو قصیدہ کا لازمہ تھیں۔ حمد، نعت، منقبت اور پھر بادشاہ وقت، نوابین اور ملکہ معظمہ و شہنشاہ برطانیہ کی مدح میں وہ پوری طرح کامیاب رہے ہیں۔ ظاہر ہے اس محدود موضوع اور صنف پر انھیں بہت محتاط رہنا پڑا ہوگا۔ اسی لیے اپنے قصائد کی فہرست میں آخری قصیدہ میں جو مضمون کے آغاز میں چند ابیات پر مشتمل ہے، غالب اپنی بے بضاعتی اور خود اپنی شکست کی آواز ہیں اور جس کے چند ابیات سے مقالہ کی ابتدا ہوتی ہے۔

اگرچہ تنگنائی غزل غالب کی وسعت بیان کے لیے کافی نہ تھی مگر اتنی اہم صنف شعر ان کی فکر اور نظر سے فیضیاب کیوں نہ ہوئی اور وہ اصناف جو اپنا دامن محدود رکھتی تھیں اور ان میں وہ اپنا جوہر دکھا چکے تھے تو اس متنوع اور پسندیدہ صنف کو وہ نظر انداز کر کے ایک مکمل اور عظیم شاعر کیسے بن سکتے تھے؟

جس طرح اہل فن نے مثنوی میں فردوسی (۴۱۱ھ) سنائی (۵۴۵ھ) نظامی (۶۰۴ھ) رومی (۶۷۲ھ)، قصیدہ میں خاقانی (۵۹۵ھ)، انوری (۵۸۳ھ) اور ظہیر فاریابی (۵۹۸ھ) کی طرح قصاید

آں نفس نازکندت کجاست وان نگہ جلوہ پسندت کجاست
راہ غلط کردہ بافسون دیو می سپری مرحلۂ رنگ و بو
تا بہ نیرنگ و فن افتادۂ از نظر خویشتن افتادۂ
آہ ز دنیا طلبی ہائی تو وایں ہمہ ابرام و تقاضائی تو
آں ہمہ دیوانگی و جاہلی وایں ہمہ ناکامی و بے حاصلی
آں ہمہ بدقسمتی و تن پروری واین ہمہ شیادی و افسون گری

لیکن ان کا اپنا فن اور وہب خداوندی انھیں جرأت بخشتا ہے اور وہ اپنی ہمت عالی کو ساقی ہمت سے مہیا کی ہوئی میخانہ "لا" سے شراب وحدت کو حاصل کرکے حسب توفیق منہ لگانے کا یارا بھی رکھتے ہیں۔

خیز چو منصور نوائی بزن ہستی خود را سر پائی بزن
آنکہ دریں پردہ سگالی بود از اثر ہمت عالی بود
ساقی ہمت کہ صلا میدہد بادہ ز خمخانۂ لا میدہد
ہمت اگر بال کشائی کند صعوہ تواند کہ ہمائی کند
نیز تقدیر دگر بردمد لالہ عجب نیست کہ اخگر دمد
ہمت ما نیز شہود حق است ہرچہ بسنجیم وجود حق ست
ہمت ما غیرت حق است و بس کثرت ما وحدت حق ست و بس

از اثر سطوت حق در کلام
حرف ز لب جہد مدم والسلام

غالب کے ہونٹوں سے جو الفاظ بہ نکلتے ہیں وہ شان و بزرگی خالق دو جہاں سے ودیعت ہیں تبھی تو وہ مناجات کی طرف راغب ہوتے ہیں اور پھر ایک دلچسپ حکایت بادشاہ کے کسی دشمن پر حملہ آور ہونے، فتح پانے اور جشن منانے کی بیان کرتے ہیں۔ امراء رؤسا اور اہل زر استقبال کو اور نذر و نیاز کو آتے ہیں۔ جب کہ غرباء مساکین اور بیچارے دوسرا گروہ اپنے آنسوؤں کے موتی اور خون جگر کے یاقوت لیے حاضر ہے۔ یہ گداگر اور ننا

نیے اسی طرح سعدی شیرازی (۶۹۱ھ) اور خواجہ حافظ شیرازی (۷۹۱ھ) کی غزل کی خوبیوں کو اپنی غزل کا موضوع بنایا۔ گاہے گاہے اعتراف بھی کیا مگر ان کے یہاں عرفی شیرازی (۹۹۹ھ) ظہوری (۱۰۲۵ھ)، مولانا نظیری (۱۰۲۱ھ)، حزین (۱۱۸۰ھ) اور بیدل (۱۱۳۳ھ) کا جس شدت سے اعتراف ملتا ہے اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے فارسی کے ممتاز اور معروف شعراء ہی کی پیروی کی ہے۔ اور ان کے کلام سے کلی استفادہ کرکے غزل گوئی کے میدان میں بھی اپنی زبان اپنے بیان تخیل کی پرکاری شگفتگی کلام، تازگی تراکیب اور لغات کی موسیقی اور ردیف و قافیہ کے ترنم سے اسے مقبول و معروف بنا لیا ہے۔

غزل جن موضوعات کی حامل ہے۔ غالب نے ان میں سے کسی کو اپنی گرفت میں لانے سے گریز نہیں کیا ہے۔ روایاتی طور پر کعبہ و بت خانہ، سبحہ و زنار، دیر و کلیسا، چراغ دیر، شمع حرم، کفر و ایمان، رندی، قلاشی، قلندری، مسیحا، فقر، کلیم، آذر، ابراہیم، نوح، زردشت، خسرو پرویز، نوشیرواں، قیس، فرہاد، مجنوں، کوہکن، شیریں، کوہ طور، سکندر، آئینہ سکندری، مریم، زلیخا، یوسف، ان کی عشقیہ شاعری اور رومان پرور ذہن کی کاوش و کوشش سے نئی روح اور طرح دار بانکپن پا گئے ہیں اور اس میں اس حیوان ظریف نے اپنی شوخی طبع، شگفتہ مزاجی اور ظرافت سے جو گلکاری اور رنگ آمیزی کی ہے اس کی مثال آپ ہیں۔

حالی نے تو مرزا کی تمام اصناف سخن میں تصوف، حب اہل بیت، فخر، شوخی و ظرافت، رندی و بے باکی، بیان رنج و مصیبت و شکایت و زار نالی، اظہار محبت و ہمدردی، حسن طلب وغیرہ کو نہایت لطیف و بلیغ و مرقص انداز میں بیان کو غالب کی خصوصیت قرار دیا ہے اور یہ چیز مزید شدت اور وسعت کے ساتھ ان کی غزلوں کا حسن اور رمز بن گئی ہے۔ چنانچہ حالی ہی نے مختلف موضوعات کے تحت غالب کے جو اشعار لکھے ہیں انھیں پڑھا جائے تو ان کی بیان کی صداقت کا اندازہ ایک طرف اور غالب کی شاعرانہ لطافت اور جدت دوسری طرف معلوم ہو جاتی ہے۔

رہرو گفتہ و در رفتہ بیایم غالب　　توشہ بر لب جو ماندہ شناسند مرا　(قلندری)

روی سیاہ خویش زہم خود نہفتہ ایم　　شمع خموش کلبہ تار خودیم ما　(حافظ)

در مشرب حریفان منعت چو نمائی — بنگر کہ چوں سکندر آئینہ نیست جم را (حافظ)

رواج صومعہ ہستی ست زینہار مرو — متاع میکدہ مستی ست ہوشیار بیا ،

در دہر فرو رفتہ لذت نتواں بود — بر قند نہ بر شہد نشیند مگس ما

بادہ مشکبوئ ما بید و کنار کشت ما — کوثر و سلسبیل ما طوبی ما بہشت ما
بردہ صدار بعین بسر بر سر صد ہزار غم — گر بنہی در آفتاب بادہ چکد ز خشت ما
بادہ اگر بود حرام بد ز خلاف شرع نیست — دل نہ نہی بہ خوب ما طعن مزن بزشت ما

خراہیم در رضائش در خرابات ما باشد — بچشم بد نگہدارد خدا یا دوست کامان را

بحث و جدل بجائی مان میکدہ جوئی کاندران — کس نفس از جدل نزد کس آن انفدک نخاست

در از دستی من چاکی ار فگند چہ عیب — ز پیش دلق ورع با ہزار پیوند ست

در گرم روی سایہ و سر چشمہ نجوئیم — با ما سخن از طوبی و کوثر نتوان گفت
آں راز کہ در سینہ نہانست نہ وعظ است — بر دار تواں گفت بہ منبر نتواں گفت

گر منافق بود وصل ناخوش، ور موافق ہجر تلخ — دیدہ ماتم کرد عیش دوستان دیدن نداشت
برد آدم از امانت ہر چہ گردون برنتافت — ریخت می بر خاک چون در جام گنجیدن نداشت

با دوست هر که باده بخلوت خورد مدام — داند که حور و کوثر و دارالسلام چیست
نه بهر جنت قرار و نه بهانه نبود — سوختم یک عمرم به عنوانم سوخت

نیکی زتست از تو نخواهیم مزد کار
وز خود بدیم کار تو ایم انتقام چیست
دل خستهٔ غمیم و بود می دوائی ما
با خستگان حدیث حلال و حرام چیست
غالب اگر نه خرقه و مصحف بهم فروخت
پرسد چرا که نرخ می لاله فام چیست

نعش مرا بسوز کم از برهمن نیم — ننگ نسوختن نتوان در مزار برد

آئین برهمن به نهایت رسانده ایم — غالب بیا که شیوه آذر کنیم طرح

رضوان چو شهد و شیر بغالب حواله کرد — بیچاره باز داد و می و مشکبو گرفت

رموز دین نشناسم درست معذورم — نهاد من عجمی و طریق من عربی است

بکام و آئینه حرف جم و سکندر چیست — که هر چه رفت بهر عهد در زمانهٔ تست

مقصود ما ز دیر و حرم جز حبیب نیست — هر جا کنیم سجده بدان آستان رسد

ہفت آسیا بگردش و ما درمیان او　　غالب دگر مپرس کہ بر ما چہ می رود

می مانی ز فرنگ آید و شاہد ز تتار　　ما نداینم کہ بغدادی و بسطامی ہست

توای کہ محو سخن گستران پیشینی　　مباش منکر غالب کہ در زمانہ تست

ہفت آسماں بگردش و ما درمیانہ ایم　　غالب دگر مپرس کہ بر ما چہ میرود

اتفاق سفر افتاد بہ پیری غالب　　آنچہ از پائی نیامد ز عصا می آید

عمر ہا چرخ بگردد کہ جگر سوختہ　　چوں من از دودہ آذر نفسان می آید

دبیرم، شاعرم، رندم، ندیمم شیوہا دارم　　گرفتم رحم بر فریاد و افغانم نمی آید

ہندرا رند سخن پیشہ کم نامی ہست　　اندریں دیر کہن میکدہ آشامی ہست

اپنی ہیئت کذائی پر نالاں و گریاں و خنداں اور جا بجا اپنا ادعا مگر پھر بھی احباب دوست اور بزرگ بھلاتے نہیں اور اگر لوگ ان کو تسلیم نہیں کرتے، ان کے شعر دل لگی کے ہیں تو بھی کیا ہوا وہ سلف اور اپنے عہد کے فارسی سخن سرایوں کا واسطہ دے کر خود ان میں شامل ہو جاتے ہیں۔

ای کہ راندی سخن از نکتہ سرایان عجم　　چہ بما منت بسیار نہی از کم شان
ہندرا خوش نفسا نند سخنور کہ بود　　باد در خلوت شان مشک فشان از دم شان

مومنؔ و نیرؔ و صہباؔئی و علویؔ آنگاہ　　حسرتیؔ، اشرفؔ و آزردہ بود اعظم شان
غالب سوختہ جاں گرچہ نیرزد بشمار　　ہست در بزم سخن ہم نفس و ہمدم شاںؔ

وہ اپنی بے بسی اور لاچاری میں سب کو شریک کر لیتے ہیں اور سب کا غم اپنے مزاج سے ہلکا کر دیتے ہیں۔

فیض حق را کمینہ شاگردیم　　عقل کل را بہینہ فرزندیم
ہم بتابش ببرق ہم نفسیم　　ہم بخشش با بر ماندیم
بتلاشی کہ ہست فیروزیم　　بمعاشیکہ نیست خورسندیم
ہمہ بر خویشتن ہمی گریستیم　　ہمہ بر روزگار می خندیم

ایسے ہزارہا مضامین غالب کے کلام کا خاصہ ہیں۔ ان کی کسر نفسی بے نیازی، عجز ناتوانی، آزادہ روی، اخلاص، دردمندی میں ان کی شان قلندری، لادینیت مگر خدا کے وجود کے قائل، نماز روزہ غائب، مگر شانِ محمدی کے عاشق اور فقر محمدی کے شیدائی، بادہ نوش مگر حضرت علیؓ کو ساقی کوثر مان کر کوثر و تسنیم کے آرزومند، کبھی فخر اور ادعا میں کسی کو خاطر میں نہ لانا اور کبھی سرفروشی اور نشاط کے عالم میں دنیا کے ہر انسان کو ساتھ لے کر چلنا، ان کا دین و ایمان تھا اور غالب کی فارسی غزلیات سے ہی بے شمار اشعار مثالاً پیش کیے جا سکتے ہیں۔

مگر غالب کی یہی غزلیات اپنے سراپا اور معانی و مفاہیم میں اس قدر مکمل، مسلسل ہیں کہ وہ ان کے فن کا شاہکار ہیں جن کا ہر شعر کسی مصور کے پورے پورٹریٹ کو رنگا رنگ شکل میں پیش کر سکتا ہے۔ شاعری میں موسیقی اور رنگ کا طبعی عنصر موجود ہے۔ اور فردوسیؔ نظامیؔ، خیامؔ و حافظؔ کے کلیات، اشعار کو نامی مصوروں نے وہ تیکھے اور نازک، معشوق بخشے ہیں ان کا احساس ان شعراء کو بھی نہ ہوا ہوگا، غالب کا کلام بھی رنگ اور برش سے ایسے ایسے پری زاد اور حورانِ بہشتی کو جنم دے گیا ہے کہ غالب کے خواب و خیال میں بھی نہ رہے ہوں گے۔ (عبدالرحمان چغتائی)

بہرحال غالب کی چند غزلیں جن میں روح ہے، توانائی ہے، زندگی ہے، ترنم ہے اور رقص ہے پڑھنے کے قابل ہیں۔ خود رقص کی ردیف کی ایک دلآویز غزل توجہ کے لائق ہے،

چوں عکس پل بسیل بذوق بلا برقص　　جاں را نگاہ دار وہم از جدا برقص
بند وفای عہد دمی خوش غنیمت ست　　از شاہدان بناز تش عہد وفا برقص
ذوقیست جستجو چہ زنی دم ز قطع راہ　　رفتار گم کن بصد امی در آ برقص
سر سبز بودہ انجمنہا چیدہ ایم　　ای شعلہ در گداز خس و خار ما برقص
ہم بر نوائے چغد طریق سماع گیر　　ہم در ہوائے جنبش بال ہما برقص
در عشق انبساط بپایان نمیرسد　　چوں گرد باد خاک شود در ہوا برقص
فرسودہ رسمہائے عزیزان فروگزار　　در سور نوحہ خوان و بہ بزم عزا برقص
چوں خشم صالحان و ولائے منافقاں　　در نفس خود مباش ولی بر ملا برقص
از سوختن الم ز شگفتن طرب مجوئے　　بیہودہ در کنار سموم و صبا برقص
غالب بدین نشاط کہ وابستہ کہ　　بر خویشتن ببال و بہ بند بلا برقص

یہ عزم، حوصلہ، زندگی کے مسائل سے نپٹنے کا بلاؤں کے سمندر میں شناوری کا ارادہ بھی اس مشکل ردیف میں رقص شرر ہی تو ہے۔

ایک دوسری غزل ردیف "فا" میں "یک طرف" کی مترنم اور پُراز موسیقی دھن میں خالص عاشقانہ اور رومانوی خیالات کی ادائگی بھی قابل داد ہے۔ وہ تمام مدارج اور کیفیات جو انسان کو اپنی زندگی میں طے اور محسوس کرتے پڑتے ہیں غالب "یک طرف" کی پرکشش اور کانوں میں رس گھولتی ہوئی ردیف و تراکیب و تلمیحات سے کیا جادو جگاتے ہیں،

ای کردہ غرقم بیمجز شوزین نشانہا یکطرف　　رفتم بساحل یکطرف شستم بدنیا یکطرف
از عشق و حسن ما و تو با ہم دگر در گفتگو　　خسرو مجنوں یکطرف شیریں بہ لیلی یکطرف
تا دل بدنیا دادہام در کشمکش افتادہام　　اندوہ فرصت یکطرف ذوق تماشا یکطرف

ای بستہ در بزم اثر بر غارت ہوش کمر
مطرب با الحان یکطرف ساقی بصہبا یکطرف

خارا فگنان در راہ من ترسان ز برق آہ من
طفلان نادان یکطرف پیران دانا یکطرف

واماندہ در راہ وفا از بیخودی ہا جا بجا
نقدم بمنزل یکطرف رختم بصحرا یکطرف

با دیدہ و دل از دو سو ماندم بہ بند غم فرو
اندوہ پنہاں یکطرف آشوب پیدا یکطرف

ہم مہر دارد ہم حیا بر نفسم آرید ش چرا
خوشان بشیون یکطرف خصمان بغوغا یکطرف

ای آئینہ پیش نظر مستانہ بر خود جلوہ گر
رحمی بجان خویش کن غم خواری ما یکطرف

غالب پہ تسکیم دہی در ہجر آن سرو سہی
رشک رقیبم میکشد فرط تمنا یکطرف

بیداری، زندگی، حرکت اور کامرانی کا مژدہ ہے اور خواب غفلت اور محرومی کا اثاثہ۔ غالب نشاط، درکیف میں صبح کی آمد، پرکیف لذت اور بامراد مستقبل کی بشارت دیتے ہیں۔ اور بائی فارسی کی ردیف مخسپ میں کیا کیا ذوق عمل اور کس کس تب وتاب کی دعوت دیتے ہیں۔ بغیر داد دیے رہا نہیں جاتا۔

سحر دمیدہ و گل در دمیدنست مخسپ
جہاں جہاں گل نظارہ چیدنست مخسپ

مشام ما بہ شمیم گل نوازشش کن
نسیم غالیہ را در وزیدنست مخسپ

ز خویش حسن طلب بین و در صبوحی کوش
می شبانہ ز لب در چکیدنست مخسپ

ستارہ سحری مژدہ سنج دیدار یست
ببین کہ چشم فلک در پریدنست مخسپ

تو محو خواب و سحر در تماست، از انجم
بہ پشت دست بدنداں گزیدنست مخسپ

نفس زنار بہ سنبل، درود نست بگیر
ز خون دل مژہ در لالہ چیدنست مخسپ

نشاط گوش بر آواز قلقل است بیا
پیالہ چشم براہ کشیدنست مخسپ

نشان زندگی دل دو یدنست بالیست
خلائی آئینہ چشم دیدنست مخسپ

ندیدہ سو حریفاں کشودنست مبند
ز دل مراد عزیزان تپیدنست مخسپ

بذکر مرگ شب زندہ داشتن ذوقیست
گرت فسانۂ غالب شنیدنست مخسپ[۱۱۳]

مخسپ، کن، کوش، بہیں، بخیز، بیا، بایست، میند، امر و نہی کے کلمات سے ہو؟ باخبری اور عمل کا پیغام بے معنی نہیں ہے، معانی مطالب اور مفہوم کا لطف تو جداگانہ ہے اسی طرح کچھ اور غزلوں کے مکمل اور معمور ہونے میں کوئی کلام نہیں ہے۔ مثالاً چند ایک مقطع اور مطلع اس کی کفالت اور کفایت کرتے ہیں؛

ہرچہ فلک نخواستست ہیچکس از فلک نخواست — ظرف فقیہ می نجست بادہ باُرک نخواست
سہل شمرد و سرسری تا توز عجز نشمری — غالب اگر زد اوری داد خود از فلک نخواست[۱۱۴]

اختری خوشتر از نیم بجہان میبایست — خود بپیر مرا بخت جوان میبایست
قدر انفاس گرم در نظر مستی غالب — در غم دہر دریغم بفغاں میبایست[۱۱۵]

بتان شہر ستم پیشہ شہریارانند — کہ در ستم روش آموز روزگارانند
زچشم زخم بدیں حیلہ کی دہی غالب — دگر مگو کہ چو من در جہان ہزارانند[۱۱۶]

مردآنکہ در ہجوم تمنا شود ہلاک — از رشک تشنہ کہ بدریا شود ہلاک
غالب ستم نگر کہ چو ولیم فریزری — زینسان بچیرہ دستی اعدا شود ہلاک[۱۱۷]

ای ترا و مرا درایں نیرنگ — دہن و چشم و دست و دل ہمہ تنگ
شکوہ و شکر ہرزہ و باطل — غالب و دوست آبگینہ سنگ[۱۱۸]

گفتم زشادی گنجیدن آسمان در بغل　　تنگم کشیدا نسادگی در وصل جاناں در بغل
ان غالب خلوت نشین ہمی چناں عیشی چنیں　　جاسوس سلطاں در کمین مطلب سلطاں در بغل[20]

بیا کہ قاعدہ آسماں بگردانیم　　قضا بگردش رطل گراں بگردانیم
من وصال تو باور نمی کند غالب　　بیا کہ قاعدہ آسماں بگردانیم[21]

بخونم دست و تیغ آلود جاناں　　بدآموزان وکیل بی زبانان
سنگ برخیز زاین ہنگامہ غالب　　چو آویزی بدین مشتی گرانان[22]

بی دارم از اہل دل دم گرفتہ　　بشوخی دل از خویشتن ہم گرفتہ
ظفر کردم او دست در نکتہ سنجی　　کہ غالب بآواز عالم گرفتہ[23]

تا ہم ز دل برد کافر ادائی　　بالا بلندی کوتہ قبائی
در عرض دعوی سیلی نکوئی　　بر زعم غالب مجنوں شبائی[24]

ان کی رباعیات خیام کی مستی اور شوخی کا رنگ لئے ہوئے ہیں۔ غرض وہ جو کہا کرتے تھے کہ آبائی مرا تیغ و مرا کلک بساز است، ایبکی تورانی اور سمرقند زادگی کے نسب پر نازاں تھے اپنے ساتھ اس علاقہ کی قرنہا قرن کی شستہ اور اعلیٰ تہذیب کا سرمایہ لائے تھے، روایتی عشق و عاشقی جو قوم کی میراث تھی اور حسن کی دلآویزی جو قدرت کا شاہکار تھی، فارسی زبان کا رچا بسا موضوع تھی اور جس میں انقلاب زمانہ نے تصوف کی چاشنی بھر دی تھی اور شاعری جس کا نمائندہ تھی اور رودکی، فردوسی، سنائی، عطار، رومی، اور خیام، سعدی اور حافظ نے جسے سنوار نکھار کر، نوک پلک سے درست کر کے خسرو، فیضی، عرفی، ظہوری، نظیری۔

صائب، حزین اور بیدل کے تصرف میں دے دی تھی وہ غالب کے معجز نما قلم سے ایک شعلہ جوالہ، آفت کی پرکالہ اور عبارت، اشارت اور ادا کی بلائے جان بن کر نکلی۔

غالب نے اس میں جو چار چاند لگائے وہ آزادی، زردشتیت، مسیحیت اور برہمنیت کے عناصر تھے جسے ان کے بزرگ شعرا نے کچھ تکلف کے ساتھ برتا تھا۔ اور غالب کی بشر دوستی، ادیان کی وحدت، وسعت قلب اور دردمندی کی بدولت تھے۔ انھیں اپنے آپ کو منوانا تھا، جینا تھا اور شاد و ناشاد جینا تھا۔ لیکن بھر پور جینا تھا اس لیے ملا عبدالصمد کی استادی اور سارے رند، قلاش، قلندر اور ملامتی شعرا سے انھوں نے رشتہ جوڑا، قسمیں کھائیں اور اسی لیے آئندہ چل کر نام و نسب سے بیزار ہو کر کہا تھا:

ازدودہ وددومان نگویم

وہ بتوں کسی واقعی آتش نفس سے اور سنائی کی مانند جگر سوختہ

(عمرہا باید کہ تا یک کودکی از لطف طبع شاعر شیریں سخن یا عالمی گویا شود)

مانبودیم بدایں مرتبہ راضی غالب   شعر خود خواہش آں کرد کہ گردد فن ما

درپۂ ہر حرف غالب چیدہ ام میخانہ   تا زدیوانم کہ سرمست سخن خواہد شدن

احباب کی تنگ ظرفی، اپنوں کی اور بیگانوں کی دل آزاری اور دلی کے انقلاب نے سفر کی صعوبتیں بخشیں، ہندوستان میں دہلی، کلکتہ اور کاشی وارانسی، گنگا جمنا نے اپنی دلآویزی اور شیرینی کے باوجود ان کو نجف، قم، مشہد، شیراز، اصفہان، تبریز اور ہرات کی دلدادگی اور خواہش سے باز نہ رکھا۔

غالب انغاک کدورت خیز ہندم دل گرفت   اصفہان ہے یزد ہے شیراز ہے تبریز ہے

غالب از ہندوستان بگریز فرصت مفت تست   در نجف مردن خوش است و در صفاہان زیستن

غالب از آب و ہوائی ہند بسمل گشت فلق   خیز تا خود را بہ اصفہان و شیراز افگنم
غالب ز ہند نیست نوائی کہ می کشیم   گوئی ز اصفہان و ہرات و قمیم ما

آج بھی غالب کی مکمل شاعری کے بارہ میں اور ان کی فنکاری پر حالی کا یہ کہنا صحیح معلوم ہوتا ہے کہ وہ شخص جس کا قصیدہ انوری اور خاقانی کے قصیدوں سے ٹکر کھائے۔ جس کی غزل عرفی اور طالب کی غزل سے سبقت لے جائے۔ جو رباعی میں عمر خیام کی آواز میں آواز ملائے اور جس کی نثر کے آگے ابوالفضل اور ظہوری کی نثریں پھیکی اور بے مزہ معلوم ہوں اس کو بہادر شاہ کی سرکار سے صرف پچاس روپیہ ماہوار ملتا تھا۔

بقول پروفیسر مجیب "اگرچہ غالب کی زندگی کا پس منظر مغل سلطنت کا زوال تھا لیکن اسی زوال آمادہ تہذیب کے ایک جاندار عنصر یعنی تصوف نے یہاں کے خمیر میں شامل ہو کر آزادہ روی اور صلح کل کا ایک نیا مسلک پیدا کر دیا تھا اور درویشی اور بھگتی کے امتزاج نے غالب کی شخصیت اور تہذیب نے غالب پر اپنی گہری چھاپ ڈالی تھی۔"

غالب سراپا اس روایت اور ورثہ کے امین تھے۔ جو مصر، شام، ترکستان، خراسان اور بلاد عرب سے ملامت، فتوت اور قلندری کے کارواں در کارواں صورت میں ملتان لاہور اور خصوصاً دہلی کو اپنا مامن و مسکن بنا رہے تھے۔ خواجہ عبداللہ انصار، باباطاہر، ابوسعید ابوالخیر، نجم الدین کبریٰ، خیام، مولوی شمس تبریز، سعدی اور حافظ کی شاعری اس کا جزو تھی جو ہندوستان میں امیر خسرو، فیضی، عرفی، طالب، ظہوری، نظیری، صائب، حزین اور بیدل کی غزلیات اور کلام کا حصہ بن کر غالب کے کلام میں بھی در آئی، فتوت، ملامت اور قلندرانہ خیالات کا ایک دریا بھی ان کے اشعار میں موجزن ہے۔ چنانچہ جہاں عشق و عاشقی کا چرچا زور و شور سے ہے وہیں ان کی یہ خصوصیت بھی دیکھی اور پائی جا سکتی ہے جس نے ان کی شاعری کو مالا مال کر دیا اور انھیں ہندوستان میں فارسی کا عظیم الشان شاعر بنا دیا۔

حواشی

۱۔ کلیات غالب فارسی، غلام رسول مہر، علمی پرنٹنگ پریس، لاہور ص۳ اشاعت اول ۱۹۶۰ء
۲۔ ایضاً ایضاً ایضاً ص۳۶۳ 〃 ۱۹۶۵ء
۳۔ ایضاً ایضاً ایضاً ص۲۲
۴۔ ایضاً
۵۔ ایضاً ایضاً ایضاً ص۹۰
۶۔ ایضاً ایضاً ایضاً ص۲۰-۱۱۹
۷۔ ایضاً ایضاً ایضاً ص۱۲۱
۸۔ ایضاً ایضاً ایضاً ص۱۶۲
۹۔ ایضاً ایضاً ایضاً ص۶۲-۱۶۳
۱۰۔ ایضاً ایضاً ایضاً
۱۱۔ ایضاً ایضاً ایضاً
۱۲۔ ایضاً ایضاً ایضاً ص۱۸ قطعہ اول
۱۳۔ ایضاً ایضاً ایضاً ص۶۱-۵۶۰
۱۴۔ ایضاً ایضاً ایضاً ص۵۶۸
۱۵۔ ایضاً ایضاً ایضاً ص۲۵۰
۱۶۔ ایضاً ایضاً ایضاً ص۴۶۰
۱۷۔ ایضاً ایضاً ایضاً ص۴۶۸
۱۸۔ ایضاً ایضاً ایضاً ص۵۲۳
۱۹۔ ایضاً ایضاً ایضاً ص۵۷۰

۲۰	کلیات غالب فارسی، غلام رسول مہر، علمی پرنٹنگ پریس، لاہور			ص ۵۴۲
۲۱	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ص ۵۶۲
۲۲	〃	〃	〃	ص ۵۹۲
۲۳	〃	〃	〃	ص ۶۰۹
۲۴	〃	〃	〃	ص ۶۱۶
۲۵	〃	〃	〃	ص ۶۲۶-۲۸
۲۶	〃	〃	〃	ص ۱۸

ڈاکٹر تنویر احمد علوی

مہر نیمروز ـــــ ایک مطالعہ

مہر نیم روز کے اس مطالعہ کے وقت راقم الحروف کے پیش نگاہ کلیات نثر فارسی غالب کا وہ نسخہ ہے جو سنہ ۱۲۹۲ ہجری نبوی میں مطبع نول کشور واقع کانپور سے شائع ہوا اس اشاعت کے ساتھ پنج آہنگ اور دستنبو بھی شریک ہیں۔

ہر ایک تصنیف کی اپنی جداگانہ حیثیت بھی اس میں قائم رکھی گئی ہے۔ لیکن نشانات شمار مسلسل رہی۔ مہر نیم روز کے سلسلۂ نگارش کا آغاز ۲۵۶ صفحے ہوتا ہے اور یہ سلسلۂ نگارش ۳۰۴ نشان شمار تک چلتا رہتا ہے۔ دعا کے بعد تمت لکھ کر اسے ختم کیا گیا ہے اس کے بعد دو صفحے کا فرہنگ نامہ درج ہے۔ کاغذ بادامی اور خط نستعلیق سوادِ خط روشن ہے۔

ابتدا و انتہا کو پھولوں سے آراستہ کیا گیا ہے جدول یک خطی ہے اور تقطیع ۶ × ۱۲ ہے۔

اشاعت اول کے لیے اس کے انتباع کی جو تاریخ نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر رخشاں کے قلم کی نگارشات میں سے ہے وہ اس شعر سے برآمد ہوتی ہے

بداں باعث کہ طرز انش جہاں فروز است
حیات افسروز مہر نیم روز است

ایک سو چودہ صفحات پر مشتمل یہ تاریخی تصنیف مرزا غالب کی نہایت اہم فارسی تحریروں میں ہے۔

مغلوں کی اپنی تاریخ کے ایک جزو لاینفک کے طور پر نہ سہی مرزا غالب کی ادبی تحریروں اور فارسی نگارش ناموں کے لیے اس کی غیر معمولی اہمیت ہے۔

غالب کا اپنا دور اگرچہ سادگی وسلاست کی طرف آرہا تھا خود غالب کا رجحان بھی اسی طرف تھا لیکن سادگی میں پرکاری بلکہ پرکاریوں کی اپنی ادبی وتہذیبی اہمیت تھی کہ ان کے ذریعہ تحریر وتصویر کے تئیں آرائشِ حسن اور حسن آرائش کا کام لیا جاتا۔ یہاں سرمایۂ آرائشِ گفتار کے بغیر وہ منزل بھی نہ آتی تھی ۔

مری مشاطگی کی کیا ضرورت حسنِ معنی کو
کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالہ کی حنابندی

تصنیف کا موضوع مغلوں کی تاریخ ہے اس کے لیے مواد کی فراہمی اور ماخذ سے رجوع کا کام حکیم احسن اللہ نے انجام دیا ۔ ـــــ اس بارۂ خاص میں کیا کیا کاوشیں کیں اس کے بارہ میں کوئی تفصیل ہمارے علم میں نہیں مرزا نے بھی مصادر کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا ان کی زبان قلم پر حکیم احسن اللہ کی ذمہ داریوں ہی کا ذکر آیا اور بس ۔ غالب نے ان کی شان میں ایک قصیدہ نما نظم تو انشا کر دی لیکن مصادر سے کوئی بحث نہیں کی ۔

غالب کی تخلیقی حسیت اور اس سے وابستہ طرفہ کار طبیعت سادگی میں بھی پرکاری کے نازک رشتوں اور لطیف خوشبوؤں کو تلاش کرتی ہے اور اس سے ہٹ کر وہ اپنے فکری تجسس کو تخلیقی تجربے میں نہیں بدل سکتی ۔ ان کی سادگی بھی عجیب ہے لیکن پُرکاری عجیب تر ہے ۔ اپنی زیرِ نگاہ تصنیف میں انھوں نے تاریخ کو موضوع فکر وفن بنایا لیکن وہ بھی ایک لگاؤ ہے لاگ اور لگن نہیں ۔

مہرِ نیم روز میں بھی غالب تاریخ نویس نہیں ادب نگار ہیں ۔ ابوالفضل نے اکبرنامے کے صفحات میں جابجا انشا پردازی کے نادر نمونے پیش کیے ہیں یہی صورت حال خزائن الفتوح میں ہم خسرو کے یہاں دیکھتے ہیں ۔ غالب کو بھی انھیں کے قلم وقدم سے وابستہ کر کے دیکھیں تو ادب و تاریخ کا یہ رشتہ صدیوں میں پھیلا ہوا نظر آتا ہے ۔

اگر ہم اپنی ادبی روایت پر غور کریں تو ہندوستان میں فارسی شعر وادب کے بڑے نمائندے خسرو، ابوالفضل اور بیدل جیسے نابغوں کی صورت میں سامنے آتے ہیں مرزا غالب بھی یہ کہیے کہ اسی

سلسلہ کی آخری کڑی ہیں۔ درمیان سفر میں تھوڑی تر شیزی اور ان کی سہ نثر آتی ہے ان العماد نثلاثہ"
مگر ایسا نہیں تھا کہ اس کے طلسم رنگ و بوے غالب جیسے فن کار کا ذہن آزاد ہو جاتا۔ یہ
ت بہ تکلف نہیں بلا تکلف بھی جا سکتی کہ مہر نیم روز" کو غالب نے تاریخ میں ایک خوب صورت
ب پارے کے روپ میں پیش کیا ہے۔ اُن کے سامنے فارسی ادبیات کا ایک ایسا کہکشانی
سلسلہ تھا جس میں شاعری اور نثر نگاری کے حسین حلقے قوس قزح کے نیم دائروں کی طرح
شریک تھے۔

اگر ہم غالب کے کلاسکی رجحانات سے صرف نظر نہ کریں تو بہ آسانی اس سچائی کو دریافت
کیا جا سکتا ہے کہ مرزا کے رشحات قلم میں فارسی ادبیات عالیہ کے انداز نگارش اور اسلوب گزارش
ترجیحی اہمیت حاصل رہی ہے۔

"سبک ہندی" کے عنوان سے شعری اور نثری نگارشات میں جس آرائشی اسلوب کا تذکرہ
پایا جاتا ہے۔ اس کا تعلق صرف ہندوستان نژاد فارسی ادیبوں اور شاعروں ہی سے نہیں ہے
ن فن کاروں اور زبان دانوں سے بھی ہے جو سمرقند و بخارا ہی سے تعلق نہیں رکھتے تھے بلکہ ان کا
نی اور ادبی رشتہ گل و بلبل کی سرزمین یعنی ایران سے بھی تھا۔ وہ ہمدان، شیراز اور تبریز جیسے
ہروں اور تہذیبی مرکزوں سے چل کر یہاں آتے تھے اور جن کا دہلی، دکن لاہور یا لکھنؤ سے کوئی
سانی رشتہ نہیں تھا۔

وسطی عہد اور عربی فارسی ادبیات کے ارتقا پذیر سلسلہ میں اسے نشانات راہ کی طرح
یکھا جا سکتا ہے۔ ادبیات صرف صرف شعر و ادب ہی کی نہیں فن تعمیر، فن سنگ تراشی، فن رقص
، مصوری، فن بت گری، فن موسیقی اور فن رقص میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔
اس سے گزر کر ہم اسلحہ سازی، ظروف سازی، پارچہ بافی باغبانی، ملبوس، تراشی اور فن خطاطی
بھی اس کی، ہیج اور دسترس کے نمونوں کو بھی ہم پیش نظر رکھ سکتے ہیں اس ذہنی اور تہذیبی
ریخ کے حوالوں کے بغیر ہم اس پرکاری فنی نمونوں کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتے۔
غالب نے اس تاریخی تالیف کو جسے دو حصوں پر مشتمل ہونا تھا "پرتوستان" کا نام دیا تھا۔
پر روشن پرچھائیوں کا یہ شعر مکمل نہیں ہوا "مہر نیم روز" کے بعد جو حصہ اول تھا حصہ دوم "ماہ نیم ماہ"

اپنی ناتمامی میں تمام رہا اور غالب ہی کے ایک مصرعہ کا سہارا لے کر یہ کہا جا سکتا ہے۔

چھوڑا مہ نخشب کی طرح دستِ قضا نے

اور مہر نیم روز کے مقابل آنے کی نوبت ہی نہیں آئی سلسلۂ نگارش کا آغاز سپاس و ستایشِ ایزدی سے ہوتا ہے۔ یہ موضوع غالب کی دل چسپی کا موضوع رہا ہے۔ اس میں خیال انگیزی، معنی آفرینی اور نکتہ سنجی کے جو امکانات ہیں اس نے فلسفۂ الٰہیات میں خدا و ماسوا کے رشتوں کی بہت، نازک تعبیریں پیش کی ہیں۔ غالب کے قلم سے تراوش پائے ہوئے یہ جملے ملاحظہ ہوں۔

"زہے بخشایندہ پرتوستاں، کشایندۂ مہر نیم روز و نمایندۂ ماہ نیم ماہ.....

اگر سخن از بلندی سپہر درمیاں اندازند، اندازہ داناں دانند کہ ایں بلندی اساس

مایۂ نمود کیست، و اگر مہر را بروشنی انگشت نما سازند، یزداں شناساں شناسند کہ

ایں الف جلوہ آئینہ کیست۔"

غالب کے یہاں "فارسی نیامیختہ بعربی" کا رجحان تقریباً ربع صدی پیشتر سامنے آچکا تھا۔ ان کے بعض خطوط مشمولہ پنج آہنگ میں اسے ان کی زبان قلم کی دل آسائیوں اور جدت آفرینیوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔

اس زمانہ کا کوئی بھی قابل ذکر نثر نگار جو فارسی میں لکھ رہا ہو یا اردو میں ایسا نہیں جو اپنی نگارشات کو خوب صورت شعری نمونوں سے آراستہ نہ کرتا ہو کہ اس دور کی فنی اقدار اور تخلیقی حسیت کی بہتر نمایندگی اشعار ہی کے وسیلے ہو سکتی تھی غالب نے اس بارۂ خاص میں اپنے ہی ابیات اور اشعار کو سامنے رکھا ہے۔ اور ان کے اپنے احساس جلال و جمال کی تصویر کشی میں مدد لی ہے۔ ان کے فارسی شعروں کی ایک قابل لحاظ تعداد مہر نیم روز کے نثر پاروں کے ساتھ موجود ہے۔

اگرچہ یہ کتاب نگارشات فن تاریخ کے ذیل میں آتی ہے لیکن اپنی بہترین شکل میں ایک ادبی و شعری تخلیقات کا مختصر نامہ بھی ہے جس کے صفحات اس امر کی نشان دہی کرتے ہیں کہ ہماری ادبی تحریریں، تاریخی دستاویزیں بھی ہیں اور بہت سی تاریخی دستاویزیں ادب و شعر کے اجلہ مستند ماخذ میں شامل ہیں۔

نعت رسول مقبول کے سلسلہ میں غالب کی وہ مشہور فارسی غزل جس کا مقطع ہے :

غالب ثنائے خواجہ بیزداں گذاشتیم   کاں ذات پاک مرتبہ دان محمد است

نثری عبارت میں وجود و مراتب وجود کی فلسفیانہ بحث کو بھی شامل کیا ہے۔ بعض عمومی روایتیں بھی شامل ذکر پاک کی گئی ہیں۔ مثلاً آپ کے جسم اطہر کا سایہ زمین پر نہیں پڑتا تھا۔

معجزات پیغمبر میں آتشکدے کا سرد ہونا طاق   دستوں کا انہدام ،

غار ثور کے دہانہ پر تار عنکبوت کی پردہ داری اور اسی نوع کے دوسرے معجزات و خرق عادات کی طرف اشارہ ہے۔

بعد ازاں ترانہ " مدح " کے ضمنی عنوان سے بہادر شاہ ظفر کی نثر و نظم میں مدح گستری و ستایش گری کی گئی ہے اور یہ کہیے کہ مدح ستائی کا حق ادا کیا ہے خامۂ غالب کی شگفتہ نگاریوں اور طرفہ روشوں کا اندازہ کچھ ایسے ادبی مراحل میں ہوتا ہے ــــــ بات کو یہاں سے شروع کیا گیا ہے۔

"ازاں صبا کہ بعد ہر دور طورے دیگر ست و پس از ہرا نجام سرانجامے جداگانہ
در ہر عہد، عہد سلطنت   دیگر ست و در ہر وقت وقت کشایش طلسمے
دیگر۔ فرہ ایزدی کہ چندے را بنام آوری شکوہ عز و غنا از سیما درخشیدی وانکہ
راہم نشان مندی فقر و غنا فروغ بخشیدے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بیک دیگر خوردن
ایں دو مدح مجمع البحرینے پدید آورد"

فخر و غنا اور فقر و فنا خود بہادر شاہ کی ذات میں بھی ہم رنگ و ہم آہنگ ہو گئے تھے اس کا علان نظموں سے بھی ہوتا ہے جو حسین عبارتوں کے ساتھ گل و گوہر کی ہم رشتہ ہیں۔ غالب کے نثر پاروں کے ساتھ بھی ایسے بہت سے شعری حصے ہیں جن سے ان کے شیوۂ مدح نگاری و ستایش گری کی توسیعات کا حال معلوم ہوتا ہے اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ انہیں اس فن سے کس طرح طبعی خلوص اور فنکارانہ خصوص تھا۔

آں ہمہ و بے ہمہ و با ہمہ   با ہمہ تنہا و بہ تنہا ہمہ

بسکہ زخویش آئینہ در پیش داشت — جلوہ ہم از خویش فرا خویش داشت
خواست کہ آوازہ بساز افگند — طرح شناسائی راز افگند
گوہر درصدف نظر ازاں پے برد — راہ بخلوت کدہ ناز برد

اس حصہ میں فلسفیانہ فکر فرمائی اور ادیبانہ خامہ فرسائی کے وہ دلکش نمونے ملتے ہیں جنھیں نثر نگاری کے بہترین نگارخانوں میں شامل کیا جا سکتا ہے۔

نعت رسول مقبول صلے اللہ علیہ وسلم کا اسلوب بھی اسی کا پرتو ہے اس میں تخیل نگاری کا رنگ بھی آگیا ہے اور داستانوں میں جو منظر کشی اور مرقع نگاری کی پرکشش مثالیں ملتی ہیں۔ ان کا اثر بھی غالب کے ذہن میں رہا نعت سرور کائنات کی نثری عبارتوں اور انداز پیش کش کی داستانوں میں غالب کا تخلیقی کارذہن، چمن بندیاں نہیں دشت پیمائیاں کرتا ہے کہ حضور اکرم صحرائے عرب کے بادیہ نشینوں میں پیدا ہوئے تھے۔

"از تف ریگ تفتہ ہزار آبلہ برپائے نگاہم افتاد دران بیابان، رہرو افگن محیط از گداز زہرۂ خاک موج زن رہروان زہر سوے آں قلزم رواں، از تاب آتشے کہ گرم رواں آں بادیہ از شعلۂ رفتار در نہاد خاک پیہم زدہ اند، سایہ چوں زاغ نیم بسمل در تپیدن ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ و سبزہ چوں طاؤس خائف در پریدن ۔ ۔ ۔ ۔ طبقات دوزخ بصورت خاشاک نیم سوختے کہ از کاروانیاں بصحرا ماند برکنار افتادہ" (۳۶۰)

اس طوفان صرصر و سموم میں سبزۂ بیگانہ کی ایک وحشت زدہ و گرفتار دام ہوا طاؤس کی طرح سکڑ پھڑا رہا ہے دوزخ کا اپنی تمام قہرمانیوں کے ساتھ اس آگ کے افسردہ و بے مصرف ڈھیر کی جس میں خس و خاشاک جل رہے ہیں اور کارواں جسے مشتعل کر کے روانہ ہو گیا، نئی تشبیہات اور نادر استعارے ہیں۔

حضور پرنور کے لیے خراج تحسین و نذرانۂ آفریں کی پیش کش کا یہ انداز ہے جس میں ذات رسالت مآب کو مہر ختم نبوت و خاتم سلسلہ انبیا کہا گیا ہے علیہم الصلوٰۃ والسلام
۔ ۔ ۔ ۔ ۔ محمد کش ساتگین ایزد حق توام بدوران بزم آرائی خواجہ است

کہ نو تشخاتمہ اظہار حقیقت ذات وذاتش بگواہی مہر نبوت خاتم انبیاست
آرے چوں گزارش رازہا در نگارش انجام دہند، دلنشیں نشانے از
خاتم برخاتم نہند، نازم بہ نقش ایں ایزدی خاتم کہ در اندیشہ نامہ نگار
نخستیں رقم است، و در نورد نامۂ راز باز پسیں ۔ (۲۶۱)

یہاں ندرت فکر کا پہلو جدّت ادا میں ہے جس نے طرز نگارش کو ایک خاص انداز و طراز عطا کیا ہے۔

پیغمبر خاتم کی پیدائش و ظہور نور کے وقت معمورۂ عالم میں جو رسول مقبول کی آمد کی نشانیاں ظاہر ہوئیں ان کے ذکر جمیل و منقوش جلال و جمال کے طور پر جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا تعلق ان اعجاز نمائیدی سے ہے جو آنحضرت کی ذات و صفات سے وابستہ ہیں۔

اس کے بعد غالب نے حکیم احسن اللہ اور بادشاہِ وقت بہادر شاہ ظفر کی مداح کی ہے جو اس وقت کی ایک روایت تھی کہ حمد و ثنا اور نعت و منقبت کے بعد بادشاہِ وقت کی مداح کی جاتی تھی۔

بہادر شاہ ظفر کے دربار سے ادبی تعلق تو پہلے ہی سے تھا وہ قلعوں کے مشاعروں میں آتے جاتے تھے لیکن شاہی دربار سے وابستہ نہیں تھے اب یہ وابستگی بھی عمل پیرا آ رہی تھی اور بادشاہ نے جو بھی اس وقت دربار کے حالات تھے اس کے مطابق ان کی سرپرستی قبول فرمائی تھی۔ بادشاہ کی تعریف کرتے ہوئے یہ لکھا ہے۔

شبلی از منبر دہد آواز عشق   شاہ ما بر تخت گوید راز عشق
عشق دارد پایۂ ہر کس نگاہ   منبر از شبلی و تخت از بادشاہ
شاہ ما دارد بہم در رہروی   خرقۂ پیری و تاج خسروی
بر دعائے شہ سخن کوتاہ باد   تا خدا باشد بہادر شاہ باد

غالب نے اس کے ذیل میں اپنے حالات اور طبعی میلانات پر بھی مختصراً روشنی ڈالنے کی سعی کی ہے۔

"در آمدن از عدم بوجود بود اے گہر سنجی و گوہر فروشی بود، کالائے بیش بہائے

سی صدیں چند سو روے روانی نہ بدید وشاخ گراں مایہ حصرع دریں باتار لرزش
مذاتی نشد، ناچار ہر چہ باخو نفتن درآوردہ ام چون گویم کہ خویش می برم
لیے درسفینہ ہادپارہ درسینہ ہا می گزارم پس از من آں گنج شایگاں را،
اگر ہمہ باد برد گو ببر و اگر ہمہ خاک بخورد گو بخور" (۳۴۹)

اسی کے ساتھ اپنے خاندانی سلسلے کی طرف بھی قلم کی چشم روشن سے اشارہ کیا ہے غالب کے
نسل نسب نامے کے ضمن میں غالباً یہ ان کا پہلا بیان ہے جو ان کے قلم سے کسی باقاعدہ تصنیف
میں نقل ہوا ہے فارسی کے ایک خط میں مزید ایسے کچھ اشارے ملتے ہیں اردو خطوط جن کا حوالہ
اکثر غالب کے سوانح ناموں میں یا ان کے سیرت نگاروں کے یہاں آتا ہے۔ وہ اسی کی صدائے
بازگشت ہے۔

"نیاگان نامور نگار، از تخمہ افراسیاب و پشنگ بودہ اند، و فرماں دہان فرہنگ
وفر، نمردن چراغ ہستی، بہ نور دیدہ تور، بر باد آستین کینہ کے خسو پشنگیاں
را روز سیاہ برجیں آورد خداوندان اورنگ دیہیم را، ازاں برگ و ساز جز
تیغ کند ناگوں بکف نماند بہ مرزو بوم بیگانہ روی آوردند و بہ دست مزد تیغ
زدن، نان خوردند ہم ازیں نیستاں ایوانان کہسار نشیمن، سلجوقیاں دگر بارہ
سر بافسر۔۔۔ آرا شدند چرخ گردندہ چنانکہ خوے اوست ایں نامداران
کاؤس کوس را از پلے افگند" (۳۶۷)

آگے چل کر اس سلسلۂ پراگندہ کو اپنے خاندان سے ملایا ہے اور لکھا ہے۔

از واپسیان ایں قافلہ بنائے من کہ قلمرو ماوراالنہر سمرقند شہر مسقط الراس
بود، چوں سیل کہ از بالا بہ پستی آید، بہند آمد، در دفتر سپہبد شاہ نشان
ذوالفقارالدولہ مرزا نجف خاں توقیع نوکری شاہش نوشتند، و بر پرگنہ
برات روزی وے و سپاہش نوشتند؛

پدرم پیغمبر پدر خویش داشت دہم در کارزار جاں گزاشت۔" (۳۶۷)

رباعی، غالب بگهر ز دودۂ زادشمم

زاں بہ صفا دم تیغ است دمم

چوں رفت سپہبدی زدم چنگ بہ شعر

شد تیر شکستۂ آبا قلمم"

مہر نیم روز کی اہمیت غالب کے بعض سوانحی کوائف اوران کے سیرت نامہ کے سلسلہ میں کلیدی ہے۔ اس میں غالب نے اپنے ذہن کی آوارہ خرامی و آزادروی کا ذکر بھی بڑے ادیبانہ رنگ اور شاعرانہ آہنگ کے ساتھ کیا ہے۔

با فر فرہنگ بیگانہ، و با نام ونتگ دشمن، بافرومایگاں ہم نشیں وبا او باش ہم رنگ پائے بیراہ بوے وزبان بےصرفہ گوے درشکست خویش گردوں را دستیزہ در آزار خویش دشمن را آموزگار پس از پنجاہ سالہ آوارگی کہ تیزی رفتار من از مسجد و بت خانہ گرد انگیخت و خانقاہ و میکدہ راسخن گستری آموخت۔

(۲۴۸)

ان عبارتوں کے حوالے آتے رہے ہیں لیکن ان کے اصل سرچشمے کی طرف رجوع کے مواقع کم ہی آئے ہیں۔ اسی ذیل میں لکھا ہے۔

"اگرچنانکہ بد در قوام بروزگار فرزانہ جمشید بودمے جمشید روزگار آفرما گفتے اگر بدانساں کہ شناخواں شہریارم فرخ فریدوں راستودمے، فریدوں چرخ دستارہ راگرد سرگردانیدمے۔

دراں انجمن کہ زردشت آتش افروخت وژند برآورد اگر من بدیں

دم آذرفشاں جادا شتمے آذرانہ بیم من زبانہ زنے"

آگے چل کر لکھا ہے اور کس قدر حسرت آگیں انداز میں اپنے کلام وکمال کی طرف اشارہ کیا ہے۔

گویند در عہد جہاں بانی حضرت صاحب قرآن ثانی بفرمان آں خسرودریادل صدرۂ بیم وزر ولعل وگوہر سنجیدہ من آں فواہم کہ دیدہ وراں راد ستوری دہی تا از کشش وکوشش نرنجند و یکبار گفتارمرا باکلام حکیم بسنجند" (۲۴۹)

باخذ فیض زعہد افزودم از اسلاف

کہ بود عام قدر سے ز پیشروان درگاہ

نزول من بجہاں بعد یکہزار و دویست

ظہور سعدی و خسرو بہ شش صد و پنجاہ

سخن ز نکتہ سرایان اکبری چہ کنی

چو من بخوبی عہد تو ام زخویش گواہ

بہ فن شعر چہ نسبت بمن نظیری را

نظیر خود بسخن ہم منم سخن کوتاہ

۔۔ یہ شاعرانہ تفاخر اور تعلیات سے تعلق کچھ ایسی غلط بھی نہیں۔

بعد ازاں احترام الدولہ عمدۃ الحکما حکیم احسن اللہ خاں بہادر کی مدح گستراۃ تحسین کی گئی ہے اور اپنے خطاب و خلعت پانے سے متعلق واقعہ کی تفصیل پیش کی ہے۔

بست و سوم شعبان سال یکہزار و دو صد و شصت و شش (۱۲۶۶ھ) با چہارم جون سال یکہزار و ہشت صد و پنجاہ عیسوی (۱۸۵۰ء) . . . .

. . . . کارپردازان شاہی بفرمان حضرت ظل الٰہی بخلعت خاص خاصم بردند دکاتم را بخلعت شش پارچہ آراستند، بسلامگاہم آوردند خداوند دنیا و دین، بداں دست گشتش آئیں کہ کف آں دست دریائیست کہ ہفت دریا کف اوست، . . . . . جیغہ و سرپیچ برسرم بست . . . . . و حمایل مروارید بگردنم آویخت۔"

یہی وہ فخر و مسرت سے بھرے لمحات تھے جن میں شاہ ذی جاہ نے ان کو خطاب نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خاں غالب، نظام جنگ سے نوازا اس کتاب کی نگارش کی فرمائش اور دربار شاہی سے پچاس روپے ماہوار وظیفہ بھی اسی وقت مقرر ہوا تھا۔

مرزا نے اس کی ترتیب و تالیف کے کام کو دو حصوں میں تقسیم کیا اور اس طرح کہ دونوں حصوں کے نام بھی الگ الگ ہوں۔ اس کی نگارش انہیں کے الفاظ میں ملاحظہ ہو۔

"نیرِ نخستیں، از آغاز روزگار تا روزگار۔ ۔ ۔ ۔ شہنشاہ آسماں خرگاہ ظہیر الدین بابر بادشاہ از گیتی ستانی آفتاب جلال الدین اکبر بادشاہ تا گیتی آرائی ایں شہنشاہ:-

نگارش نخستیں را، مہر نیم روز و گزارش دومین را ماہ نیم ماہ نام نہادہ ایم"(۲۴۳)

اصل مصادر تک رسائی اور غالب کے اپنے مسودات کی عدم موجودگی میں یہ فیصلہ آسان نہیں کہ غالب نے حکیم احسن اللہ خاں کے فراہم کردہ وسایل سے کیا معرف لیا ایک بات کا اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ انھوں نے کر اپنے انداز نظر کے مطابق اسے التقاط کے مرحلے سے گزارا اور اپنے ادبی اسلوب کی نگارش سے اسے آراستہ کیا۔

اس پر حیرت ہوتی ہے کہ انھوں نے یگوں کے تصور کو بھی اس تالیف میں قبول کیا اور چار یگوں کا ذکر کیا، ہند ایرانی اور ٹرز کو ہند تہذیب کے باہمی رشتوں کی جڑیں یہاں ایک ہی سرزمین میں پیوست نظر آتی ہیں تخلیق کائنات کا نظریہ عراق و عجم کی تہذیب سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے۔ خاص طور پر تصورات زمان و مکان کہ یگوں کا تصور انھیں سے وابستہ ہے اور ان کو وقت کے عصری پیمانوں سے منسلک کیا ہے۔

ہندو روایات کا اثر ذاتوں کی تقسیم اور درجہ بندی پر بھی اثر انداز ہوا ہے معاشرتی سطح پر یہ نیم نسلی اور نیم سماجی دائرے قریب قریب اسی طرح قدیم ایران اور یونان میں بھی تھے۔

براہمن چھتری ویش اور شدر کے علاوہ قدیم ہندوستان ویدوں کی ترتیب اور رشیوں کی عمروں اور زمانوں سے متعلق تصورات سے وابستہ کر کے دیکھ سکتے ہیں۔ کہ اس سلسلے میں کیا ہوا اور کیا نہیں ہو سکا۔ بہرحال غالب نے اپنی کتاب کے لیے جو منصوبۂ عمل تیار کیا تھا اس کا اظہار اس عبارت سے بھی ہوتا ہے جس کا تعلق ثنائے ایزدِ باری سے ہے۔

"۔ ۔ ۔ نہ بخشایندہ پرتوستان کشا نیدہ، مہر نیم روز نمایندہ و ماہِ نیم ماہ آرایندہ۔ و اگر کج از بلندی سپہر درمیان انداز ند، اندازہ داں داند کہ آں بلندی اساس مایۂ نمود کیست، و اگر مہر را بر روشنی انگشت نما سازند ایزد شناس شناسد کہ ایں الف آئینۂ شہود کیست؟

تاب کے یہاں فارسی نیا میزہ بہ عربی کی نگارشں کا جو رجحان تقریباً ربع صدی پیشتر بعض فارسی
کمتوبات میں ملتا ہے اسے یہاں نمایاں طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔

جہاں تک کتاب کی نگارشات کا سوال ہے۔ اس میں تخلیقِ کائنات کے ذیل میں
بعض قدیم اسرائیلی اور بابلی روایات کا پرتو موجود ہے۔ ہبوطِ آدم کا واقعہ بھی اپنی روایتوں
کے سلسلوں کے ساتھ اس کے صفحات میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اس نوع کی روایتیں احادیث
رسول بعض تفسیروں اور ان سے وابستہ بیانات میں مل جاتی ہیں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ حضرت آدم کو جب زمین پر اتارا گیا۔ تو وہ کوہِ سرندیپ پر اترے
سرندیپ جزیرہ لنکا کو کہتے تھے۔ اور بہت سی داستانوں میں اس کا ذکر آیا ہے۔ کہا جاتا ہے
کہ وہاں ایک ایسا پہاڑ بھی موجود ہے جس پر حضرتِ آدم کا نقش قدم موجود ہے۔

جنوبی ہندوستان میں اردگنار ایشور کا تصور بھی ملتا ہے ایک ایسے وجود کا جس میں عورت
اور مرد دونوں موجود ہیں۔ اور عورت بائیں طرف ہے۔ روایت یہ بھی ہے کہ حوا کو آدم کی بائیں پسلی
سے پیدا کیا گیا تھا۔

حوا آدم سے جدا ہوئیں تو دو سو برس تک بلکہ کہیں کہیں تو مدت کو اس سے بھی زیادہ
ظاہر کیا گیا ہے۔ دونوں پھر نہ مل سکے اور یہ ملاقات ہوئی تو وادیِ منیٰ میں ہوئی جس کے یہ
معنی ہیں کہ وہ دونو صدیوں ایک دوسرے سے جدا رہے اور جدائی میں زمین اور زمانی
دونوں فاصلے موجود تھے۔ وادیٔ منیٰ میں دونوں کی ملاقات قدیم عرب روایت سے ماخوذ
معلوم ہوتی ہے۔

حضرت آدم کی نسل کے پھیلنے سے متعلق جو ذکر آیا ہے۔ اس میں طوفانِ نوح کا بھی تذکرہ
ہے۔ جو در اصل وادیٔ دجلہ و فرات کی روایت ہے۔ حضرت آدم کے دو بیٹوں ہابیل قابیل
کے سلسلے میں اس دلچسپ حقیقت کی طرف بھی اشارہ ہے کہ آدم کا ان دونوں بیٹوں کا آپس
میں جنگ کرنا اور ایک کا دوسرے کو قتل کر دینا ایرانی روایات میں سے ہے۔ ان دونوں
بیٹوں کے ایرانی نام بھی لکھے ہیں یاجوج ماجوج اور ہاروت ماروت کا قصہ بھی اختصاراً موجود
ہے یہ بابلی روایات ہیں۔ جو صدیوں کا سفر طے کر کے عرب اسلامی روایتوں میں شامل ہوئیں۔

غالب نے یہ بھی ظاہر کیا ہے کہ پورا زمانۂ زندگی جس کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ وہ چار یُگوں میں تقسیم ہے ستیہ یگ، دواپر یگ، ترتیہ یگ، اور کل یگ۔ اس ہندوی روایت کا تعلق سینٹرل ایشیا کی روایت سے کیسے قائم ہوا کہ غالب نے اسے مغلوں کی تاریخ کے تمہیدی حصے میں داخل کیا۔

ذات پات اور ویدوں کا بھی ذکر آیا ہے۔ رشیوں اور منیوں کی زندگیاں بھی کہیں نہ کہیں اس میں حوالے کے طور پر آئی ہیں۔ غالب نے جس طرح اس مسئلے کو لیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ہند ایرانی روایات کی یکجائی کے قائل ہیں۔ اور عرب روایات کو وہ عقیدے کے طور پر مانتے ہیں۔ قدیم ایرانی روایتوں کے بھی کچھ حوالے ہیں اس کے بعد کی تاریخ وقت کے دھندلکوں میں چھپی ہوئی ہے۔ گمان غالب یہ ہے کہ حکیم احسن اللہ نے جو تاریخی مواد غالب کو فراہم کیا وہ اکبر نامے سے ماخوذ تھا اگرچہ غالب نے اس کا حوالہ نہیں دیا۔ کسی تاریخی تصنیف میں حوالوں کی جو اہمیت ہے وہ غالب کے پیش نظر نہیں حکیم احسن اللہ خاں نے بھی اس کو ضروری نہیں سمجھا ایک آدھ موقعہ پر یہ بھی لکھا ہے کہ کسی کتاب میں کہیں دیکھا تھا جس کا نام اب ذہن میں نہیں اب نہیں کہا جا سکتا کہ یہ جملہ غالب کا اپنا ہے یا حکیم احسن اللہ خاں نے لکھا ہے۔

قدیم تاتاریوں، تورانیوں اور منگولیائی اقوام سے وابستہ بعض نام اور سردارانِ قوم سے متعلق تذکرے اپنے اختصار کے باوجود ان مآخذ کی طرف اشارہ کرتے ہیں جن سے ہم پوری طرح اس کتاب کے حوالوں میں واقف نہیں ہوتے۔ ممکن ہے بعض روایتیں تزک تیموری، تزک بابری، بابر نامے اور مرکزی ایشیا کی بعض تاریخوں سے لی گئی ہوں جو زیادہ قرین قیاس بات ہے۔ لیکن غالب کو حوالہ دینے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی ان کا مقصد تو خوب صورت عبارتیں پیش کرنا تھا۔

غالب شاعری کے بغیر ادبی شعور سے نسبت کا کوئی اظہار کافی نہیں سمجھتے اس لیے اشعار کی بھی ایک بڑی تعداد اس میں موجود ہے اور ان میں وہ قطعات غزلیں اشعار قصیدہ اور دوسری شعری تخلیقات کہیں انتخاب کہیں التقاط کی شکل میں سامنے آتے ہیں۔ ایسے بھی کچھ اشعار مل سکتے ہیں جو غالب کے اپنے سوانح اور سیرت سے متعلق ہمارے مطالعے کے

بعض اہم گوشوں پر روشنی ڈالتے ہیں اور جو غالباً پہلی مرتبہ مہر نیم روز کے صفحات پر آئے ہیں۔

غرض کہ مہر نیم روز ایک اہم ادب پارہ ہے تخلیقی فارسی نثر کا نمونہ ہے اب یہ الگ بات ہے کہ وہ نامکمل ہے کہ اس کا دوسرا حصہ لکھا ہی نہیں گیا اور تاریخی روایتوں کے ماہر اسنادی حوالوں سے محروم ہے۔

ڈاکٹر صابر سنبھلی

اشعارِ غالب میں زندگی کی ترجمانی

کوئی شعر اس وقت تک زندگی کا ترجمان نہیں ہو سکتا، جب تک اس میں زندگی، انسانی فکر اور کیفیت قلب کی بھرپور عکاسی نہ ہو۔ افکار انسانی، کیفیات قلب اور واردات حیات ایسے مسافر ہیں جو مخصوص راستوں سے بار بار گزرتے رہتے ہیں۔ ایک بار ایک انسان کے دل پر جو گزرتی ہے وہ دوسروں کے دلوں پر بھی گزرتی ہے۔ جو بات ایک شخص کے ذہن میں آتی ہے وہ دوسروں کے ذہن میں بھی آتی ہے جو ایک شخص محسوس کرتا ہے اس کو دوسرے بھی محسوس کرتے ہیں۔ اس لیے جب بعض سچائیوں کا بیان شاعر شعر میں کر دیتا ہے تو ویسا ہی موقع آنے پر دوسرے بھی اس شعر کا اعادہ کرتے ہیں اور اس طرح کے اشعار ضرب المثل بن جاتے ہیں۔

یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ زیادہ تر ایسے اشعار ہی ضرب المثل بنتے ہیں جن میں استعاروں میں بات کہی گئی ہو کیونکہ ان کے معانی اور مفاہیم وسیع ہوتے ہیں۔ رمزیت اور اشاریت غزل کی جان ہیں اس لیے زیادہ تر غزلوں کے اشعار ہی ضرب المثل کا درجہ حاصل کرتے ہیں۔

اردو کے ہزاروں شاعروں میں غالب کے اشعار سے زیادہ ضرب المثل اشعار کسی شاعر کے کلام میں نہیں پائے جاتے۔ اور وہ بھی غزل کے تقریباً پونے پندرہ سو اشعار ہیں۔ یوں بھی غالب نے غزل کو تنگنائے کہا ہے مگر اس تنگنائے میں بھی انھوں نے وہ جوہر دکھائے جو ایک

ماہر کہتی ماں مرغزار میں دکھا سکتا ہے۔ میری نظر میں غالب کے عظیم شاعر ہونے کی یہ اہم دلیل ہے۔
باہمی گفتگو میں، تقریروں میں، تحریروں میں اور کبھی کبھی پڑھے لکھے لوگوں کے لڑائی جھگڑوں
میں بھی غالب کے ضرب المثل اشعار کو استعمال ہوتے دیکھا جا سکتا ہے۔ اور بسا اوقات ایسے
ضرب المثل شعر بھی گفتگو میں غالب سے منسوب کردیے جاتے ہیں جن سے غالب کی نسبت
بڑی مشکوک سی ہے۔

کامیابی ہو یا ناکامی، سکون ہو یا ذہنی انتشار، امید کی صورت ہو یا مایوسی کی حالت،
خوشی ہو یا غم، استعجاب ہو یا طبیعت کا بوجھ ہر موقع کی ترجمانی غالب کے اشعار سے ہو جاتی ہے
مجھے ایسے بہت سے مواقع پر اس طرح کے برجستہ اشعار سننے کا اتفاق ہوا ہے۔ دو تین دلچسپ
مثالیں پیش کروں گا

۱۔ غالباً ۱۹۷۰ء کی بات ہے اسلامیہ مسافر خانہ مراد آباد کے پھاٹک میں پڑی ہوئی بنچ پر
ایک بزرگ بیٹھے ہوئے تھے ان کے آس پاس ان کے دو تین ہم عمر اور بھی تھے۔ پہلے بزرگ
شاید کتابوں کے تاجر تھے۔ ان کے پاس بہت سی کتابوں کا ایک بڑا پیکٹ تھا چند کتابیں ہاتھ
میں تھیں اور ان کو سُتلی سے باندھنا چاہتے تھے۔ سُتلی شاید کچھ چھوٹی تھی اور ان کی منشاء کے مطابق
پیکٹ نہیں بن پا رہا تھا۔ شاید وہ سُتلی میں جوڑ لگانا نہیں چاہتے تھے۔ جب کئی بار طرح طرح سے
سُتلی لپیٹ کر باندھنے کی کوشش کر چکے اور کامیابی نہیں ملی تو ان کے منہ سے بے ساختہ نکلا ع

بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

ان کے دوسرے ہم عمر اس مصرع پر مسکرائے بغیر نہیں رہ سکے۔

۲۔ ۱۹۹۱ء کی بات ہے میں مراد آباد میں ایک سینٹر پر یوپی ایجوکیشن بورڈ الٰہ آباد کی انٹر
میجیٹ کی کاپیاں جانچ رہا تھا۔ اب یوپی میں یہ کام سینٹر پر جا کر ہی کرنا پڑتا ہے عام طور پر دس
دن یہ کام ہوتا ہے۔ اور جنگ میں کوئی اتوار کی بھی چھٹی نہیں ہوتی۔ ڈاکٹر امام مرتضیٰ نقوی ڈپٹی
ہیڈ ایگزامنر تھے۔ میں جنگ میں دو دن نہیں پہنچا۔ تیسرے دن گیا تو ڈاکٹر امام مرتضیٰ نقوی کالج کے
صحن میں ہی مل گئے مجھے دیکھتے گویا ہوئے۔ ع

بارے وہ دن کہاں رہا غالب!

میں اس حسب موقع مصرع کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔

۳۔ ٹھیک یاد نہیں غالباً ۱۹۸۶ء کی بات ہے میرا ایک طالب علم میرے پاس ایک صاحب کے لیے فارسی میں خط لکھانے کے لیے آیا۔ اس وقت ڈاکٹر عارف حسن خاں صاحب سے کسی اہم مسئلے پر گفتگو ہو رہی تھی میں گفتگو چھوڑ کر خط لکھنے بیٹھ گیا خط ذرا طویل ہو گیا شاید ڈاکٹر عارف حسن خاں صاحب کو یہ اچھا نہ لگا فوراً کہنے لگے۔ ع

نہ دے بات کو اتنا طول غالب مختصر کر دے

میرے منہ سے بے ساختہ وہ نکل گئی۔

اب تک تین قصے بیان ہوئے اور اتفاق سے تینوں قصوں میں اشعار کے بجائے مصرعے ہی استعمال ہوئے اور یہ حقیقت ہے کہ تعداد میں غالب کے اشعار سے زیادہ ان کے مصرعے استعمال ہوتے ہیں وجہ یہ ہے کہ دو مصرعوں میں ایک مصرع کے مقابلے میں فضا کچھ محدود ہو جاتی ہے۔ اس لیے بات کو مؤثر بنانے کے لیے اشعار کا سہارا بھی لیا جاتا ہے۔ مگر مصرعوں سے زیادہ کام نکلتا ہے اور اشعار کے مقابلے میں زیادہ آسانی کے ساتھ۔

یہاں غالب کے کچھ زبان زد یا ضرب المثل اشعار کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

اگر کوئی اپنے کیے پر پشیماں ہو تو اکثر یہ شعر پڑھا جاتا ہے

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ   ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

اگر کوئی لاکھ سمجھانے یا تعزیر کیے جانے پر بھی کسی فعل سے باز نہیں آتا تو یہ شعر پڑھتے ہیں۔

گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا یوں سہی   یہ جنون عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا؟

اگر کوئی کام توقع کے مطابق نہ ہو تو توقع کرنے والے حسرت و یاس کے ساتھ اور جن کے خلاف توقع کی جاتی ہے وہ طنزاً یہ شعر پڑھا کرتے ہیں۔

تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پرزے   دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

اگر ہزار سمجھانے پر بھی کسی کی سمجھ میں بات نہ آئے تو یہ شعر زبان پر آجاتا ہے۔

یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات   دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

بڑھاپے کی کمزوری کی ترجمانی اس شعر سے کی جاتی ہے۔

مضمحل ہو گئے قویٰ غالبؔ　　وہ عناصر میں اعتدال کہاں

یہ شعر کسی چالاک شخص کی سادگی میں چھپی ہوئی چالاکی کو ظاہر کرتا ہے۔

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا　　لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

اگر کسی کی دانائی میں شبہ ہو تو اسی غزل کا یہ شعر زبان پر آجاتا ہے۔

دیکھا اسد کو خلوت و جلوت میں بارہا　　دیوانہ گر نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں

ناشکری کی ترجمانی اس شعر سے ہوتی ہے۔

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالبؔ　　ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

گزرے ہوئے عیش و نشاط کو بھلانے کے لیے اس شعر سے تلقین کی جاتی ہے۔

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں　　اٹھیے کہ بس اب لذت خواب سحر گئی

جب کسی پاکیزہ اور اعلیٰ علمی کلام کے کچھ غیر پاکیزہ اور غیر علمی مدعی بھی ہوں تو اسی غزل کا یہ شعر لبوں پر جاری ہو جاتا ہے۔

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی　　اب آبروئے شیوۂ اہل نظر گئی

کسی دوست کے غلط مشورے سے اگر نقصان پہنچتا ہے تو اس کی ترجمانی ایمائیہ انداز میں اس طرح کرتے ہیں۔

تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لے ندیم　　میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے

عمر کی آخری منزل میں جب کوئی حال زار کی پرسش کرتا ہے تو یہ شعر بے ساختہ زبان سے ادا ہوتا ہے۔

ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام　　ایک مرگ ناگہانی اور ہے

انتہائی مایوسی کا ترجمان مرزا صاحب کا یہ مطلع ہے۔

کوئی امید بر نہیں آتی　　کوئی صورت نظر نہیں آتی

اہل قلم کے جذبات کی ترجمانی اس شعر سے ہوتی ہے۔

لکھتے رہے جنوں کی حکایات خونچکاں　　ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

اگر خوش حالی کو چھپانا ضروری سمجھا جاتا ہے تو یہ شعر پڑھتے ہیں۔

ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منھ پر رونق　　وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

کوئی سخت یا تلخی آمیز بات کہنے کے لیے بھی اس شعر سے بات کرتے ہیں۔

دیکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی سے معاف　　آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

جب اپنے قول سے پھرنا چاہتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ جو کچھ کہا ہے اس کے اثرات برے ہو سکتے ہیں تو اس شعر کے مفہوم میں پناہ لیتے ہیں۔

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ　　کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

کسی کی اہل کوئی اور کجو اس کی جانب بھی اسی شعر سے اشارہ کرتے ہیں۔
جب کسی کو کہیں سے ذلیل کرکے نکالا جائے اور اس بات کو طنز کے طور پر بیان کرنا ہو تو مرزا غالب کے اس شعر سے بہتر انداز بیان نہیں میسر آتا۔

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن　　بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

اور اس سے بہتر دعائیہ شعر تو شاید اردو میں کہا ہی نہیں گیا۔

تم سلامت رہو ہزار برس　　ہر برس میں ہوں دن پچاس ہزار

غالب کے یہ وہ اشعار ہیں جو اکثر تحریر و تقریر میں استعمال ہوتے ہیں۔ جو اشعار کثر استعمال میں ہیں وہ بغیر کسی تشریح کے ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

کس سے محرومیِ قسمت کی شکایت کیجیے　　ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب　　تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں

وہ آئے گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے　　کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید　　مسجد ہو مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے　　خوش ہوں کہ میری بات سمجھنا محال ہے

قطع کیجے نہ تعلق ہم سے　　کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

اگ رہا ہے در و دیوار پہ سبزہ غالب　　ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

دل سے تری نگاہ جگر میں اتر گئی　　دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی

کوئی دن گر زندگانی اور ہے　　ہم نے اپنے دل میں ٹھانی اور ہے

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں　　ورنہ کیا بات کر نہیں آتی !

کرتے ہیں۔

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ

اظہار مقصد ومدعا کے لیے یہ مصرع زبان زد عام ہے —

منظور ہے گزارش احوال واقعی

عاجزی اور انکساری کا اظہار اس طرح ہوتا ہے ؎

یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے

جب کسی کے خلاف کچھ رمزیہ انداز میں کہا جائے تو اپنے بچاؤ کے لیے اس مصرع کا سہارا لیتے ہیں۔ ؎

روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ

اپنی بات کی سچائی کے اظہار کے لیے یہ مصرع ادا کیا جاتا ہے ؎

کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

اگر بات کہنے اور نہ کہنے دونوں صورتوں میں خرابی ہو تو دلی کیفیت کا اظہار اس طرح کرتے ہیں۔

گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

کسی کی حمایت میں خود کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے اس مصرع سے مدد لی جاتی ہے۔

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں

ایسے مصرعے جن کا استعمال تحریر وتقریر میں مندرجہ بالا مصرعوں کی بہ نسبت کم ہوتا ہے یہاں بغیر کسی تشریح کے درج کیے جاتے ہیں۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا

صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

جو تیری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

بلا سے جان ہے غالب اس کی ہر بات

حق تو یوں ہے کہ حق ادا نہ ہوا

درماندگی میں غالب کچھ بن پڑے تو جانوں
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر
بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن
کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل
حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں
روئیے زار زار کیا کیجیے ہائے ہائے کیوں
وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے
گری تھی جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو
مسجد کے زیرِ سایہ خرابات چاہیے
تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیے
بس چپ رہو ہمارے بھی منہ میں زبان ہے
اٹھ گئی دنیا سے رسم و راہِ یاری ہائے ہائے
خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے
مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے ؟
ہے یہی بہتر کہ لوگوں میں نہ چھیڑے تو مجھے
کام اچھا ہے وہی جس کا مآل اچھا ہے
ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نہ ستایش کی تمنا نہ صلے کی پروا
خدا کے واسطے داد اس جنونِ شوق کی دینا
پُر ہوں شکوے سے یوں راگ سے جیسے باجا

اک ذرا چھیڑیے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے
خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
عشق نے غالبؔ نکما کر دیا
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے
کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے
ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے
گرواں نہیں یہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں
کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے
سفینہ چاہیے اس بحرِ بیکراں کے لیے
صدائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے

یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ مرزا صاحب کے یہی اشعار اور مصرعے زبان زدِ خاص و عام نہیں ہیں بلکہ حسب ضرورت دیگر اشعار و مصارع بھی بطور ضرب المثل استعمال کے قابل ہیں مضمون کو طوالت سے بچانے کے لیے ان کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔

ان اشعار و مصاریع سے یہ نتیجہ نکالنا بے جا نہ ہوگا کہ مرزا صاحب واقعی ایک عظیم شاعر تھے اور ایسا مفکر شاعر اقبال کے علاوہ دوسرا نظر نہیں آتا۔ اقبال کے یہاں فکر کی کمی نہیں لیکن ان کی فکر عام ذہن سے ایسی ہم آہنگ نہ ہو سکی جیسی مرزا غالب کی فکر نہ صرف ہم آہنگ ہو گئی بلکہ اس نے ذہنوں پر قبضہ ہی جما لیا۔

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن

منشی نبی بخش حقیر کے نام

غالب کے پانچ خطوں کی متنی تنقید

اگلے صفحات میں منشی نبی بخش حقیرؔ کے نام غالب کے پانچ نادر خطوں کا اعتباری اور استنادی متن پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ خط لگ بھگ ڈیڑھ سو برس پہلے کے ہیں، ترتیب وار ان کا زمانۂ تحریر یہ ہے،

غالب کا پہلا خط ؛ مورخہ ۱۰، مارچ ۱۸۴۸ء

دوسرا خط؛ ۴، جون ۱۸۴۸ء

تیسرا خط ؛ ۲۷، جنوری ۱۸۵۱ء

چوتھا خط ، ۱۲، مئی ۱۸۵۲ء

پانچواں خط: ۳۱، دسمبر ۱۸۵۲ء

غالبیات میں منشی نبی بخش حقیر کا نام غیر معروف نہیں۔ وہ کول (علی گڑھ) کے سررشتہ دار اور محلہ تاج گنج، آگرہ کے رہنے والے تھے۔ وہ فارسی نظم و نثر اور اردو شعر و ادب کا بڑا اچھا ذوق رکھتے تھے۔

غالبؔ، منشی نبی بخش حقیر کی سخن فہمی کے حد درجہ مداح تھے۔ فروری ۱۸۴۹ء کے ایک فارسی خط بنام مرزا ہرگوپال تفتہؔ میں غالبؔ نے حقیرؔ کے بارے میں لکھا ہے کہ :

"میں حیران ہوں کہ اس فرزانۂ یگانہ یعنی منشی نبی بخش کو کس درجے کی سخن فہمی اور سخن سنجی عنایت ہوئی ہے . . . . . میں شعر کہتا ہوں اور شعر کہنا جانتا ہوں مگر جب تک میں نے اس بزرگوار کو نہیں دیکھا یہ نہیں سمجھا کہ سخن فہمی کیا چیز ہے اور سخن فہم کس کو کہتے ہیں . . . خدا نے حسن کے دو حصے کیے، آدھا یوسف کو دیا اور آدھا تمام بنی نوع انسان کو ـــــ کچھ تعجب نہیں کہ فہم سخن اور ذوقِ معنی کے بھی دو حصے کیے گئے ہوں اور آدھا منشی نبی بخش کے اور آدھا تمام دنیا کے حصے میں آیا ہو۔"

حقیر نے غالب سے اپنے کلام پر اصلاح لی، خود غالب نے ۸، مارچ ۱۸۵۵ء کے اپنے ایک خط میں اپنی دو تازہ رباعیاں انھیں بھیجیں اور کہا کہ "انھیں بنظر اصلاح دیکھو" غالب کی جانب سے حقیر کی سخن فہمی کے لیے یہ بہت بڑا اعزاز اور اعتراف ہے۔ ۱۸۶۰ء میں حقیر کا انتقال ہوا تو غالب نے حقیر کا قطعۂ تاریخ وفات بھی لکھا۔

میرے ذخیرۂ غالبیات میں میر افضل حسین عرف میرن صاحب (متوفی ۲۹ جنوری ۱۹۱۴ء) کی قلمی بیاض موجود ہے جس میں میرن صاحب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی غالب اور مجروح کے کچھ خطوں کی نقلیں محفوظ ہیں ـــــ منشی نبی بخش حقیر کے نام غالب کے ان پانچ نادر خطوں کے لیے میرا ماخذ میرن صاحب کی یہی قلمی بیاض ہے۔

حقیر کے نام تین خط (نمبر ۱، ۲ اور نمبر ۴) "نادراتِ غالب" مرتبہ آفاق حسین آفاق طبع اول، کراچی ۱۹۴۹ء میں شامل ہیں ـــــ دو خط (نمبر ۳ اور نمبر ۵) "نادراتِ غالب" طبع دوم، کراچی ۱۹۹۲ء میں پہلی بار شامل ہوئے۔

سید آفاق حسین آفاق دہلوی نے "نادراتِ غالب" کی پہلی طباعت (۱۹۴۹ء) میں اپنے مرتب کردہ خطوں کے ماخذ کا تعارف نہیں کرایا تھا، کتاب کی دوسری اشاعت (۱۹۹۲ء) میں انھوں نے میرن صاحب کے قلمی دو مخطوطوں کو "نادراتِ غالب" کی اساس اور بنیاد بتایا ہے لیکن "نادراتِ غالب" کی دونوں اشاعتوں میں بخطِ میرن، حقیر کے نام غالب کے خطوں کا

کوئی عکس شامل نہیں ہے۔

اگلے صفحات میں میرن صاحب کے قلم سے لکھے ہوئے غالب کے خطوں کی نقلوں کی بنیاد پر ان کا متن ضروری توضیحات کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے ــــ آفاق دہلوی کے پیش کردہ متن، اور میرے پیشِ نظر میرن صاحب کے مکتوبہ خطوط کے جزوی فرق اور اختلاف کو ذیلی حواشی میں ظاہر کر دیا گیا ہے۔

یہاں، ایک دوسرے موقع پر کہی ہوئی بات کو دہراتا ہوں کہ غالب کے اردو خطوں کی ترتیب و تدوین کا سب سے زیادہ جامع اور وقیع کام ڈاکٹر خلیق انجم کے مرتب کردہ "غالب کے خطوط" کی صورت میں ہمارے سامنے آیا ہے۔ یہ کام چار جلدوں میں مکمل ہوا "غالب کے خطوط" کی جلد سوم (کراچی ۱۹۹۰ء) میں منشی نبی بخش حقیر کے نام غالب کے ستر خط شامل اشاعت ہیں (ص ۱۰۸۷ ــــ ۱۱۷۷)۔

اگلے صفحات میں حقیر کے نام غالب کے جو پانچ خط محفوظ کیے جا رہے ہیں، ان میں سے دو خط (نمبر ۳ اور ۵) مورخہ ۷، ۲، جنوری ۱۸۵۱ء اور ۳۱، دسمبر ۱۸۵۲ء ــــ ڈاکٹر خلیق انجم کے مرتب کردہ خطوط میں بھی موجود اور شامل نہیں ــــ اس سے ان خطوں کے نادر و نایاب ہونے کا کچھ اندازہ اور تخمینہ لگایا جا سکتا ہے۔

پہلا خط

صاحب بندہ!

میاں نسیم اللہؒ یہاں آئے تھے اور وہ حکمت، حکیم امام الدین خاںؒ سے اور فلسفہ، مولوی مشیرالدین سے پڑھتے تھے۔ ناگاہ از روئے اضطرار کول کو چلے گئے۔ وقتِ وداع کہتے تھے کہ والد کی بیماری کی خبر، وطن سے آئی ہے، ناچار میں جاتا ہوں اور کتب درسی یہیں چھوڑے جاتا ہوں، بعد حصول افاقتِ مریض پھر آؤں گا۔ آج تک وہ معاودت کر کر نہیں گئے۔ اب از راہِ مہربانی ان کا حال اور ان کے والد ماجد کی صحت و مرض کا حال،

منشی ہرگوپال سے معلوم کرکے مجھ کو لکھیے، ضرور ضرور فقط

(۳۔ ربیع الآخر ۱۲۶۴ھ، ۱۰۔ مارچ ۱۸۴۸ء)

دوسرا خط:

بندہ پرور

بہت دنوں سے میرا دھیان آپ میں لگا ہوا تھا، بارے آپ کے خط آنے سے بہت خوشی اور فرحت حاصل ہوئی۔ آپ نے کیا لکھا ہے کہ میں بداؤں کے حکیم کی دوا کر رہا ہوں، تیری بتائی ہوئی دوا ابھی نہیں کر سکتا۔

آپ غور تو کیجیے۔ میں نے تو دوا نہیں بتلائی۔ ایک ترکیب، پانی کے مدور کرنے کی عرض کی ہے۔ صاحبان امراضِ سوداویہ مزمنہ کو اس پانی کا پینا نفع کرتا ہے، اور نفع اس کا برسوں میں ظاہر ہوتا ہے اور اس پانی کے استعمال کے زمانے میں دوا کو ممانعت نہیں۔ جو دوا چاہیے کھائیے جو غذا چاہیے تناول فرمائیے۔

صرف یہ پانی، کب دوا ہو سکتا ہے۔ آپ شوق سے اس پانی کو شروع کیجیے اور دوا طبیب کی بدستور کیے جائیے اور غذا موافق طبیب کے کھائے جائیے۔ پانی جب پیجیے تب یہی پانی پیجیے۔ جہاں جائیے آدمی کو حکم کیجیے کہ ایک صراحی اس پانی کی ساتھ لیے ہوئے اور یہ بھی آپ کے خیال میں رہے کہ اگر ناگاہ کوئی ضرورت لاحق ہو اور یہ پانی موجود نہ ہو، اور پانی بحسب ضرورت پی لیویں تو بھی محل اندیشہ نہیں ہے۔

منشی ہرگوپال ستودہ خصال کے باب میں جو کچھ لکھا تھا معلوم ہوا ——— خدا کی قسم مجھ کو ان سے ہرگز ملال نہیں ہوا ——— بلکہ مجھ کو یہ غم تھا کہ کہیں وہ اپنی غلط فہمی سے ملول نہ ہوئے ہوں۔ بہرحال اس گفتگو میں منشی صاحب نے ایک فقرہ اپنی مدح میں بڑھوا لیا یعنی سپہر گن را ماہ دو ہفتہ ———

آپ ان سے میرا سلام کہیے گا اور یہ کہیے گا کہ میں تم سے راضی اور خوش ہوں۔

یہ چاہتا ہوں کہ تم مجھ سے راضی رہو اور اپنا خدمت گار سمجھو ــــــ رباعیاں، آپ کی بھی ہوتی میرے پاس موجود ہیں، بعد اصلاح کے آپ کے پاس بھیج دوں گا، گھبرایئے نہیں اصلاً خاطر جمع رکھیے۔

مغاں شیوہ بانواں : بانو، بادشاہ کی بی بی کو کہتے ہیں اور الف نون جمع کا ہے یعنی بی بیاں۔ مغاں شیوہ کی وہ ترکیب ہے جو گل رخسار اور ماہ جبیں کی ترکیب ہے، یعنی وہ شخص کہ جس کا رخسار مانند گل کے ہے اور پیشانی چاندی سی ہے، اور شیوہ مغوں کا سا ہے۔ مغ، آتش کدہ کا کارفرما اور چونکہ بادشاہانِ پارس آتش پرست تھے تو وہ خدمت آتش کدہ کی، عمائد و اکابر و اشراف و علماء کو دیتے تھے۔ اور شراب کو چونکہ وہ بہت عمدہ چیز اور پاک اور متبرک جانتے تھے اور ہر سفلہ اور فرومایہ کو نہیں پینے دیتے تھے، یہ بھی مغوں کی تحویل میں رہتی تھی تاکہ وہ جس کو لائق سمجھیں ادنیٰ جانیں، اس کو بقدر مناسب دیں۔

بہرحال وہ لوگ یعنی مغ بہت خوب صورت اور خوش سیرت، عالم فاضل، طرحدار، بذلہ گو، حریف ظریف ہوا کرتے تھے۔ اس راہ سے پارسیوں نے مغاں شیوہ مدح معشوقوں کی ٹھہرائی ہے یعنی چالاک اور خوش بیان اور طرحدار اور ترچھا اور بانکا مانند مغوں کے اور اس کا نظیر ہندوستان میں یہ ہے کہ جیسے کو بیگم ــــــ یا عمدہ عورت کو کہیں کہ فلانی بیگم یا فلانی عورت میں کتنا ڈومنی پن نکلتا ہے۔

قصہ مختصر، مغاں شیوہ اس محبوب کو کہتے ہیں کہ جو بہت گرم اور شوخ اور چنچل حرکات اور چالاک ہو، مغاں شیوہ بانواں، مغاں شیوہ دلبراں، مغاں شیوہ شاہداں، خواہی جمع خواہی بہ افراد ترکیب مقلوب ہے یعنی بانوئے مغاں شیوہ یا بانوانِ مغاں شیوہ قس علیٰ ہذا اور انہیں الفاظ قصیدہ مدح جناب سیدالشہداء میں قطعہ ہے ؎

معذوری ازرحادثہ رنجی ازاں کہ نیست
ازنازکی بطبع گوارا گریستن
مسکین ندیدہ زمغاں شیوہ بانواں
در خوابگاہ بہمن ودارا گریستن

حاصل معنی یہ کہ شاعر اپنے نفس کو یا کسو اور کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ تو معاف ہے اگر وقایع و حوادث دہر سے آزردہ ہوتا ہے، اس واسطے کہ تو بہت نازک ہے اور گریہ وزاری کی شدت کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

یہ بیان بسبیل طعن و تعریض واقع ہے۔ جیسا کہ دوسری بیت میں کہتا ہے کہ اے شخص! تو نے خواب گاہ بہمن و دارا میں پریزاد و نازک دمغاں شیوہ بیگمات کو روتے پیٹتے نہیں دیکھا کہ کیسے بادشاہان جلیل القدر کی بی بیاں تھیں اور کیسی طرح دار اور نازک کہ جیسے شمع ہوتے ہیں اور پھر ان پہ کیا مصیبتیں گزریں۔ ظاہرا تو نے پڑھ کتب تواریخ میں نہیں دیکھا ـــــ اور وجہ بہمن و دارا کے نام خاص کی یہ ہے کہ بہمن ابن اسفندیار کو آغاز شباب میں اژدہا نگل گیا اور دارا ابن داراب ابن بہمن عین جوانی میں سکندر کی لڑائی میں اپنے دو مصاحبوں کے ہاتھ مارا گیا ہے۔

والسلام والاکرام

اسداللہ

نگاشتہ یکشنبہ چہارم جون ۱۸۴۸ء

تیسرا خط

بھائی صاحب و قبلہ کو بندگی پہنچے۔ ایک خط آپ کا آگے آیا تھا اور ایک پرسوں آیا لڑکوں کی تندرستی کی طرف سے خاطر جمع ہوئی۔ پروردگار ان کو بڑی بڑی عمریں اور تندرستیاں اور دولت مندیاں عطا کرے۔

اپنا احوال تم، میں خوب جانتا ہوں کہ بہت مختصر لکھتے ہو۔ سر میں تمہارے کیا ہے؟ کوئی جراحت، کوئی خراش ـــــ کچھ نہ کچھ تو ہے۔ کیا کروں بھائی سوائے دعا کے کچھ مقدور نہیں۔ بندہ عاجز ہے۔ آفریدگار تم پر رحم کرے۔ میری اندوہناکی کا خیال نہ کرو۔ اپنا حال جو کچھ ہو لکھ بھیجا کرو۔ میں غم کا پتلا ہوں، مجھ کو غم سے ضرر نہیں۔ یہ غضب ہے کہ مجھ کو حال نہ

علوم ہو، اس کی تاب نہیں لا سکتا، تم کی تاب لا سکتا ہوں۔

اب میرا حال سنو ـــــ جب بادشاہ کا نوکر ہوا تو میں نے سفلگی نہیں کی۔ خرچ نہ
بڑھایا، وہ ہی تین آدمی بدستور رہے۔ کہار نوکر نہیں رکھے، لباس میں تکلف نہیں کیا
نہ ہی فقیرانہ لباس رکھا مگر کیا ہوا کہ قریب سو روپے کے خلعت وخطاب کے نذرانے
میں صرف ہوا۔ اور دوسرے یہ ہوا کہ مجھ پا شکستہ گوشہ نشین کو چوتھے پانچویں قلعے جانا پڑا۔
س سواریاں مہینے کی ہوئیں تو پانچ، اور بارہ ہوئیں تو چھ روپیہ مہینا دینا پڑا ـــــ کاغذ
ور قلم سیاہی کا کچھ صرف سمجھ لیجیے۔ عیدین کی، نوروز کی نذریں بیگم صاحبہ کی، ولی عہد کی
س کو سمجھ لیجیے ـــــ بادشاہ کی نذر تو اپنا کلیجہ کھرچا اور قصیدہ دے دیا مگر آٹھ روپے
ن دونوں صاحبوں کے ضرور۔ اودلش آیا، خاصہ آیا اس کا انعام، پھولوں کا ہار آیا اس کا
نعام، یہ جزویات علاحدہ۔

انگریزی تنخواہ کا حال سنیے ـــــ اکسٹھ روپے آٹھ آنے (اعہ/۸) اس میں سے
یک روپیہ (عہ) مختار کار کا اور ۳۳ (سہ) محل کے، ۳۴ (للعہ) گئے ـــــ ۲۷ روپے
آٹھ آنے (امہ/۸) بچے۔ اس میں فقیر کے تکیے کا خرچ ـــــ سقا دھوبی، حجام، خدمت گار
ناکو، کوئلے، کپڑا، قرض کی اقساط، جو جو کچھ تصور کیجیے وہ اس میں۔

جولائی ۱۸۵۰ء کے مہینے سے بادشاہ کا نوکر ہوا۔ پندرہ روپے (ملعہ) مہینا ایک دوست
سے ہر مہینے قرض لیا۔ اب دسمبر ۱۸۵۰ء تک میری ششماہی پوری ہوئی۔ جنوری ۱۸۵۱ء کی
شمار ہوئیں تاریخ تین سو مجھ کو ملے۔ نوے (نعہ) تو وہ کٹ گئے۔ دو سو دس آئے۔ سو گھر
بن دیے ایک سو دس روپیہ کیوں کر بنا لوں۔

قرض داران متفرق مجھ کو کھا گئے ـــــ مثلاً بیس روپے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ تین سو
ئے۔ ہمارے بیس نہیں دیے، علیٰ ہذا القیاس، دس والا اور سو والا اور پانچ والا یہی
کہتا ہے۔ اور حق بجانب ان کے ہے[28] ـــــ ان کا گھاؤ راں جانے یا راؤ (ن) ـــــ
وہ کیا جانیں کہ تین سو کیا ہوئے؟ بہرحال اِن دِنوں میں عوارضِ جسمانی سے بالکل فارغ
ور آلامِ روحانی میں اس طرح گرفتار ہوں کہ سانس لینا دشوار ہے ـــــ یہ قصہ تو ختم ہوا۔

اب آپ میرے سوالات کا جواب لکھیے۔ میاں تفتہ جو اجمیر گئے ہیں، کیوں گئے ہیں؟ کہیں سے مجھ کو اس بندۂ خدا نے خط نہیں بھیجا۔ اگر تم کو کوئی خط آیا ہو تو مجھ کو اطلاع دو۔ منشی جانی بانکے رائے نے جو اوراق تواریخ منگوائے ہیں۔ بے واسطۂ غیر تم سے منگوائے ہیں یا بتوسط منشی ہرگوپال تفتہ؟ — کیا تمہاری بھی جانی بانکے رائے سے ملاقات ہے یا نہیں؟ مجھ سے اس سے ایک دن جارج پونف صاحب، ایک میرا دوست ہے اس کے ہاں ملاقات ہوئی تھی۔ ایک ملاقات میں کیا حال معلوم ہو۔ آیا وہ شخص کچھ سخن فہم بھی ہے یا یوں ہی بطریق ہوس وہ نثر منگائی ہے۔ اب جانی بانکے رائے کہاں ہے؟ آگرہ میں یا بھرت پور میں ان سب باتوں کا جواب لکھیے — جو معلوم (نہ) ہو اس کو کہیں سے معلوم کر کے لکھیے اور جلد لکھیے — لڑکوں کو دعا پہنچے۔

بھائی، دن بھر مجھ کو ہجوم تقاضائے بازاری سے فرصت نہیں۔ خط تم کو رات کو لکھتا ہے، سراسیمہ وار — ہائے ہائے داد دینا کہ کس حال میں ہوں اور کیا نثر لکھ رہا ہوں۔ کہ تو یوں ہے کہ بڑا بے حیا ہوں۔ ہمایوں کا حال جو، اب دیکھو گے تو، پچھلی نثروں کو بھول جاؤ گے۔ حالانکہ ان نثروں نے "پنج آہنگ" کی نثریں بھلا دی ہوں گی

در جنوں بیکار نتوان زیستن

آتشم تیز است و دامان میزنم

والسلام

نگاشتۂ شب دوشنبہ و فرستادہ صبح دوشنبہ، ۲۸ جنوری ۱۸۵۸ء

چوتھا خط

بھائی صاحب

آگے اس سے، دو خط تم کو بھیج چکا ہوں۔ ایک بطریق ڈاک اور ایک حکیم الٰہی بخش کے ہاتھ۔ کل میں قلعے سے آتا تھا، راہ میں مرزا حسن علی بیگ ملے۔ انھوں نے کہا کہ کل

جاؤں گا، یعنی آج ـــــ اور یہ تم کو معلوم ہے کہ کل پنجشنبہ تھا ۲۹، رجب اور ۲ مئی[۴۵] کی اور آج جمعہ ہے۔

غرض میں نے[۴۶] کل رات کو پاکمل کا مربہ مرتبان میں رکھ کر[۴۷] اس کو موم جامے سے بند کیا اور اس پر اپنی مہر کر کر کلو کے ہاتھ مرزا کے پاس بھجوا دیا۔ کلو ان کو مربہ دے کر رات کو اپنے گھر رہا، اب صبح ہوئی اور کلو آیا تو اس نے بیان کیا کہ مرزا حسن علی بیگ نے بندگی کہی ہے اور کہا ہے کہ میں کل نہ جاؤں گا، پرسوں جاؤں گا اور مرتبان کو اچھی طرح احتیاط سے لے جاؤں گا۔

حضرت کو معلوم رہے کہ حکیم احسن اللہ خاں صاحب[۴۸] کی عنایت سے مربہ ہاتھ آگیا ہے، ورنہ اکثر سائلوں کو سرکار شاہی سے اچار ملتا ہے، مربہ نہیں ہاتھ آتا ـــــ اب، اختیار مرزا صاحب کا ہے[۴۹] جب چاہیں جائیں اور جس طرح چاہیں اس کو لے جائیں، بندہ بری الذمہ ہے۔

اجزائے تواریخ تیموریہ[۵۰] لکھے جاتے ہیں اور قاعدہ یہ ہے کہ جو کوئی جزو لکھا جاتا ہے، وہ میرے پاس آتا ہے، میں اس کے حاشیے پر معنی لغات لکھتا جاتا ہوں، چنانچہ تین جزو لکھ چکا ہوں، یعنی تین جز لکھے ہوئے[۵۱] میرے پاس آچکے ہیں اور میں ان کا حاشیہ لکھ چکا ہوں جب سب اجزا آچکیں[۵۲] گے۔ بسبیل پارسل ارسال کروں گا۔ چھوٹی تقطیع، خوش آیندہ پر گیارہ سطر کے مسطرے[۵۳] لکھے جاتے ہیں۔ یقین ہے کہ گیارہ بارہ جزو ہوں گے۔ گویا دو ثلث تحریر باقی ہے۔ خدا کرے جلد تمام ہو تاکہ میری شرمساری رفع ہو۔

جولا سنگھ[۵۴] دوبار میرے پاس آیا۔ میں نے رقعہ لکھ کر ایک ایسے شخص کے پاس بھیج دیا کہ وہ مرجع (ہے) اس محکمے کے اہل مقدمہ کا ـــــ اگر حاجت ہوگی اور جولا سنگھ[۵۵] خواہش کرے گا تو میں اس کو مولوی صاحب کے بھی سامنے کر دوں گا۔

تم مجھ کو حکیم الٰہی بخش کا حال لکھو کہ وہ تم سے ملے اور سکندرہ راؤ کو گئے؛ اور تفتہ[۵۶] کا حال لکھو کہ یہیں ہیں یا اکبرآباد کو گئے۔ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ آج شام تک تمہارا خط میرے پاس آجاوے[۵۷]۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ صبح کو میں نے خط، ڈاک میں بھیجا

ہے اور شام کو ہرکارے نے تمہارا خط لاکر دیا ہے۔
یہاں عجب اتفاق ہے کہ جیٹھ کا مہینا ہے اور روز مینہ برستا ہے اور جاڑا پڑتا ہے لوگ شب کو رضائیاں اوڑھتے ہیں اور میں لحاف۔ نوروز سے یہی صورت دیکھتا ہوں کہ دن رات مینہ برستا ہے اور سردی کی شدت ہے۔ دو دن گرمی پڑی اور تیسرے دن مینہ آیا اور دو چار دن بارش رہی۔ تم بھی لکھو کہ تمہارے شہر میں کیا عالم ہے!
سنا ہوگا تم نے کہ مومن خاں مر گئے۔ آج ان کو مرے ہوئے دسواں دن ہے۔ دیکھو بھائی! ہمارے بچے مرے جاتے ہیں۔ ہمارے ہم عمر مرے جاتے ہیں۔ قافلہ چلا جاتا ہے اور ہم پا در رکاب بیٹھے ہیں۔
مومن خاں میرا ہم عصر تھا اور یار بھی تھا۔ بیالیس تینتالیس یعنی چودہ چودہ پندرہ پندرہ برس کی میری اور اس مرحوم کی عمر تھی کہ مجھ میں اس میں ربط پیدا ہوا۔ اس عرصے میں کبھی کسی طرح کا رنج و ملال درمیان نہیں آیا ــــ حضرت! چالیس چالیس برس کا دشمن بھی نہیں پیدا ہوتا، دوست تو کہاں ہاتھ آتا ہے۔ یہ شخص بھی اپنی وضع کا اچھا کہنے والا تھا، طبیعت اس کی معنی آفریں تھی۔
آج آپ نے دریافت کیا ہوگا کہ جی چاہا تم سے باتیں کرنے کو ــــ یہ میں باتیں کر رہا ہوں، خط نہیں لکھتا ــــ مگر افسوس کہ اس گفتگو میں وہ لطف نہیں جو مکالمۂ زبانی میں ہوتا ہے، یعنی میں ہی بک رہا ہوں، تم کچھ نہیں کہتے۔ وہ بات کہاں، کہ میری بات کا تم جواب دیتے جاؤ اور تمہاری بات کا میں جواب دیتا جاؤں۔
کیا کروں عجب طرح سے زندگی بسر کر رہا ہوں۔ میری حالت سراسر میرے خلاف طبیعت ہے۔ یہ بیچ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ چلتا پھرتا رہوں۔ مہینا بھر وہاں، اور دو مہینے وہاں ــــ اور صورت یہ کہ گویا شکنجے میں بندھا ہوا ہوں کہ ہرگز جنبش نہیں کر سکتا۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ ــــ کاغذ تمام ہو گیا اور ہنوز باتیں بہت باقی ہیں۔
اس خط میں میں نے اپنے بچوں کو بھی دعا نہیں لکھی، بھائی تم کہہ دینا اور اپنے خط میں ان کی خیریت و عافیت لکھنا۔

زیادہ والسلام از
غالب
روز دوشنبہ

یکم شعبان ۶۸ ہجری]
۲۱ مئی ۱۸۵۲ء

پانچواں خط

بھائی صاحب

تم غزل کی تعریف کرتے ہو اور میں شرماتا ہوں۔ یہ غزلیں کاہے کو ہیں، پیٹ پالنے کی باتیں ہیں، سو بھی روٹیاں نہیں، دال سالن ــــ یعنی میرے فارسی کے وہ قصیدے کہ جن پر مجھ کو ناز ہے، کوئی ان کا لطف نہیں اٹھاتا مگر بطریقِ اذعان کہ یہ شخص فارسی خوب کہتا ہے۔ دادِ سخن کہاں اور ادراکِ پایۂ معنی کہاں۔

تاریخ تمر پان سات جزو جو آپ کے پاس بھیجے ہیں میری خاطر نہ کیجیے، انصاف سے کہیے کہ یہ نثر کہیں اور ہے؟ اور پھر اس نثر کا کوئی مشتاق نہ ہو اور کوئی مجھ سے خواہش نہ کرے ہر چند مجھ کو اس میں آسائش ہے اور قالبِ نثر میں ریختہ گری نہیں کرنی پڑتی مگر متاع کے حسن کی داد نہ ملے یہی تو غضب ہے

خیر، اب قدردانی منحصر کس بات پر ہے کہ گاہ گاہ حضرت ظل سبحانی فرما بیٹھتے ہیں کہ بھئی تم بہت دن سے کوئی سوغات نہیں لائے، یعنی ریختہ نیا ــــ ناچار کبھی کبھی، یہ اتفاق ہوتا ہے کہ کوئی غزل کہہ کر لے جاتا ہوں ؎

تو نظیری زفلک آمدہ بودی چو مسیح
باز پس رفتی و کس قدر تو نشناخت دریغ

یہی رنگ اب والی جے پور کا ہے کہ اس نے اخبار میں دیکھ کر اور لوگوں سے سن کر یہ جان لیا کہ غالب بڑا شاعر ہے۔ بسبیلِ اذعان وہ بھی میرے کلام کے خواہاں ہوئے۔ میں تو بازار میں ایک دکان بے رونق لیے بیٹھا ہی ہوں ــــ لیجئے، لینو، تین سکہ کا ایک گٹھا باندھ کر ان کے پاس بھیج دیا۔ اگر انھوں نے خریداری کی تو اونے پونے سودا ہو جائے گا۔ صرف ایک ارسالِ ارمغان ابھی کیا ہے۔ اگر وہ میری عرضداشت کا جواب لکھیں گے۔ اور میرے ارمغان کی تلافی کریں گے تو قصیدہ بھی ارسال کروں گا۔

اب، یہاں بات میں سے بات نکلتی ہے کہ اس کا ظاہر کرنا منشی ہرگوپال صاحب

واجب ہے۔ آپ یہ خط ان کو ضرور دکھایئے گا ــــــ وہ بات یہ ہے کہ میں نے دیوانِ ریختہ بہت تکلف سے بحرف زرِ کثیر لکھوایا ہے۔ اور جلد انگریزی بہت قیمتی بنوائی اور جز دان بھی مکلف درست کیا اور چار پانچ لفافے مُہری نواب گورنر جنرل کے، سکرتر اعظم کے اور حضور والا کے خطے اور کاپی کی معرفی اور ٹونک کے نواب کی، اس میں رکھ کر، بعد ادائے محصول بابو صاحب کی خدمت میں اجمیر کو روانہ کیا۔ اور از روئے مزید احتیاط، ایک خط جداگانہ بابو صاحب کو اس مضمون کا لکھا کہ میری جان اس کتاب اور ان لفافوں میں اٹکی ہوئی ہے۔ جس دن یہ خط اور یہ پارسل پہنچے آپ اس کی رسید اسی دن مجھ کو لکھیے گا۔ اور یہ انتظار نہ کیجیے گا کہ جب کوئی اس کے گذرنے کی راہ نکل آوے، تب مجھ کو لکھیے ــــــ اور بھائی یہ پارسل اور یہ خط جمعہ کے دن ۱۰ دسمبر کو روانہ کیا گیا ہے۔ اتفاق یہ کہ اسی دن ایک خط بھائی تفضل حسین خاں صاحب وکیل وزیر الدولہ بہادر کو بھی بھیجا گیا ہے۔ اس کے جواب آئے کو آج ساتواں دن ہے اور بابو صاحب نے اب تک پارسل کی رسید نہیں لکھی۔

آج اکیسویں دسمبر کی، وہی جمعے کا دن ہے۔ حیران ہوں کہ میر تفضل حسین خاں کے نام کا خط اجمیر پہنچ بھی گیا اور اس کا جواب آ بھی گیا اور بابو صاحب کے نام کا نہ پارسل پہنچا نہ خط۔ یہ کیا اتفاق ہے۔ ڈرتا ہوں کہ کہیں ڈاک میں تلف نہ ہوا ہو پھر یہ سوچتا ہوں کہ دوسرا خط اور یہ خط اور یہ پارسل ایک ہی ڈاک میں گئے ہیں۔ ایک پہنچے، ایک نہ پہنچے۔ اس کے کیا معنی؟ پھر یہ خیال کرتا ہوں کہ بابو صاحب اجمیر میں نہ ہوں گے۔ بھرتپور گئے ہوں گے پارسل ان کی غیبت میں، نوکروں نے ان کے، لے کر کہیں بے احتیاطی سے ڈال رکھا ہوگا ــــــ ان افکار و اوہام کا فیصلہ جناب تفتہ کے کیے ہوگا ــــــ یعنی بابو صاحب کا اجمیر میں ہونا نہ ہونا ان کو معلوم ہوگا ــــــ اگر وہ اجمیر میں ہیں اور پارسل پہنچا تو کیا بعید ہے کہ انھوں نے کمال عنایت سے یہ چاہا کہ جب اس کی کوئی راہ نکال لوں، تب سائل کو جواب دوں ــــــ مگر ہاں منشی صاحب کو بطریق اطلاع لکھ بھیجوں ــــــ اس صورت میں احتمال ہے کہ انھوں نے تفتہ صاحب کو اطلاع دی ہو۔

کل پنجشنبہ کا دن تھا۔ آخر وقت ڈاک کا ہرکارہ آیا، میں نے جانا اجمیر کا خط لایا ہے

اس نے تمہارا خط دیا دل تو خوش ہوا مگر تشویش بنی رہی۔

آج میں نے تم کو یہ خط لکھا ہے خود پڑھ لو اور منشی جی کو پڑھوا کر، اگر ان کو کچھ اجمیر سے لکھا آیا ہے تو وہ دریافت کر کر مجھ کو لکھو اور اگر جیسا میرا گمان ہے، بابو صاحب اجمیر میں نہیں تو وہ مجھ کو لکھو اور اگر دونوں باتوں میں سے کوئی نہیں تو تفتہ صاحب کو یہ لازم ہے کہ اپنی طرف سے بابو صاحب کو لکھیں اور پارسل کے پہنچنے نہ پہنچنے کا حال معلوم کریں۔

ہاں حضرت! پاکٹ کا مربہ مجھ کو یاد ہے۔ حکیم تیم اللہ صاحب میرے ہاں آئے تھے اور یقین ہے کہ پھر بھی آویں۔ خدا چاہتا ہے تو پاکٹ کا مربہ ان کے ہاتھ پہنچتا ہے۔ میرے شیخ اکرام الدین اور اپنے عبدالسلام کو تم نے مخدوم جہانیاں جہاں گرد بنا رکھا ہے۔ تاج گنج، کہیں مرسان ـــــ خط لکھتے وقت مجھ کو کول میں اس کا آنا یاد نہ رہا ہوگا، ورنہ کیوں کر اس کو دعا نہ لکھتا۔ بیٹے سے پوتا زیادہ عزیز ہوا کرتا ہے۔ اب سب سے پہلے اس کو دعا پہنچے، پھر اس کے والد ماجد کو اور پھر میاں نصیر الدین کو اور اس کے بعد میری پیاری بھتیجی ذکیہ بیگم کو ـــــ لو صاحب! اب تو آپ راضی ہے کہ جناب شیخ عبدالسلام صاحب کو سب سے پہلے یاد کیا۔

بھائی صاحب! تم کو میرے سر کی قسم، جس وقت یہ خط پہنچے اسی وقت منشی ہرگوپال تفتہ پاس بھیج دینا اور ان کو تفہیم لکھ بھیجنا کہ اس کا جواب اسی دن یا دوسرے دن مجھ کو لکھیں۔ والسلام از اسداللہ

نگاشتہ و رواں داشتہ جمعہ سی و یکم دسمبر پایان ۱۸۵۲ء،

ضروری جواب طلب۔

غالب کے معلوم اردو خطوں کی تعداد ۸۹۰ کے قریب ہے۔ ان میں سے صرف پانچ خط ۱۸۴۸ء تک کے ہیں۔ اور سال ۱۸۵۱ء اور ۱۸۵۲ء کے خطوں کی تعداد ۲۵ سے زیادہ نہیں۔ اس پس منظر میں اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ زیر تعارف پانچ خطوں کی کتنی اہمیت ہے۔ ۱۸۴۸ء سے ۱۸۵۲ء تک کے پانچ برسوں کے احوال و کوائف کے لیے غالب کے یہ خط ہماری بڑی مدد اور رہنمائی کرتے ہیں اور ہمارا بڑا قیمتی ماخذ اور ذریعہ ہیں۔

یہ خط، بالخصوص تیسرا خط غالب کے سوانح کے حوالے سے بڑا اہم ہے۔ اس عہد کے شب و روز اور بہادر شاہ ظفر کے دربارے وابستگی کے اثرات مابعد کی اتنی جزئیات اور تفصیلات کہیں اور سے ہاتھ نہیں آتیں۔

یہ تیسرا خط منجملہ امور ہائے دیگر، اس حوالے سے بھی بڑا قیمتی ہے کہ اس سے غالب کے نامور معاصر مومن خاں مومن کی تاریخ وفات کا تعین ہوتا ہے۔ مومن کی تاریخ وفات کو متعین کرنے کے لیے میرے علم میں نہیں کہ غالب کے اس خط کے علاوہ کوئی اور قابلِ ذکر معاصر ماخذ، عام طور پر دسترس میں ہوں۔

یہ خط غالب اور عہدِ غالب ہی پر نہیں روشنی نہیں ڈالتے، غالب کی افتادِ مزاج کو سمجھنے کا بھی بڑا اچھا ذریعہ اور وسیلہ ہیں۔ اِن خطوں کے ذریعے سے ان ایام اور برسوں کے موسموں غالب کی صحت اور صورتِ احوال اور ان کے محسوسات، ان کے اندر کے موسموں، ارتعاشات، ان کی ذہنی اور قلبی کیفیات اور ان کی امیدوں اور آرزوؤں کے محور تک رسائی میں بڑی مدد ملتی ہے ـــــ اور آج کے لکھنے والوں کے لیے یہ خط بڑا اچھا معیار اور نمونہ ہیں اس امر کا بھی کہ اپنی بات کو کفایتِ لفظی کے ساتھ موثر طور پر کیوں کر کہا اور ادا کیا جا سکتا ہے۔

بات یا ابیات کی تشریح اور اپنے نقطۂ نظر یا مافی الضمیر کے اظہار میں ایک اچھے موثر اور ذہین استاد کی طرح غالب کا بات کہنے کا ڈھنگ، ترتیب، تسلسل، وضاحت صراحت، منطق، استدلال، غرض ان کی روشِ تحریر اور بیک وقت بہت سے امور کا لحاظ اور بہت سی باتوں کی احتیاط، ہمیں متوجہ اور متاثر کرتی ہے۔

یہ خطوط، غالب کے ہیں ـــــ اس ایک بات کے بعد، ان کے اسلوب اور انشا کے حسن اور دل آویزی کے بارے میں کچھ کہنا زائد بات ہوگی ـــــ بایں ہمہ مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ یہ خط ابلاغ، انشا، اور تقلیلِ الفاظ کے ساتھ اپنے اندر ایک جہان معنی سمو لینے کی ایک ایسی موثر اور مکمل مثال ہیں کہ خود غالب ہی کے ہاں سے ایسی دوسری مثالیں تلاش کرنا بہت آسان نہیں ہوگا۔

حواشی

۱ ۔ حقیر کے حالات میں دیکھیے :

(ا) نادراتِ غالب، آفاق حسین آفاق، کراچی ۱۹۴۹ء، حصہ اول ص ۱۷۔ ۳۷

(ب) تلامذۂ غالب، مالک رام، دہلی ۱۹۸۴ء، ص ۱۵۹ ـــ ۱۶۲

(ج) بزمِ غالب، عبدالرؤف عروج، کراچی ۱۹۶۹ء، ص ۱۴۴ ـــ ۱۴۷

۲ ۔ تفتہ کے احوال میں رجوع کیجیے :

(ا) تلامذۂ غالب، مالک رام، دہلی ۱۹۸۴ء، ص ۱۱۹ ۔ ۱۳۲

(ب) بزمِ غالب، عبدالرؤف عروج، کراچی ۱۹۶۹ء ص ۱۱۴ ۔ ۱۱۹

(ج) تفتہ اور غالب، ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری، دہلی ۱۹۸۴ء

(د) شہر تفتہ، یعقوب بدر، سکندر آباد، ۱۹۸۳ء

۳ ۔ میاں حکیم نسیم اللہ خاں محکمہ فوجداری علی گڑھ سے وابستہ تھے (نادراتِ غالب، حواشی ص ۹۴)

۴ ۔ حکیم امام الدین خاں پاک پٹن کے رہنے والے تھے اور نواب فرخ آباد کے خاص طبیب تھے۔ بہادر شاہ ظفر نے انہیں شاہی طبیبوں میں شامل کر لیا تھا۔ غالب بھی اپنی صحت کے سلسلے میں ان سے رجوع کرتے تھے۔ سرسید احمد خاں نے "آثار الصنادید" میں ان کے فضل و کمال اور علم و حکمت کی بڑی تعریف کی ہے۔ ۱۲۸۱ ہجری مطابق ۶۵ ـ ۱۸۶۴ء میں انتقال ہوا۔ (بزمِ غالب، عبدالرؤف عروج، کراچی ۱۹۶۹ء، ص ۵۵)، نیز "نادراتِ غالب" (حواشی ص ۹۴۔۹۵)

۵ ۔ عہدِ غالب کے نامور ترین فاضل مفتی صدر الدین آزردہ ولادت ۱۲۰۴ ہجری، ۱۷۸۹ء، وفات ۱۶ جولائی ۱۸۶۸ء۔ باوجود اختلافِ رائے اور ذوق کے، غالب اور آزردہ ایک دوسرے کے قلبی دوست اور قدردان تھے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے، مفتی صدر الدین آزردہ از عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی، مکتبہ جامعہ، دہلی ۱۹۷۷ء، ص ۵۹ ۔ ۶۲

۶ ۔ "کول" علی گڑھ کا پرانا نام ہے۔ نادراتِ غالب (آفاق) میں "دل" بجائے "کول" (متن، ص ۲)

۷ ۔ "نادراتِ غالب" میں "ہرگوپال تفتہ" بجائے : ہرگوپال (متن، ص ۲)

۸ ۔ "نادراتِ غالب" میں ۳۔ ربیع الآخر ۱۲۶۴ ہجری کو ۹۔ مارچ ۱۸۴۸ء کے مطابق قرار دیا گیا ہے۔

جب کرے، "ماہیا" ہونا چاہیے۔ میرے پیشِ نظر میر مہدی مجروح کی جو قلمی بیاض ہے، اس میں مجمع اور سنہ ہر دو غائب۔

۹ "نادرات غالب" میں "خندہ پڑھا" بجائے: بنفشہ و در (متن، ص ۲)

۱۰ "نادرات غالب" میں "بھاؤں" بجائے: بھاؤں (ایضاً، ص ۲)

۱۱ "نادرات غالب" میں "بنائی" بجائے: بگلائی (ایضاً، ص ۲)

۱۲ پانی کے مدور کرنے کی یہ ترکیب غالب نے طبیب محمد حسین خانی کے حوالے سے، منشی نبی بخش حقیر کے لیے مرزا ہرگوپال تفتہ کو لکھ بھیجی تھی۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: غالب کے خطوط، جلد اول، مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم، ص ۲۳۷۔

۱۳ "نادرات غالب" میں لفظ "یہ" محذوف مشکوک (ایضاً، ص ۳)

۱۴ "نادرات غالب" میں "اور" کے بعد لفظ "آپ" زائد ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم کی قرات میں: "اور آپ" کو حذف ہونا چاہیے۔ دیکھیے: غالب کے خطوط، جلد سوم، ص ۱۰۸۸۔

۱۵ تفتہ نے اپنے فارسی دیوان کی تقریظ غالب سے لکھوائی تھی۔ جو کلیات نثر غالب" میں موجود ہے۔ (دیکھیے: "کلیات نثر غالب" طبع دوم، لکھنؤ ۱۸۷۱ء، ص ۸۲ - ۸۳) تفتہ نے شکایت کی تھی کہ مدح کم ہے۔ اس کے جواب میں غالب کے نقطۂ نظر کے لیے دیکھیے: غالب کے خطوط، جلد اول کراچی، ص ۲۳۶۔

۱۶ "نادرات غالب" میں "تماوی" بجائے: بی بی (ایضاً ص ۳)

۱۷ "نادرات غالب" میں "مقال" بجائے: مغوں (ایضاً ص ۳)

۱۸ "نادرات غالب" میں "بدلہ گو" بجائے: بذلہ گو (ایضاً ص ۴)

۱۹ "نادرات غالب" میں "بر مجمع" بجائے: مجمع (ایضاً ص ۴)۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے اس کے برعکس لکھا ہے جو درست نہیں۔ دیکھیے: غالب کے خطوط، حصہ سوم ایضاً ص ۱۳۰۷۔

۲۰ "نادرات غالب" میں لفظ "قصیدہ" ندارد (ایضاً، ص ۴)

۲۱ " " " میں "کرکر" بجائے: کرکے (ایضاً ص ۴)

۲۲ " " میں "و" بجائے: اور (ایضاً، ص ۴)

۲۲ "نادرات غالب" میں "ساقہ" بجائے : پاتہ ۔ ایضاً، ص ۴)

۲۳ " " " میں اضافہ ؛ مطابق ۱۳۔ رجب ۱۲۶۰ ہجری" جو صحیح نہیں ہے۔

۲۴ یہ خط "نادراتِ غالب" طبع دوم (۱۹۹۲ء) میں پہلی بار شامل ہوا۔ دیکھیے ؛ ص ۱۸۱ ـ ۱۸۲

۲۵ "نادرات" میں [وہ] ندارد (ص ۱۸۱)

۲۶ جولائی ۱۸۵۰ء میں حکیم محمد احسن اللہ خاں کی تحریک اور کوشش سے غالب بہادر شاہ ظفر کے دربار سے وابستہ ہوئے، دیکھیے ؛ غالب کا علمی سرمایہ (ص ۲۶۳) نیز "غالب اور انقلاب ستاون" از ڈاکٹر سید معین الرحمٰن طبع چہارم، لاہور ۱۹۸۹ء ص ۱۲۳

۲۷ "نادرات" میں "تھا" بجائے : تو (ص ۱۸۱)

۲۸ و ۲۹ "نادرات" میں "وہی" بجائے ؛ وہ ہی (ص ۱۸۱)

۳۰ " " میں "کے" ندارد (ص ۱۸۱)

۳۱ " " میں "باسٹھ روپے" بجائے ۶۱ روپے (ص ۱۸۱)

۳۲ " " میں ۲۸ روپے (ص ۱۸۱)

۳۳ " " میں "قرضِ حسنہ" (ص ۱۸۱)

۳۴ " " میں "مجھے" بجائے : مجھ کو (ص ۱۸۱)

۳۵ " " میں : "ایک سو دس روپیہ کیوں کر بنا لوں" کی جگہ : "ایک سو دس روپیہ اور ہزار روپیہ کے مانگنے والے فرمایئے ایک ایک روپیہ کے دس دس کیوں کر بنا لوں ۔" (ص ۱۸۱)

۳۶ "نادرات" میں "خلاً بیس روپے ہیں" کی جگہ "مثلاً ایک کے بیس روپیہ ہیں۔" (ص ۱۸۱)

۳۷ " " میں "ان کے" ندارد (ص ۱۸۲)

۳۸ نادرات میں "تفتہ کے" (ص ۱۸۲)

۳۹ " " " میں ۲۴۔ ربیع الاول ۱۲۶۷ھ کا اضافہ (ص ۱۸۲)

۴۰ صاحب عالم مارہروی (۱۷۹۶ء ـــ ۲۴ مارچ ۱۸۶۱ء) کے دوست اور شاگرد، حکیم الٰہی بخش کے تعارف میں دیکھیے غالب کا خط بنام منشی نبی بخش حقیر مورخہ ۱۵۔ مئی ۱۸۵۲ء مشمولہ "نادراتِ غالب" (آفاق حسین آفاق، کراچی ۱۹۴۹ء)، متن صفحہ ۲۲۔

۴۲ غالب اور منشی نبی بخش حقیر کے دوست، سالارمرزا حسن علی بیگ کے خانگی حالات میں دیکھیے
حقیر کے نام غالب کے خط مشمولہ "نادرات غالب" (متن ص ۱۵ اور ۵۵)

۴۳ "نادرات" میں باضافہ "میں" یعنی : میں، کل جاؤں گا۔ (متن ص ۲۳)

۴۴ " " " میں لفظ "اور" ندارد (متن ص ۲۳)

۴۵ " " " میں "۲۰ مئی" بجائے : ۲۰ مئی (متن ص ۲۳)

۴۶ " " " میں "میں نے" ندارد (متن ص ۲۳)

۴۷ " " " میں باضافہ "اور" یعنی "اور اس کو موحی جاے ۔۔۔" (متن ص ۲۳)

۴۸ بہادر شاہ ظفر کے مشیر خاص، سرسید، غالب اور مومن کے معالج اور مربی حکیم احسن اللہ خاں (ولادت ۱۷۹۷ء، وفات ۱۸۷۳ء) کے حالات میں دیکھیے : ڈاکٹر خلیق انجم کا نوٹ اور "غالب کے خطوط" جلد چہارم، نئی دہلی ۱۹۹۳ء ص ۱۶۵۷۔

۴۹ "نادرات" میں "کر جب چاہیں" بجائے : جب چاہیں (ایضاً متن ص ۲۳)

۵۰ مراد اس کتاب سے ہے جو ۱۸۵۴ء میں "مہر نیمروز" کے نام سے مطبع سلطانی دہلی میں چھپی۔ کتاب چھپنے سے پہلے غالب اس کی قلمی نقل منشی نبی بخش حقیر کی فرمائش پر انھیں بھیج رہے تھے۔

۵۱ "نادرات" میں "جزو" بجائے : جز (متن، ص ۲۳

۵۲ " " میں "جب سب آچکے" بجائے : جب سب اجزا آچکیں گے (متن ص ۲۳)

۵۳ "مسطر" کا املا میرن صاحب نے "مستر" کیا ہے۔ اِسے سہو قلم خیال کرنا چاہیے۔

۵۴ اور ۵۵ "نادرات" میں "جولا سنگھ" بجائے : جولا سنگھ (متن ص ۲۴)

۵۶ " " میں لفظ "اور" ندارد (متن ص ۲۴)

۵۷ " " " میں "آجائے" بجائے : آجاوے (متن ص ۲۴)

۵۸ میرن صاحب کے قلم سے املا : "رزائیاں"

۵۹ حکیم محمد مومن خاں، ولادت ۱۸۰۰ء، وفات ۱۸۵۲ء

۶۰ "نادرات" میں "ہم عصر" بجائے : ہم عصر (متن ص ۲۴)

۶۱ "نادرات" میں "پندرہ پندرہ" بجائے : پندرہ (متن صفحہ ۲۴)

۶۲ تا ۶۳ " . . . " میں جملے کی یہ صورت ضبط میں آئی ہے :

"میرے حالات سراسر میرے خلاف طبیعت ہیں" (ایضاً متن ص ۲۵)

۶۴ "نادرات" میں " . . . . بندھا ہوا پڑا ہوں" (ایضاً متن ص ۲۵)

۶۵ "زیادہ والسلام از غالب" کے لفظ "نادرات" میں ندارد (ایضاً ص ۲۵)

۶۶ اس خط پر میرے پیش نظر بیاض میں "روز دوشنبہ" درج ہے، تاریخ ثبت نہیں "نادرات غالب" میں "یکم شعبان ۱۲۶۸ھ (مطابق) : ۲۱ مئی ۱۸۵۲ء بروز جمعہ" کا اندراج ہوا ہے

۶۷ یہ خط "نادرات غالب" طبع اول (۱۹۴۹) میں شامل نہیں تھا۔ طبع دوم (۱۹۹۲ء) میں اضافہ ہوا ہے دیکھیے ص ۱۹۷ ۔ ۱۹۹۔

۶۸ "نادرات غالب"، (طبع دوم ۱۹۹۲ء) میں : سو بھی روٹیاں نہیں، دال سالن، کے بجائے سو بھی روٹیاں، یہی دال سالن (ص ۱۹۷)

۶۹ مراد تاریخ تیموریہ سے ہے جو "مہر نیمروز" کے نام سے دسمبر ۱۸۵۴ء میں چھپی۔ اس کتاب کے تعارف میں دیکھیے، غالب کا علمی سرمایہ از : ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، ۱۹۸۹ء، ص ۲۶۳۔۲۷۰

۷۰ "نادرات غالب" (طبع دوم) میں : داد نہ ملے یہی تو غضب ہے، کے بجائے : داد نہ ملنی ہے تو غضب ہے" (ص ۱۹۷)

۷۱ "نادرات" میں "سے" کے بجائے : "سے یہ" (ص ۸)

۷۲ اس امر کی تفصیل کے لیے دیکھیے، تحقیق نامہ باغ دودر، وزیر الحسن عابدی لاہور ۱۹۷۰ء ص ۵

۷۳ "نادرات" میں "ہے" ندارد (ص ۱۹۸)

۷۴ " " میں : کالپی کی مصری کے بجائے : کالپی کی مہری (ص ۱۹۸)

۷۵ " " میں "کے" بجائے ، کی (ص ۱۹۸)

۷۶ بابو صاحب عرف، نام : جانی بانکے رائے، تخلص رند، غالب کے شاگرد اور کرم فرما اور منشی نبی بخش حقیر کے دوست تھے۔ بابو صاحب اجمیر کے بندوبست سرکاری میں وکیل تھے۔ ۱۲۷۳ ہجری ۱۸۵۶ء میں ان کا انتقال ہوا۔ دیکھیے : بزم غالب، عبدالرؤف عروج ۱۹۶۹ء ص ۱۴۶ ۔ ۱۴۸۔

۷۷ "نادرات" میں : کرکے ، بجائے : کرکر

۷۸ تفتہ کے نام ۸۔ جنوری ۱۸۵۳ء کے مطابق دیوان کی رسید مل گئی ، اطمینان ہوا۔ غالب کے لفظ یہ ہیں : ..... "ہاں صاحب ، ابھی یہ خط آیا ۔ پارسل پہنچ گیا ، تردد رفع ہوا ، اب جو کچھ ہوتا ہے وہ ہوتا رہے گا ۔ محل تشویش و تردد نہیں ـــــ" مرزا ہرگوپال تفتہ کے نام غالب کے ۶۔ اپریل ۱۸۵۳ء کے خط سے پتہ چلتا ہے کہ اس دیوان کے صلے میں پانسو روپے نقد اور خلعت غالب کے واسطے تجویز ہوا۔

۷۹ "نادرات" میں : ہاں صاحب ، بجائے : ہاں حضرت" (ص ۱۹۹)

۸۰ " " میں : کے پاس ، بجائے : پاس (ص ۱۹۹)

۸۱ ممکن ہے غالب نے "بقسم" لکھا ہو ، نقل کرتے ہوئے میرن صاحب نے "تقسیم" لکھ گئے۔ "نادرات" میں "تاکید" بجائے ، تقسیم (ص ۱۹۹)

۸۲ "نادرات" میں یہاں ، ۱۹۔ ربیع الاول ۱۲۶۹ ہجری کا اضافہ۔

ڈاکٹر کمال احمد صدیقی

غالب سے منسوب تین نئے خط

استناد کا مسئلہ

۸ر اکتوبر ۱۹۹۴ء کے ہماری زبان (دلی) میں ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کا مضمون غالب کے تین خط شائع ہوا ہے۔ یہ نقوش (لاہور) کے سالنامے سے نقل کیا گیا ہے۔ خطوں کے عکس نقوش میں نسبتاً جلی ہیں۔

تینوں خط ایک ہی تاریخ، ۱۶ر ذالحجہ ۱۲۷۶ ہجری/۶ر جولائی ۱۸۶۰ء کے ہیں۔ یہ خط ڈاک سے نہیں بھیجے گئے تھے، بلکہ قرائن ایسے پیدا کئے گئے ہیں کہ میر مہدی مجروح، اُن کے بھائی میر سرفراز حسین (جنھیں غالب نے مجتہد العصر کا خطاب دیا تھا) اور میر افضل علی المعروف بہ میرن صاحب تینوں یا میر سرفراز حسین لے کر رامپور گئے تھے۔ خطوں کے مکتوب الیہ ہیں:

۱۔ نواب یوسف علی خاں ناظم، والی رامپور
۲۔ علی بخش خاں، خانِ سلماں (مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی کے والد)
اور ۳۔ آغا محمد حسین خاں (بعد میں دبدبۂ سکندری کے مدیر ہوئے)

نواب رامپور کے خط میں مدعا یہ دکھایا گیا ہے کہ میرن صاحب سید الشہدا علیہ السلام کے ذاکر ہیں، اور مرثیہ بھی خوب پڑھتے ہیں۔ آواز بہت اچھی ہے۔ اس فن میں کمال رکھتے ہیں۔ گذارش کی گئی ہے کہ نواب صاحب میرن صاحب سے مرثیے سنیں، اور امام باڑے میں

اُن کو ذاکر مقرر فرمائیں۔

علی بخش خاں سالار سے واجبات کے بعد یہ خواہش کی گئی کہ میر مہدی اور میر فرقہ گاہ کی ملازمت کے سلسلے میں کوشش کریں۔

آغا محمد حسین خاں کے خط میں ان تینوں کو ملازمت دلوانے کی بات ہے۔

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کا یہ نوٹ بڑی اہمیت رکھتا ہے:

۱۔ میرے ذاتی ذخیرۂ غالبیات میں میرافضل علی، عرف میرن صاحب (وفات ۲۹ جنوری ۱۹۱۳ء) کی ایک قلمی بیاض موجود ہے، جس میں میرن صاحب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی میر مہدی مجروح (وفات ۱۵ مئی ۱۹۰۳ء) اور غالب کے کچھ خطوں کی نقلیں محفوظ ہیں۔ غالب کے ان نادر اور نئے خطوں کے لیے میرا ماخذ میرن صاحب کی یہی بیاض ہے۔"

سید معین الرحمٰن نے یہ بھی لکھا ہے:

۲۔ "ان خطوں سے متعلقین غالب کے حالات پر نئے مباحث، اور نئی معلومات کا در کھلتا ہے۔ اُمید ہے کہ غالب کی ایک سو پچیسویں برسی کے قریب اس تحفۂ علمی اور ارمغانِ غالب کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔"

معیشت سے ہر سماجی عمل اثر پذیر ہوتا ہے۔ تخلیقی ادب بھی، اور تحقیقی ادب بھی۔ تخلیقی ادب تو معیشت سے بہر حال جڑا ہوا ہوتا ہے۔ البتہ تحقیق کو مالی اور معاشی مفادات اور معیشت سے الگ نہ رکھا جائے تو اکثر نتیجے تباہ کن ہوتے ہیں۔ صارفی سماج میں سب سے زیادہ ناقابلِ فروخت چیز کھرا ادب ہے۔ نقلی ادب کو فروخت کرنے کے لیے ہتھکنڈے استعمال کئے جاتے ہیں، کھرے ادب کے بردہ فروش اُن کا سہارا لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ادیب نہیں۔ تحقیق میں تو اس کی ذرا بھی گنجائش نہیں، کیونکہ یہ عام استعمال کی جنس نہیں۔ تحقیق ماہرین، طلبہ، اور قارئین کے ایک محدود طبقے کے لیے ہوتی ہے۔ تحقیق میں یہ طریقے نہ صرف احسن نہیں، بلکہ غیر متعلق بھی ہوتے ہیں، اور اکثر خطرے کی گھنٹی بھی بن جاتے ہیں، جیسے زیرِ مطالعہ تین خطوں کے بارے میں۔ غالب کی ایک سو پچیسویں برسی سے ان خطوں کا کوئی تعلق نہیں۔ اگر میرن صاحب کی اس مبینہ بیاض کو غالب کی ایک سو پچیسویں برسی

سے جوڑا جاتا تو شاید ذہن فوراً غالب کی سویں برسی کی طرف نہ جاتا۔ سویں برسی پہ غالب کی ایک مبینہ خود نوشت بیاض بھوپال سے برآمد کی گئی تھی جو پاکستان میں نقوش (لاہور) میں اصل کے عکس اور اس کی نستعلیق قرأت کے ساتھ شائع ہوئی تھی اس کے جعلی ہونے کی اپنی اندرونی شہادتیں تھیں کہ ۸ ÷ ۲۰ × ۳۰ کے تقطیع کے ۲۲۲ صفحات (بیاضِ غالب: تحقیقی جائزہ) میں شکل سے سماسکیں ورق (۱ کے رُخ ب پہ رکاب نام کی چیز نہیں تھی۔ ورق ۲ رُخ ب پہ رکاب نادرست تھی۔ باقی نسخہ رکاب سے بے نیاز اُس عہد کی بیاض میں ایسی بھیانک غلطی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ ایک غزل کا مقطع تھا:

آہنگِ اسد میں نہیں جز نغمۂ بیدل
عالم ہمہ افسانۂ ما باشد و ما ہیچ

مخطوطہ ساز اس پایہ کا عالم تھا کہ اسے یہ اطلاع بھی نہیں تھی کہ دوسرا مصرع مرزا عبدالقادر بیدل کا ہے۔ اُس نے اسے بھی غالب کا مصرع سمجھا اور اوّلین قرأت دکھانے کے لیے افسانۂ ما دارد و ما ہیچ کو افسانۂ ما باشد و ما ہیچ کر دیا۔ اور نقوش (لاہور) میں جب کوئی پچیس برس پہلے یہ بیاض چھپی، تو عکس میں باشد ہے، لیکن مقابل کے صفحے پر نستعلیق قرأت میں دارد ہے۔ جعل کو چھپانے کے لیے کیسی طفلانہ کوشش ہے!

اسد میر امانی کی ایک غزل یہاں وہاں تحریف کے ساتھ، غالب کے نو دریافت کلام کے طور پر اس مبینہ "بیاضِ غالب بخطِ غالب" میں موجود ہے:

دلِ بیتاب کہ سینے میں دمِ چند رہا
بدمِ چند، گرفتارِ غمِ چند رہا۔!

یہ غزل نصراللہ خاں خویشگی کے تذکرے گلشن ہمیشہ بہار میں، میر امانی اسد کے ترجمے میں شامل ہے۔

اگر میرن صاحب کی بیاض کسی اور کی مملوکہ ہوتی، سید معین الرحمٰن کی نہیں، تو اُن کے تعارفی مضمون کی نوعیت اور اہمیت مختلف ہوتی۔ فوری توجہ کے سوال یہ ہیں:

۱۔ میرن صاحب کی یہ بیاض سید معین الرحمٰن کو کب دستیاب ہوئی؟
۲۔ میرن صاحب کی یہ بیاض سید معین الرحمٰن کو کہاں سے دستیاب ہوئی، اور اس

کے مستند ہونے کے بارے میں انھوں نے کیا شواہد جمع کیے؟

ایسی اہم دستاویز سے کچھ اقتباس کیا جائے، تو پہلے دستاویز کے استناد کے پہلو پر روشنی ڈالنا، پھر اُس کے صفحات اور اندراجات کا پورا گوشوارہ پیش کرنا ــــ یعنی مکمل کیفیت کے ساتھ تعارف کرانا ازبس ضروری ہے۔ یہ صورت مشکل ہی سے قابلِ قبول ہو سکتی ہے کہ عمر و عیار کی اس زنبیل سے وقتاً فوقتاً خطوط اور کلام برآمد ہوتے رہیں، یادداشتیں برآمد ہوتی رہیں۔ اگر موصوف اس بیاض کا پورا تعارف کرا چکے ہیں، تو وہ میری نظر سے نہیں گذرا، اور دلّی میں کسی اور کی نظر سے بھی نہیں گذرا۔ پھر بھی اگر وہ تعارف کرا چکے ہیں۔ تو پیشگی غیر مشروط معذرت۔ اگر واقعتاً موصوف لکھ چکے ہیں، تو مضمون کے مطالعے کے بعد معروضات پیش کرنے کا حق مجھے ہوگا۔

پہلا خط ہے:

(۱)

نواب یوسف علی خاں بہادر رئیس رامپور

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

دو سطریں اور بھی لکھی ہوئی ہیں

مگر کیڑا یا جھینگروں نے ان کو چاٹ لیا

لفافہ بدستور بھیجتا رہتا ہوں ان سطور کے لکھنے سے مقصود یہ ہے کہ سعادتمند ازلی میر افضل علی المعروف بہ میرن صاحب یہاں کے اعیان سادات و معزز اشخاص میں سے ہیں اور میرے ساتھ ان کو ایسی راہ و رسم ہے کہ میں ان کو اپنے فرزندوں کے برابر گنتا ہوں۔ جناب سید الشہدا علیہ السلام کے ذاکر ہیں مرثیہ خوب پڑھتے ہیں آواز بہت اچھی ہے اس فن میں کمال رکھتے ہیں حضور کی سرکار کے تعزیہ داری اور حضور کی قدر دانی کا شہرہ سن کر ادھر کے عازم ہوئے ہیں اس فقیر دعاگو کی یہ تحریر ان کی باریابی و روشناسی کا ذریعہ ہوگی امید

ہے کہ آپ ان کو عزت بخشیں اور ان کے مرثئے سنیں اور
جس طرح اور جماعتیں امام باڑہ میں مرثیہ پڑھیں یہ بیگا د دہر بہ
انفراد ذاکر رہیں تم سلامت رہو قیامت تک خوشنودی کا طالب
غالب جمعہ ۲ جولائی ۱۸۶۲ء

اس خط کی پہلی چار سطریں متنی تنقید کے لیے مثالی نمونہ پیش کرتی ہیں۔

نواب یوسف علی خان بہادر رئیس رامپور
حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت
دو سطریں اور بھی لکھی ہوئی ہیں
مگر کیڑا یا جھینگر نے اُن کو چاٹ لیا

سید معین الرحمٰن نے، اس خط کی تسعلیق خواندگی میں تحقیق کے بنیادی اصول کی پابندی سے گریز کیا۔ "دو سطریں اور بھی ... چاٹ لیا۔" متن سے حذف ہے۔ فٹ نوٹ میں اظہار ہے: "(یہاں) دو سطریں اور بھی لکھی ہوئی تھیں، مگر کیڑے یا جھینگر نے اُن کو چاٹ لیا ہے:" محقق موصوف کا رویہ متنی مطالعہ پیش کرنے والے کا نہیں، مالک مخطوطے کے وکیل یا اس کی طرف سے معذرت کرنے والے کا ہے۔ تحقیق میں وکالت اور معذرت کے لیے مشکل ہی سے گنجائش نکالی جاسکتی ہے۔

۱۔ دو سطریں سے پہلے قوسین میں یہاں محقق موصوف کا اضافہ ہے کیوں؟ عکس میں یہ لفظ نہیں ہے۔

۲۔ عکس میں کیڑا ہے۔ لیکن محقق موصوف نے صرف ونحو کے استاد کا فرض ادا کرتے ہوئے اسے کیڑے کر دیا ہے۔ کیوں؟ اگر یہ تحریف نہیں تو کیا ہے؟ متنی تنقید کے آداب اس کی اجازت نہیں دیتے۔ "چاٹ لیا" کے بعد ہے کا اضافہ بھی تحریف ہے۔

۳۔ یہ بات کہ دو سطریں اور بھی ہیں/تھیں لیکن کیڑا یا جھینگر نے ان کو چاٹ لیا، ایک سطر میں کیوں نہیں، دو مصرعوں کی طرح، دو سطروں میں کیوں لکھی گئی۔ اُس زمانے کے مخطوطوں

میں شعر کے مصرعے اگر جہ تتے اوپر لکھے ہوئے نہیں دیکھے پہلی سطر کا دوسرا نصف اور دوسری سطر کا پہلا نصف خالی کیوں ہے؟

۲. اگر حقیقت یہ ہوتی کہ غالب کی تحریر میں القاب (دوسرے القاب کے بعد کی دو سطریں غالب شناس کیڑے یا جھینگر نے چاٹ لی ہوتیں تو:

الف: وہ الفاظ جو پڑھے جا سکتے تھے، لکھے جاتے

ب: قرائن یہ بنائے گئے ہیں کہ غالب کا یہ خط میرن صاحب کے پاس ہی رہا۔ یہ خط انھوں نے بار بار پڑھا ہوگا۔ اور شروع کی سطریں ہی نہیں، سارا خط انھیں یاد ہونا چاہیے تھا (اگر اس کا وجود ہوتا)۔ یادداشت سے یہ عبارت لکھی جا سکتی تھی۔ ایک آدھ لفظ ادھر اُدھر ہو جاتا، تو اس میں قباحت کی کیا بات تھی۔ وہ قرآن یا حدیث کی کوئی عبارت تو نہ تھی کہ تحریف سے گناہ ہوتا۔

ج: اُس وقت یہ تصور بھی میرن صاحب کے ذہن میں نہیں ہو سکتا تھا کہ نوعِ انسانی کی آئندہ نسلوں کے لیے عبارت کا ایک ایک لفظ صحت کے ساتھ محفوظ کیا جا رہا ہے۔ اگر ایسا ہوتا، تو غالب کے سارے خط اُن کی تحریر میں فراہم ہوتے، اور کم از کم یہ خط تو مُڑا ہوا اس بیاض میں ہونا ہی چاہیے تھا۔

د: صحتِ متن اور تحریف کا استدلال، کم از کم اس خط کے سلسلہ میں بامعنی نہیں۔ القاب اور آداب کے بعد پہلا ہی جملہ ہے:

"لفافہ بدستور بھیجتا رہتا [ہوں]"

ہ: "لفافہ بدستور بھیجتا رہتا ہوں" نہ صرف یہ کہ اس جملے سے نواب کے نام خط غالب شروع نہیں کر سکتے تھے، بلکہ ایسا جملہ بھی نہیں لکھ سکتے تھے، ایک تو یہ حشو و زوائد میں سے ہے۔ پھر اس جملے سے غالب کی نیازمندی ظاہر نہیں ہوتی۔ نواب کے نام اُن خطوں کا آغاز رسمی آداب سے ہوتا تھا:

آداب و نیاز بجا لاتا ہوں۔

بعد تقدیم تسلیم گذارش کرتا ہوں۔
بعد بجا لانے آداب نیاز کے عرض کرتا ہوں
بعد تسلیم کے عرض کرتا ہوں
نوازش نامے کے ورودِ مسعود کی اطلاع دیتا ہوں
بعد تسلیم معروض ہے

خطوط پڑھیے تو شرمندگی کا احساس ہوتا ہے کہ غالب اپنے خطوں میں کورنش بجالانے کے لیے دوہرے ہوے جارہے ہیں۔ "لفافہ بدستور بھیجتا رہتا ہوں" نواب کو نہیں لکھ سکتے تھے، کہ نواب برابر کی شخصیت یا کم تر شخصیت والا نہ تھا، اور یہ حفظِ مراتب کے منافی تھا۔ ولی نعمت کے ساتھ وہ حفظِ مراتب کا کچھ زیادہ ہی لحاظ رکھتے تھے۔

ح ؛ غالب کی عام عادت تھی، جملے کے ختم ہونے پر ۃ یا ۱۲ لکھنے کی۔ بہت ہی شاذ الوقوع ہے اور وہ بھی چند جملوں کے خطوں میں۔ اس خط میں کہیں یہ نشان نہیں ہیں۔

" نواب یوسف علی خان بہادر، رئیس رامپور" سے خط کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ سرنامہ نہیں، خط کا جزو ہے۔ سید معین الرحمٰن نے نستعلیق خواندگی میں صریحاً تحریف کی ہے، قوسین میں بنام کا اضافہ کر کے۔ تین خطوں کے عکس جو اُن کے مضمون میں شامل ہیں، اُن میں سے کسی میں بھی مکتوب الیہ کی شناخت کے لیے کوئی عبارت متن سے الگ نہیں ہے۔ جو کچھ ہے، وہ القاب سے واضح ہے۔ بیاض میں یہ خط آئندہ نسلوں کے استفادے کے لیے مرتب نہیں کیے گئے تھے، کہ ہر خط سے پہلے مکتوب الیہ کا نام لکھا جاتا۔ اگر ایسا ہوتا، تو پھر ہر خط پر ہوتا۔ علاوہ اس کے اور کوئی نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکتا کہ "نواب یوسف علی خان بہادر" سرنامہ نہیں بلکہ خط کا حصہ ہے، خط کا آغاز ہے۔ صاحب مضمون نے قوسین میں بنام لکھ کر، اسے مکتوب نگار کے بجائے، صاحب بیاض سے منسوب کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ تحریف شاید انھیں اس لیے کرنا پڑی کہ ایک خط میں دو القاب ہو گئے ہیں، اور پہلے القاب کے بعد آداب نہیں۔ اس بات پر تو انھوں نے پردہ ڈالنے کی کوشش کی، لیکن اس کو کیا کریں گے کہ پہلے القاب میں "نام نامی اسم سامی" تو ہے، لیکن تخلص نہیں۔ ایک

بات اور توجہ چاہتی ہے۔ فرمانروا کے نام میں، نواب سے پہلے بھی تعظیم کے لیے سابقہ نہ لگایا جائے، تو بے ادبی بھی جاتی تھی۔ شاید خطوط سازنے غالب کی اس عبارت سے دھوکا کھایا جو شیو نرائن کے نام ستمبر ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں ہے:

"سنو میری جان۔ نوابی کا مجھ کو خطاب ہے۔ نجم الدولہ۔ اور اطراف و جوانب سے امراسب مجھ کو نواب لکھتے ہیں۔ بلکہ بعض انگریز بھی چنانچہ صاحب کمشنر بہادر دہلی نے، جو اب ان دنوں میں ایک روبکاری بھیجی ہے، تو لفافے پر نواب اسداللہ خان لکھا۔ لیکن یہ یاد رہے۔ نواب کے لفظ کے ساتھ مرزا یا میر نہیں لکھتے۔ یہ خلاف دستور ہے۔ یا نواب اسداللہ خان لکھو یا مرزا اسداللہ خان لکھو۔ اور بہادر کا لفظ تو دونوں حال میں واجب اور لازم ہے۔"

یہ ہدایتیں غالب نے دستنبو میں اپنا نام لکھے جانے کے لیے دی تھیں۔ خط میں وہ ننگا نواب یوسف علی خاں بہادر نہیں لکھ سکتے تھے، اور نہ نواب یوسف علی خان بہادر رئیس رامپور لکھتے۔

رئیس عربی لغت ہے، اور معنے اس کے سردار اور بادشاہ کے ہیں۔ اردو میں دولتمند اور امیر کے مفہوم میں استعمال ہوتا تھا، اور ہوتا ہے۔ امیر کے معنے بھی سردار کے ہیں، لیکن اردو میں اس کے مفہوم اسی طرح کچھ اور ہیں، جیسے غریب کے معنے بھی اردو میں وہ رائج نہیں ہیں جو ماخذ زبان میں ہیں۔ رئیس التحریر اور رئیس المتغزلین میں رئیس کے وہی معنے ہیں، جو عربی میں ہیں ـــ اور یہ دونوں مرکب الفاظ بھی عربی ہی کے ہیں۔ ساٹھ برس پہلے حکیم اجمل خان کے نام سے پہلے مسیح الملک اور نام کے بعد رئیس دہلی اور رئیس اعظم دہلی لکھا جاتا تھا۔ اسی طرح اور بہت سے لوگوں کو بھی رئیس لکھا جاتا تھا۔ ان میں سے کوئی بھی حکمراں یا فرمانروا نہیں تھا۔ غرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ نواب رامپور کے لیے اور اُن کے خط میں مکتوب الیہ کے لیے رئیس نہیں لکھ سکتے تھے۔ اُن کی نسبت یہ لفظ دوسروں کے خطوں میں لکھ سکتے تھے، اور حقیقت یہ ہے کہ ایسا انھوں نے کیا بھی۔ دو مثالیں کافی ہوں گی:

۱۔ ۱۲؍جون ۱۸۵۹ء کے خط میں شیونرائن کو لکھا تھا:

"اب تم یہ بتاؤ کہ رئیس رامپور کے پاس بھی تمہارا اخبار یا معیار الشعرا جاتا ہے یا نہیں۔۔۔ امیر احمد ان کا نام ہے اور امیر تخلص کرتے ہیں۔ اور اب وہ رامپور میں نواب صاحب کے پاس ہیں۔۔۔ معیار الشعرا میں چھاپ کر ایک دو ورقہ یا چار ورقہ رامپور ان کے پاس بھیج دو۔ اور سرنامے پر یہ لکھو کہ در رامپور، بردر دولت حضور رسیدہ، بخدمت مولوی امیر احمد صاحب امیر تخلص برسد۔۔۔"

رئیس رامپور نواب یوسف علی خان ناظم کے لیے استعارہ ہے۔ لیکن پتے میں بردر دولت رئیس نہیں بردر دولت حضور ہے۔ اسی خط میں نواب صاحب سے بھی موسوم کیا ہے۔

۲۔ ۲۶؍ستمبر ۱۸۶۲ء کے، میر مہدی مجروح کے نام خط میں بھی رئیس کا لفظ ہے:

"مجتہد العصر کا حکم بجالاؤں گا۔ اور نہ رئیس کو، بلکہ مدار المہام ریاست کو لکھوں گا۔ رئیس میرے سوال کا جواب قلم انداز کر دے گا، اور مدار المہام امر واقعی لکھ بھیجے گا۔"

یہ اقتباس ایک اور وجہ سے بھی پیش کیا گیا ہے۔ بحث آگے آئے گی۔ اس مقام پر صرف یہ عرض کرنا ہے کہ مدار المہام وہ ہوتا ہے جسے انگریزی میں CHIEF EXECUTIVE کہتے ہیں۔ دولت آصفیہ حیدر آباد میں پرائم منسٹر کا عہدہ تھا۔ وزیر اعظم، مدار المہام کہلاتا تھا۔ سرکرشن پرشاد شاد اور سر اکبر حیدری وغیرہ اس عہدے پر فائز رہے۔ رامپور میں رئیس اور مدار المہام منصبوں کے نام نہ تھے۔

اور اب وہ نکتہ:

۲۲؍جولائی ۱۸۶۱ء کو غالب نے یوسف علی خاں ناظم کو ایک خط لکھا:
عکس خط نمبر ۲۱ ص ۱۲۷۲۔ غالب کے خطوط۔ جلد سوم

ولی نعمت آیۂ رحمت

تسلیم۔ معروض ہے آٹھ سات برس سے مصدر خدمت اور شریک دولت ہوں لازم کر لیا ہے کہ بیہودہ گذارش نہ کروں اور کہیں کسی

کی سپارش نہ کروں۔ بھائی حسن علی خان کے بیٹوں کے باب میں جو علی بخش خاں صاحب کو لکھا، اس کو میں نے سپارش نہ سمجھا تھا۔ مخبر تھا اور آپ کے اہلکاروں کو اس بات کی خبر دی کہ جس کا تدارک صاحبان ملک و حاکمان عہد پر لازم ہے۔ سو بمقتضائے نصفت و عدالت ؂ مقدمہ فیصل ہو گیا۔ میر سرفراز حسین اور میرن صاحب کو واللہ باللہ اگر میں نے بھیجا ہو۔ نوکری کی جستجو کو نکلے تھے۔ میر سرفراز حسین نوکری پیشہ اور میرن مرثیہ خواں، اور یہاں کے مرثیہ خوانوں میں ممتاز۔ خانساماں صاحب کو جو میں نے یہ لکھا کہ یہ ایسے ہیں اور ایسے ہیں۔ غرض اس سے یہ تھی کہ محرم میں جہاں دس یا پانچ مرثیہ خوان اور مقرر ہوتے ہیں میرن بھی مقرر ہو جائیں۔ آخر جا بجا تھانہ دار کوتوال تحصیلدار نوکر ہیں۔ میر سرفراز حسین ہوشیار اور کارگزار آدمی ہیں۔ کسی علاقہ پر یہ بھی مقرر ہو جائیں۔ یہ دونوں امر یا ان دونوں میں سے ایک ہو جاتا بہتر تھا۔ نہ ہوا بہتر۔ درحقیقت سپارش نہ تھی، صرف معرّف ہونا تھا۔ سپارش کرتا تو کیا میں آپ کو نہ لکھ سکتا تھا میری طرف سے خاطر جمع رہے ؎ زیستنا بلیم سالہا نہا بدرا ما ہر آن نفس کہ رضائے تو اندراں نبود داد کا طالب غالب

دوشنبہ ۲۲ جولائی ۱۸۶۱ء

سید معین الرحمٰن نے بھی یہ خط (کچھ جملے چھوڑ کر نقل کیا ہے، اور حواشی میں لکھا ہے:

"غالب کے اس اظہارِ خیال سے گمان ہوتا ہے کہ نواب یوسف علی خاں کے نام ۱۲ جولائی ۱۸۶۰ء کا خط لکھا تو گیا، لیکن [شاید] انھیں بھیجا نہیں گیا۔"

شاید نہیں، یقیناً اس موضوع پر کوئی خط غالب کا نواب کو نہیں ملا، ورنہ اس خط میں علی بخش خاں کا حوالہ نہ ہوتا۔

ہے تو کسی قدر اکتا دینے والی، ایک نظر نواب یوسف علی خاں کے نام غالب کے سارے خطوں کے القاب پر ڈالیں:

۱۔ حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت ______ ۱۵ فروری ۱۸۵۷ء

۲. جنابِ عالی ______ ۲۳؍اپریل ۱۸۵۷ء

۳. جنابِ عالی ______ ۲۷؍جولائی ۱۸۵۷ء

۴. حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت ______ ۷؍نومبر ۱۸۵۷ء

۵. خداوندِ نعمت ______ ۱۷؍نومبر ۱۸۵۷ء

۶. حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت ______ ۳؍دسمبر ۱۸۵۸ء

۷. ایضاً ______ ۲۷؍مارچ ۱۸۵۹ء

۸. ایضاً ______ ۱۷؍اپریل ۱۸۵۹ء

۹. ایضاً ______ ۱۸؍اپریل ۱۸۵۹ء

۱۰. ایضاً ______ ۱؍اکتوبر ۱۸۵۹ء

۱۱. ایضاً ______ ۵؍نومبر ۱۸۵۹ء

۱۲. ایضاً ______ ۷؍نومبر ۱۸۵۹ء

۱۳. ایضاً ______ ۲۷؍نومبر ۱۸۵۹ء

۱۴. ایضاً ______ ۸؍دسمبر ۱۸۵۹ء

۱۵. ایضاً ______ ۷؍فروری ۱۸۶۰ء

۱۶. ایضاً ______ ۱۲؍اپریل ۱۸۶۰ء

۱۷. حضور چند سطریں قصیدے سے پہلے ______ اپریل/مئی ۱۸۶۰ء

۱۸. حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت ______ ۱۳؍جولائی ۱۸۶۰ء

۱۹. ایضاً ______ ۷؍اپریل ۱۸۶۱ء

۲۰. ایضاً ______ ۱۳؍جولائی ۱۸۶۱ء

اس کے بعد بیس خط اور نواب یوسف علی خاں ناظمؔ کے نام ہیں، اور سب میں القاب ہے، | حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت |

قطع نظر اس کے، کہ غالبؔ مکتوب الیہم کے نام خطوں میں بہت کم القاب میں ردّ و بدل کرتے ہیں، نواب یوسف علی خاں کے نام چالیس خطوں میں القاب صرف دوسرے اور تیسرے خط میں جنابِ عالی ہے، سترہویں خط میں حضور۔ اور باقی سب خطوں

میں حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت ہے۔ سید معین الرحمٰن نے میرن صاحب کی مفروضہ بیاض سے غالب کا جو خط نواب یوسف علی خاں کے نام پیش کیا ہے اُس میں یہ ذیلی القاب ہے۔ پہلا القاب ہے "نواب یوسف علی خاں بہادر، رئیس رام پور" یہ دوہرے القاب، اور پھر اس پہلے القاب کی بنا پر اسے غالب کی تحریر کی نقل تسلیم نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ اس مکتوب الیہ کے نام ایک خط میں بھی دوہرا القاب نہیں ہے۔

ایک اور بہت اہم بات غور طلب ہے۔ ۲۲ر جولائی ۱۸۶۱ء کو جب خط میں غالب نے اپنے ولی نعمت آیۂ رحمت کو لکھا "سپارش کرتا تو کیا میں آپ کو نہ لکھ سکتا تھا" تو اس سے صرف دو ہی نتیجے اخذ ہوتے ہیں:

۱۔ غالب نے میر مہدی مجروح، میر سرفراز حسین اور میرن صاحب کی ملازمت کے لیے نواب کو خط لکھا ہی نہیں۔

یا

۲۔ اگر خط لکھا بھی تھا، تو ۲۲ر جولائی کا خط لکھنے سے پیشتر وہ ان حضرات سے واپس لے لیا تھا۔ وہ اپنے وظیفے کے سلسلے میں کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔ اگر یہ خط واپس لینے کے لیے انھیں پانی پت جانا پڑتا تو ضرور جاتے۔ وہ ایسا نازک معاملہ تھا۔ ایک برس میں تو کیڑا یا جھینگر اس کو چاٹ نہ سکتا تھا۔ اگر اس خط کو چاٹ لیا، تو باقی دونوں خطوں کو بھی چاٹا ہوگا کیونکہ تینوں خط ایک ساتھ رکھے ہوں گے۔ میرن صاحب کی بیاض کی شہادت ثقہ نہیں۔ یہ بات بھی واضح ہے خطوطِ غالب میں یوسف علی خاں کے نام ۲۲ر جولائی ۱۸۶۱ء کا جو خط ہے، وہ نواب کے خط کے جواب میں لکھا گیا تھا۔ نواب کے خط کا متن فراہم نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ خط میں برافروختگی کا اظہار تھا، اور یہ توقع تھا، منشور نہیں۔ نواب سے علی بخش خاں، خانِ ساماں نے میر سرفراز حسین اور میرن صاحب کو عاشور خانے میں ملازمت دینے کی سفارش کی ہوگی۔ میرن صاحب کی مبینہ بیاض سے غالب کا یہ مبینہ خط سید معین الرحمٰن کو ملا؛

(۲)

میرے شفیق مکرّم علی بخش خان صاحب خانساماں

خدا سلامت رکھے تم کو اور مراتب عالیہ پر پہنچائے میں تمہارا دل سے دوست ہوں اور تم کو اپنا دلی دوست جانتا ہوں یہ تو مجھ کو بتاؤ کہ میری سکونت کے حویلی میں تو صاحب عالم مرزا رحیم الدین بہادر آ رہے ہیں اب میں جو آؤں گا تو کہاں اتروں گا خیر تم جانو مجھے کہیں نہ کہیں جگہ دے دوگے۔ اس شہر کا حال تم کو معلوم ہے کہ کیسا تباہ ہوا سینکڑوں خاندان برباد ہو گئے امیر تباہ پھرتے ہیں چنانچہ یہ دو صاحب برخوردار میر مہدی اور نور چشم میر سرفراز حسین کہ بڑے عالی خاندان ہیں اور کبھی ان کے بزرگ امیر بھی تھے میرے بھی عزیزوں میں ہیں قابل عالم ہوشیار دیانت دار اب بے سر و سامان اور حیران نوکری کی جستجو کو نکلے ہیں۔ تنہا نوِدداری تحصیلداری کو توالی ہر طرح کے کام کو سرانجام دے سکتے ہیں رامپور پہنچے ہیں اس خط کے ذریعے سے تم سے ملیں گے میری خوشی اس میں ہے کہ تم ان کو روک لو اور کہیں جانے نہ دو ان کو جس طرح کے میرے عزیز ہیں اپنا متوسل سمجھو اور کسی مناسب کام پہ ان کو مقرر کر دو مگر کام ایسا ہو کہ جس میں ان کی عزت بنی رہے اور یہ اچھی طرح اوقات بسر کریں ہے ہے اگر وہاں ان کی نوکری نہ ہوئی اور یہ سر بھرا کیے اور طرف چلے گئے تو مجھ کو بڑا غم ہوگا جہاں تک آپ سے ہو سکے ان کی نوکری کے باب میں کوشش کیجیے گا اس سے زیادہ کیا لکھوں راقم اسد اللہ خاں مرقومہ جمعہ ۱۶؍ ذی الحجہ مطابق ۶؍ جولائی سنہ ۱۸۶۰ء

غالب کے اردو خطوط کا، اسلوب کے اعتبار سے بجا طور پر شہرہ ہے۔ ایسا القاب اُن کے کسی خط میں نہیں:

میرے شفیق مکرم علی بخش خاں صاحب خانساماں خدا سلامت رکھے اور مراتب عالیہ پر پہنچائے

اگر رامپور کے کسی بستے میں، یا علی بخش خاں کے وارثوں میں سے کسی کے پاس یہ خط ہے اور کبھی سامنے آیا، اُس کا موازنہ اس خط کے متن سے بڑا دلچسپ ہوگا۔ جن لوگوں نے غالب کے خطوں کا مطالعہ سرسری نہیں بالاستیعاب کیا ہے، وہ اس بات سے اتفاق کریں گے کہ ایک ایک لفظ، چُن چُن کر، اپنے معنیٰ اور اپنے ماحول میں معنیٰ کا لحاظ رکھ کر لکھا جاتا تھا۔ خاص طور سے اُن خطوں میں، جو اُن لوگوں کو لکھے جاتے تھے، جن سے کوئی غرض ان کی ہوتی تھی، یا جو ایسے منصبوں پر ہوتے تھے، جن کی خوشنودی اُن کے کسی مفاد سے جڑی ہوتی تھی۔ سرکاری اور کاروباری خطوں میں تو اس طرح مخاطب کیا جاتا تھا، اور کیا جاتا ہے، وہ بھی افسر کی طرف سے ماتحت کو۔ پھر اس کے بعد آداب نہیں ہوتا۔ غالب کا خط درست نقل ہوتا، اور انھوں نے "خانساماں" لکھنا ضروری ہوتا بھی تو کچھ ایسی عبارت ہوتی:

۱۔ شفیق مکرم خانساماں صاحب
۲۔ شفیق مکرم خانساماں علی بخش صاحب
۳۔ شفیق مکرم خانساماں علی بخش خاں صاحب

پہلی صورت مرجح ہے۔

میرے شفیق مکرم علی بخش خاں صاحب خانساماں

غالب کا نہیں، متصدیوں والا اسلوب ہے۔ نواب رام پور کے میر منشی سیل چند کے نام پانچ خطوں میں دوہرے القاب ہیں۔ دو میں نہیں۔ شاید اسی کی نقل کی گئی۔

خلیفہ احمد علی احمد رامپوری کے نام غالب کا ایک خط ہے۔ اس کا آغاز غالب کے خطوط میں ص ۱۵۴۲ پر یوں ہے:

جنابِ مولوی صاحب مخدوم مولوی احمد علی صاحب

غالب کے قلم سے یہ عبارت نہیں نکل سکتی تھی، اگرچہ خلیق انجم نے متن میں ایسا ہی رکھا ہے۔ لیکن متن کے ماخذ کے تحت ص ۱۶۱۲ پر اس حقیقت کی نشاندہی کی ہے کہ مکاتیبِ غالب (پہلا ایڈیشن) میں ص ۱۱۹-۱۱۷ پر عبارت یہ ہے: "جنابِ مولوی صاحب مخدوم، احمد علی صاحب۔ ۔ ۔" یہی غالب کا اسلوب سے قریب تر ہے اور متن میں بھی ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ لیکن یہاں ایک بات عرض کرنا شاید ضروری ہے۔ جب دو متون، مختلف ماخذوں میں ہوں، اور یہ دونوں ماخذ مصنف کی نظر سے نہ گذرے ہوں، تو ان میں سے صرف ایک متن درست ہو سکتا ہے۔ ایک یقیناً محرف ہوگا۔ اگر مصنف کی تحریر فراہم نہیں ہے، تو دونوں متون محرّف بھی ہو سکتے ہیں اور وضعی بھی: "جنابِ مولوی صاحب، مخدوم مولوی احمد علی صاحب، غالب کا اسلوب نہیں ہے۔ متبادل متن موجود ہونے کی وجہ سے یہ قابلِ تسلیم نہیں۔

ایک اہم بات میرن صاحب کی مبینہ بیاض میں خط کی تاریخ ہے۔

مرقومۂ جمعہ ۱۷، ذی الحجہ مطابق ۶ جولائی ۱۸۶۱ عیسوی

یہ بات کچھ بہت زیادہ قرینِ قیاس نہیں کہ ۶ جولائی ۱۸۶۰ء کو غالب نے خط لکھا اور جن کی سفارش کی تھی، وہ یا ان میں کوئی پورے ایک برس تک رامپور نہیں گیا۔ یہ بات بھی توجہ چاہتی ہے کہ ہجری تاریخ اور مہینہ لکھا گیا، لیکن اس خط میں سنِ ہجری غائب ہے۔ یوسف علی خاں کے نام خطوطِ غالب میں خط، جس کا ذکر کیا جا چکا ہے، ۲۲ جولائی ۱۸۶۱ء کا ہے۔ گویا چند ہفتے پہلے علی بخش خاں نے نواب سے گذارش کی ہوگی، اور نواب نے غالب کو کسی قدر ناخوشگوار الفاظ میں خط لکھا ہوگا۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ نواب نے خط لکھا ہی ہو۔ علی بخش خاں بھی خط لکھ سکتے تھے کہ ان کی سفارش پر ولی نعمت کا مزاج کچھ برہم ہوا۔ ان میں سے جو صورت بھی ہو۔

خط کی تاریخ غیر مطلب ہے۔ کیونکہ ایک برس سے کچھ زیادہ کا عرصہ درمیان میں ہے۔
خط کے مندرجات بھی توجہ چاہتے ہیں۔ پہلے آداب :

۱۔ | خدا سلامت رکھے تم کو، بمراتبِ عالیہ پہنچاوے |

خانساماں کے معنے آج رکابدار اور باورچی کے ہیں۔ ایک سو چونتیس پینتیس برس پہلے یہ معنے نہیں تھے۔ رامپور بھی ایک چھوٹا موٹا دربار تھا۔ اور خانساماں ایک عہدہ تھا۔ اور یہ عہدے دار نواب سے قربت رکھتا تھا۔ رتبے کے جو معنے رائج ہو گئے ہیں، اُس سے سب واقف ہیں۔ چترال کا فرمانروا مہترِ چترال کہلاتا تھا) غالب جو اتنے محتاط تھے، اتنے INDISCREET نہیں ہو سکتے تھے کہ خانساماں کے مراتبِ عالیہ پر پہنچنے کی دعا خط میں لکھتے، اور احساس دلاتے کہ تم بڑے حقیر درجے کی ملازمت پر ہو۔

۲۔ یہ تو مجھ کو بتاؤ کہ میری سکونت کی حویلی میں تو صاحبِ عالم مرزا رحیم الدین بہادر آ رہے ہیں۔ اب میں جو آؤں گا تو کہاں اترواؤ گے۔ خیر تم جانو۔ کہیں نہ کہیں تو جگہ دے دو گے۔

۳۔ فروری ۱۸۶۰ء کو رامپور سے غالب نے حکیم غلام نجف خان کے نام ایک خط لکھا تھا۔ اُن دنوں وہ نواب کے مہمان تھے، اور باقر علی خاں اور حسین علی خان، دونوں کے ساتھ تھے۔ مہمان خانے کا حال، جہاں اُن کا قیام تھا، خود انہی کے الفاظ ہیں :

ایک مکان، کہ وہ تین چار کمروں پر مشتمل ہے، رہنے کو ملا ہے۔ یہاں پتھر تو دوا کو بھی میسر نہیں۔ خشتی مکان گنتی کے ہیں۔ کچی دیواریں اور کھپریل۔ سارے شہر کی آبادی اسی طرح پر ہے۔ مجھ کو جو مکان ملے ہیں وہ بھی ایسے ہیں

اب تخیّل اور تصور کو کتنا ہی کھینچیے، جن کھپریلوں میں غالب کا قیام رامپور میں رہا، ان کو حویلی تو کسی طرح بھی نہیں کہا جاسکتا۔ غالب تو ہرگز ان کھپریلوں کو، کچی دیواروں کے مکانوں کو، جن میں پتھر تو کیا، اینٹ بھی نہ لگی ہو، حویلی نہیں کہہ اور لکھ سکتے تھے۔ دلّی حویلیوں کا شہر تھا اور غالب جانتے تھے کہ حویلی کسے کہتے ہیں۔ قصیدے میں حویلی باندھتے، تو دوسری بات تھی کہ وہاں غلو، مبالغہ، ابلاغ، تبلیغ ـــ سب جائز ہیں، خط میں ایسا نہیں کر سکتے تھے۔

مختلف حضرات کے نام جو خط ہیں، اُن سے ظاہر ہے کہ جنوری ۱۸۶۰ء کے اواخر میں غالب رامپور سے گئے تھے۔ اور برسات میں دوبارہ رامپور جانے کا ارادہ تھا لیکن گئے نہیں۔ جولائی میں، جس تاریخ کا زیرِ بحث خط بتایا گیا ہے، کم و بیش یہ بات طے ہو گئی ہوگی کہ وہ برسات میں رامپور نہیں جائیں گے۔ بلکہ رامپور نہیں گئے۔ اس اعتبار سے بھی اُن کے رامپور جانے، اور اسی حویلی میں اترنے اور کہیں نہ کہیں جگہ دینے کی بات کی منطق نہیں۔ میرزا رحیم الدین یا کوئی بھی مہمان خانے میں ٹھہرایا جاسکتا تھا۔ وہ حویلی غالب یا کسی اور مہمان کے لیے مخصوص نہ تھی۔ اُس حویلی میں میرزا رحیم الدین کے قیام کا زاویہ بھی تحقیق طلب ہے۔ اس خط کے سیاق و سباق میں زیادہ تدقیق کی شاید اس لیے ضرورت نہیں کہ یہ عبارت ان دو نکات کی وجہ سے حقیقی نہیں، وضعی ہے۔ غالب کے خطوں کی ایک خصوصیت یہ بھی کہ وہ حشو و زواید سے پاک ہیں۔ شعوری طور پر وہ غیر متعلق بات نہیں لکھتے تھے، اور اپنی اس روش کے بارے میں انھوں نے اپنے خطوں میں بھی وضاحت کی ہے۔ خط کا یہ ٹکڑا غالب کے مزاج کے مطابق نہیں ہے۔ ان سطور سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ غالب سمجھتے تھے کہ یہ حویلی اُن کے قیام کے لیے مخصوص کر دی گئی ہے۔ خوب۔

رامپور سے فروری ۱۸۶۰ء کے شروع میں غالب نے ایک خط منشی ہرگوپال تفتہ کو لکھا تھا۔ اس میں بے شک یہ جملے ہیں:

"۔۔۔ چار دن والی شہر نے اپنی کوٹھی میں اُتارا۔ میں نے مکان جداگانہ مانگا۔ دو تین حویلیاں برابر برابر مجھ کو عطا ہوئیں۔ اب اس میں رہتا ہوں۔"

تفتہ بہت عزیز شاگرد تھے۔ اس کے باوجود وہ اپنی شبیہ ان کے لیے اپنے ذہن

تک جداگانہ رکھتے تھے۔ تفتہ نے یہ کچھ کیے نہیں دیکھے تھے۔ غالب اُنھیں تو لکھ سکتے تھے کہ ایک نہیں، تین تین حویلیاں جو متصل تھیں، رہنے کے لیے اُن کو دی گئیں۔ لیکن خان ساماں کے خط میں ان کھپریلوں کو وہ حویلی نہیں لکھ سکتے تھے۔

تفتہ کو لکھا ہے: دو تین حویلیاں برابر مجھ کو عطا ہوئیں۔ ہزار بارہ سو

تو اندازے کے لیے لکھا جا سکتا تھا۔ لیکن دو تین میں اندازہ لگانے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ حویلیاں ہوتیں تو یا دو ہوتیں یا تین ہوتیں۔ حویلی تھی ہی نہیں تفتہ کے نام اسی زمانے کے اور خطوں سے واضح ہوتا ہے کہ تفتہ دو بار رامپور سے منسلک ہونے کے آرزومند تھے، اور غالب نے ان کو امید بھی دلائی تھی۔ دو تین حویلیوں کا ذکر کر کے غالب نے تفتہ کے دل میں امید کو زندہ رکھنے کا ایک بہانہ دیا تھا۔ اور کچھ نہیں۔ حقیقت اس رہائش گاہ کی وہی تھی جو ۳، فروری کے خط میں حکیم غلام نجف خان کو لکھی تھی۔ یعنے ایک مکان جو تین چار کمروں پر مشتمل تھا، دیواریں کچی اور چھت کھپریل کی۔ کمروں میں تین چار کے معنے یہ ہیں دالان یا صحنچی قسم کی کوئی چیز تین کروں کے ساتھ ہوگی، جسے کمرہ شمار بھی کر سکتے تھے اور نہیں بھی۔

اس خط میں بھی جملے کے اختتام پر ۰ اور پیراگراف کے ختم ہونے پر ۱۲ نہیں ہے۔

(۳)

جناب آغا صاحب مکرم و معظم آغا محمد حسین صاحب سلمکم اللہ تعالیٰ

وہ سلام جو غلامان علی ابن ابی طالب علیہ السلام آپس میں کیا کرتے ہیں آپ کی جناب میں امعفان بھیجتا ہوں۔ شرمسار ہوں، گنہ گار ہوں۔ مع ہذا امرزش کا امیدوار ہوں اور پانچ مہینے میں کبھی کوئی خط نہ لکھا۔ یہی سوچتا رہا کہ کیا لکھوں۔ آپ سے مجھ کو شکایت نہیں۔ مجھ کو چاہیے تھا کہ دلی پہنچ کر خط لکھتا۔ اب جو ایک تقریب بہم پہنچی تو وہ حجاب رفع ہو گیا۔ منشاء تحریر یہ کہ، یہ تینوں صاحب کہ بمنزلۂ یک جان و سہ قالب ہیں۔ یعنی برخوردار میر مہدی، قرۃ العین میر سرفراز حسین و نور چشم میر افضل علی وہاں پہنچتے ہیں۔ عالی خاندان ہیں، ناز پروردہ ہیں۔ یہ کہاں اور سفر کہاں۔ اپنے گھروں میں چین کرتے تھے۔ اب وہ گھر ہی نہیں، تو چین کہاں۔ توکلت علی اللہ نوکری کی جستجو کو نکلے ہیں۔

مرحلہ اول رام پور ہے۔ خدا کرے وہاں نوکر ہو جائیں، ورنہ خدا بھلانے آپ و دانہ کہیں کہاں لے جائے گا۔ اور اس سفر اضطراری میں ان کو کیا پیش آئے گا۔۔۔۔ میر مہدی شاعر ہیں۔ مجروح تخلص کرتے ہیں۔۔ میر سرفراز حسین کا تو کیا کہنا ہے۔ فقہیات طریق امامیہ کے عالم اور بہت متورع اور متقی ہیں۔ میر افضل علی، جو کہ میرن صاحب کہلاتے ہیں جناب سیدالشہدا علیہ التحیۃ والثنا کے ذاکر ہیں۔ کیا آواز ہے اور مرثیہ خوانی میں کیا سوز و ساز ہے۔ ان کو صلاح دیجیے گا۔ رہنمائی کیجیے گا۔ حتی الوسع دوستی کار کی بھی کوشش فرمائیے گا۔ حصول کار کے طریق بتایئے گا۔۔۔ اس خط کو دیکھ کر اگر میرا گناہ معاف ہو جائے تو جواب لکھیے گا۔

راقم

اسد اللہ خاں غالب اثنا عشری

مرقوم جمعہ ۱۶ رذی الحجہ ۱۲۷۶ ہجری

اس خط میں القاب اور آداب، دونوں غور طلب ہیں۔

۱۔ "جناب آغا صاحب مکرّم و معظم آغا محمد حسین صاحب سلمکم اللہ تعالیٰ"

یہاں بھی دوہرے القاب ہیں۔ اور یہ غالب کے اسلوب کے مطابق نہیں۔

۲۔ وہ سلام کہ جو غلامانِ علی ابن ابی طالب علیہ السلام آپس میں کیا کرتے ہیں،

آپ کی آپ کے جناب میں ارمغان بھیجتا ہوں

ایسا کون سا سلام ہے، جو صرف اثنا عشری عقیدے کے حضرات ایک دوسرے کے لیے مخصوص رکھتے ہیں؟ — غالب کے کسی اور خط میں نہ تو درج ہے، اور نہ اس کی طرف کوئی اشارہ ہے۔ غالب نے اپنے اثنا عشری ہونے کا اظہار کئی خطوں میں کیا ہے۔ اس کے باوجود اثنا عشری مکتوب الیہم کے لیے آداب، سلام اور دعائیں سنی اور ہندو مکتوب الیہم سے مختلف نہیں۔ سلام مسنونِ اسلام بھی ہے۔ لیکن یہ تحقیق طلب ہے کیونکہ ایک

اور ماخذ کے حوالے سے سلام مسنون الاسلام بھی ہے۔

سلام، سلامتی کی دعا ہے۔ اور اسے [رمضان] سا تا شاید غالب سے بھی متوقع نہیں، جو بات میں بات پیدا کرتے تھے اور مضمون اگر نیا نہ بھی ہو تو دوسروں سے مختلف اسلوب میں ادا کرتے تھے۔

۲۔ "اس پانچ مہینے میں کبھی کوئی خط نہ لکھا":

رامپور سے غالب ہرگوپال تفتہ کو بھی خط لکھتے رہے۔ ۳۱ مارچ ۱۸۶۰ء کے خط میں، دلی واپس آنے کے بعد ان کو لکھا:

"میاں، میں جو آخر جنوری کو جا کر [آخر مارچ] میں یہاں آگیا ہوں تو کیا کہوں . . ."

آغا محمد حسین کے نام خط یوں ختم ہوتا ہے: "راقم اسد اللہ خاں غالب اثنا عشری، مرقومہ ۱۴ ذی الحجہ ۱۲۷۶ ہجری":

پہلے دو خط، جن کے عکس پیش کیے جا چکے ہیں، اُن کے اختتام پر تاریخیں یوں ہیں،

۱۔ جمعہ ۶ جولائی ۱۸۶۰ء

۲۔ جمعہ ۱۶ ذی الحجہ مطابق ۶ جولائی ۱۸۶۰ء

اس خط کا عکس جو چھپا ہے، اس میں عیسوی سنہ اور تاریخ نہیں ہے۔ فاضل سید معین الرحمن نے بھی تسلیم کیا ہے کہ یہ ۶ جولائی ۱۸۶۰ء کا خط ہے، اور ان کے الفاظ میں اسے "آغا محمد حسین کے نام غالب کا پہلا معلوم خط خیال کرنا چاہئے"۔ لیکن اسے غالب کا خط تسلیم کرنے میں سب سے بڑی قباحت یہ ہے کہ غالب مارچ میں رامپور سے واپس آ گئے تھے۔ ۶ جولائی تک تین مہینے اور کچھ دن ہوتے ہیں۔ پانچ مہینے کسی صورت سے بھی نہیں۔ یہ غلطی غالب سے نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ غلطی جو غالب سے نہیں ہو سکتی تھی، اس کے اس خط میں موجود ہونے کے باوجود کیا اسے غالب کے مستند خط کی مستند نقل مانا جا سکتا ہے؟

اس سوال پر اپنی معروضات ختم کرنے سے پہلے میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ کوئی تحریر غالب سے منسوب کرنے سے پہلے، اصل (عکس نہیں) کسی اہم ادارے میں رکھی جانا چاہئے، تاکہ کاغذ اور غالب کی تحریر کو پرکھا جا سکے۔

پروفیسر نذیر احمد

غالب کے ایک قریبی معاصر :
وارستۂ سیالکوٹی اور اس کی کتاب "مصطلحات الشعراء"

(وارستہ جس کا نام سیالکوٹی مل تھا، فارسی زبان کا عظیم محقق گذرا ہے، اس کی تاریخ وفات ۱۱۸۱ھ بتائی جاتی ہے جو صحیح نہیں معلوم ہوتی اس لیے کہ اس کی مشہور تصنیف مصطلحات الشعراء ہے جو ۱۱۸۰ھ میں لکھی جانی شروع ہوئی، اور چند سال میں یاۂ تکمیل کو پہنچی ہوگی، اس کتاب کے مواد کی جمع آوری میں ۱۵ سال صرف ہوے تھے تو س کی ترتیب میں دو تین سال تو لگے ہوں گے۔ غالب کی پیدائش ۱۲۱۲ھ میں ہوئی تھی، اس سے ظاہر ہے کہ وارستہ غالب کی پیدائش سے چند سال پہلے فوت ہوا ہوگا ور ایک امر جس کی وجہ سے وارستہ اور غالب ایک دوسرے سے قریب آجاتے ہیں وہ ہے فارسی زبان کے مستند یا غیر مستند ہونے کے سلسلے میں دونوں کے نقطۂ نظر میں اتحاد)

ہندوستانی دانشوروں اور محققوں نے فارسی زبان و ادب کی بعض شاخوں تیں جیسی نمایاں خدمات انجام دی ہیں خود ایرانی دانشوروں کی کوشش ان کے مقابلے میں تی وقیع نہیں، اور یہ کہنا نامناسب نہ ہوگا کہ شاید ہی ایسا کوئی ملک ہو جہاں کے لوگوں نے غیر ملکی زبان میں ایسی دسترس حاصل کر لی ہو کہ خود اہل زبان ششدر

رہ گئے ہوں، یوں تو زبان وادب کے بعض شعبے جیسے تذکرہ نویسی، دستور زبان فرہنگ نویسی وغیرہ شعبوں میں اہل ہند کے کارنامے ایرانیوں سے بڑھ کر ہیں۔ اور فرہنگ نویسی میں ہندوستانیوں نے جو کارنامے انجام دیئے ہیں ان کا عشر عشیر بھی اہل ایران کا حصہ نہیں، ہندوستان میں فارسی کے مروج ہونے کے کچھ ہی عرصے بعد فرہنگیں لکھی جانے لگی تھیں، لیکن کسی بہت قدیم فرہنگ کا سراغ نہیں ملتا، سب سے قدیم فرہنگ جو مکشوف ہوئی ہے وہ فرہنگ قواس ہے جو علاء الدین خلجی[1] کے زمانے (۶۹۵ - ۷۱۵ھ) میں مرتب ہوئی، اس کے بعد تو فرہنگوں کا ایک سلسلہ ملتا ہے جو ساری کی ساری اس سرزمین میں معرض وجود میں آئیں، ان میں بیشتر ایسی فرہنگیں ہیں جو مصطلحات سے خالی ہیں، البتہ بعض فرہنگوں میں اس طرف بھی توجہ ملتی ہے، لیکن ایسی فرہنگیں شاذ ہیں، بارہویں صدی ہجری میں مصطلحات کی طرف خصوصی توجہ ہوئی، چنانچہ اس دور میں چار نہایت نفیس فرہنگیں معرض وجود میں آئیں جن میں اصطلاحات و محاورات اور تلمیحات کا عنصر غالب ہے، اور چار فرہنگ نویس ایسے ہیں جن کا فارسی میں کوئی بدل نہیں، اور وہ ہیں آنند رام مخلص (وفات ۱۱۶۴ھ) صاحب مراۃ الاصطلاح، سراج الدین علی خان آرزو (وفات ۱۱۶۹ھ) صاحب سراج اللغۃ، و چراغ ہدایت و مثمر، لالہ ٹیک چند بہار (وفات ۱۱۸۰ھ) صاحب بہار عجم، اور وارستہ سیالکوٹی (وفات بعد ۱۱۸۱) صاحب مصطلحات الشعراء، ان کتابوں کا کوئی جواب فارسی میں نہیں ملتا، ان محققین نے سارا فارسی ادب کھنگال ڈالا، مشکل ہی سے نظم و نثر کی کوئی ایسی کتاب ملے گی جن سے ان مصنفین نے استفادہ نہ کیا ہو، یہ بھی قابل ذکر بات ہے کہ بارہویں صدی کے ان شہرۂ آفاق محققین میں سب اصلاً و نسلاً ہندوستانی تھے، اور ایک کے علاوہ تین ہندو تھے، گویا تحقیق

---

[1] راقم کی تصحیح سے یہ کتاب تہران سے شائع ہو گئی ہے۔ دوسری قدیم فرہنگ، لسان الشعراء ہے وہ بھی راقم کی تصحیح کے بعد ایران ہاؤس نئی دلی سے اسی سال طبع ہوئی ہے۔

زبان کا سہرا ہندوؤں کے سر ہے۔

بارہویں صدی میں جس موضوع کے بارے میں زبان کے محققین دو گروہ میں بٹ گئے وہ ہے زبان کے بارے میں ہندوستانی شعرا و مصنفین کے کلام کا معیاری ہونا، علی حزیں (وفات ۱۱۸۱) کے ہندوستان میں آتے ہی یہ معاملہ کافی زور پکڑ گیا، وہ ہندوستانی محققین و شعرا کو خاطر میں نہیں لاتے تھے، ایرانیوں کے علاوہ بعض اہل ہند بھی علی حزیں کے موید ہوئے، انھیں میں وارستہ بھی تھے، اور ہمارے محبوب شاعر غالب دہلوی نہ صرف علی حزیں کے موید تھے بلکہ اس سلسلے میں ان کا نقطۂ نظر جارحانہ تھا، وارستہ باوجود اس کے کہ اہل ہند کی زبان کو استناد کا درجہ نہیں دیتے تھے، ان کی کتاب مصطلحات الشعرا میں پچاسوں ہندوستانی شاعروں کے کلام سے استناد ہوا ہے سراج الدین علی خان آرزو اس نقطۂ نظر کے سخت مخالف تھے انھوں نے حزیں کی غلطیوں پر ایک رسالہ تنبیہ الغافلین کے نام سے لکھا، وارستہ نے اس کے جواب میں ایک کتابچہ مرتب کیا جس کا نام رجم الشیاطین ہے، عنوان ہی ظاہر ہے کہ وہ خان آرزو کے کتنے مخالف ہوں گے لیکن نکتے کی بات یہ ہے کہ مصطلحات الشعرا میں خان آرزو کے اشعار اور اقوال سند میں پیش کئے ہیں۔

وارستہ کا نام سیالکوٹی مل تھا، سیالکوٹ سے جو پنجاب کا ایک مردم خیز شہر ہے ان کا تعلق تھا، ان کے استاد میر محمد علی رائج تھے، جن کا ذکر[1] ان کی کتابوں میں ہوا ہے وارستہ کی حسب ذیل کتابوں کا نام ملتا ہے۔

۱۔ مطلع السعدین فن انشا و شعریات ہے، رشید وطواط کی حدائق السحر سے کافی استفادہ ہوا ہے، لیکن شعرائے متقدمین کے بجائے شعرائے متاخرین کے کلام سے استناد ہوا ہے، یہ کتاب وارستہ کی تحقیقی و انتقادی صلاحیت کا اعلیٰ نمونہ ہے، ۱۱۶۸ میں یہ کتاب مرتب ہوئی اور ۱۸۸۰ء میں طبع ہوئی۔

---

[1] دیکھیے مصطلحات الشعرا ص ۲۰۱۵، ۲۷، مصطلحات کی تالیف کے وقت وہ فوت ہو چکے تھے۔

۲۔ صفات کائنات یا عجائب و غرائب، فارسی انشاپردازوں کے کلام کا انتخاب ہے۔ اس میں خودان کے اور آنندرام مخلص کے نثر کے نمونے نقل ہوئے ہیں کتاب طبع ہو چکی ہے۔

۳۔ جُنگ رنگارنگ، یہ شعرا کی بیاض تھی، اسپرنگر نے اس کا نسخہ دیکھا تھا لیکن فی الحال اس کا نسخہ نہیں ملتا۔

۴۔ رجم الشیاطین، تنبیہ الغافلین کی رد میں لکھی گئی، جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے آرزو نے تنبیہ الغافلین میں علی حزین کے کلام پر اعتراض کیا تھا، وارستہ نے اس کتاب کے جواب میں یہ کتاب لکھی۔

۵۔ مصطلحات الشعرا، وارستہ کی سب سے مشہور و مقبول کتاب ہے، یہ ان کی اعلیٰ انتقادی صلاحیت کی آئینہ دار ہے، مصطلحات الشعرا سے کتاب کے شروع کئے جانے کی تاریخ نکلتی ہے یعنی ۱۱۸۰ھ[1]، مقدمے میں ہے:

"و این نامہ را بمصطلحات الشعرا کہ مشعر تاریخ شروع[2] تالیف است، موسوم گردانیدم۔"

مقدمے کا خلاصہ یہ ہے:

"سرنوشت ازلی کے تقاضے کی وجہ سے شب و روز شعرا کے دواوین کا مطالعہ کرتا رہا اور الفاظ و معانی کی تحقیق سے ایک گونہ عشق سا ہو گیا، مطالعے کے دوران فارسی کے نادر اور غریب الاستعمال الفاظ سے دوچار ہونا پڑا، ان کے حل کرنے کا خیال ہوا، ہرچند لغات کی کتابیں دیکھیں، ان سے بھی مقصد حاصل نہ ہوا (مجبوراً) ایرانی زباندانوں کی طرف رجوع کرنا پڑا، اس تگ و دو میں ۱۵ سال صرف ہوئے، ایرانی زباندانوں سے بہت کچھ معلومات حاصل ہوئیں جنھیں شاعروں اور سخن پردازوں کے فائدے کے لیے ضبط تحریر میں لے آنے کا خیال مستحکم ہوا، اور باوجود اس کے کہ ان کی تشریح بعض کتابوں

---

[1] ڈاکٹر سید عبداللہ نے یہ غلطی کی تاریخ بتائی ہے (ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ) طبع لاہور، ص ۱۴۶۔

[2] ڈاکٹر صاحب نے عہد طفلی لکھا ہے (طبع لاہور، ص ۱۴۶)

میں موجود ہے طلبہ کی سہولت کے لیے انھیں یہاں جمع کر لیا، لیکن ایسے الفاظ و محاورات جو تازہ گویوں کے کلام میں نظر نہیں آئے، انھیں ترک کر دینا ضروری سمجھا"

بعض لوگوں نے مقدمے کی عبارت سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ وارستہ ایران گئے[1] ۱۵ سال تک وہاں کے دانشوروں سے لغات و محاورات فارسی کی تحقیق و تفتیش کرتے رہے، لیکن کچھ ایسا لگتا ہے کہ اس عبارت کا مفہوم یہ ہے کہ وہ ایرانی دانشور جو ہندوستان میں مقیم تھے، ان سے لغات کی تحقیق کرتے رہے اور اس کام میں ۱۵ سال کی طویل مدت صرف ہو گئی

ماخذ: مصنف کے اپنے ماخذ کی حسب ذیل کتابوں کے مخففات درج کئے ہیں

ج: جہانگیری
ک: کشف اللغات
م: موید الفضلا
ل: مدار الافاضل
ق قاموس
ر رشیدی
ت تاج المصادر
خ شرح دیوان خاقانی
خ شرح قصاید انوری
ط لطایف مثنوی معنوی
ص صراح
ا ابراہیم شاہی
ن منتخب اللغات

---

[1] اگر ایران گئے ہوتے تو صاف صاف لکھنے میں کوئی امر مانع نہ تھا۔ بظاہر وہاں نہیں جا سکے ہیں اس لیے گھما پھرا کر مبہم انداز میں ایرانیوں سے استفادہ کا ذکر کرتے ہیں، اقرار بھی نہیں، انکار بھی نہیں۔

"محاورہ و دانان ایران" کا مخفف "م" درج کیا ہے، بظاہر اس سے مراد کوئی کتاب نہیں بلکہ وہ شعا ہی بیانات ہیں جو ایرانی زبان دانوں سے سنا لیکن وارستہ کے صرف یہی ماخذ نہ تھے، اس نے شعرا کے سیکڑوں دواوین کے علاوہ، تاریخ و ادب کی متعدد کتابوں سے استفادہ کیا ہے لغت کی اور بھی کتابیں وارستہ کے پیش نظر رہی ہوں گی، ان میں سے کم از کم لغت مجد الدین قوسی کا بار بار ذکر ملتا ہے۔ چند نثری تصانیف جن سے مولف نے استفادہ کیا ہے یہ ہیں:

رسائل طغرا ص ۱۱، مکتوبات جلال طباطبا ۳۸
رسالہ ساطع کشمیری ص ۷۰،
تفسیر حسینی ۲۸ عالم آرای عباسی ۲۴۲
رسالہ مقیمای حسینی ۲۸، مقیمائے قمی در تعریف کشمیر ۳۴۱
کارستان منیر لاہوری ۲۰
رزمیہ منیر لاہوری ۲۳
اکبر نامہ ابوالفضل ۲۴، ۶۵، آئین اکبری ۳۴، ۱۵۳، ۲۶۳، ۲۶۲، ۲۷۰، ۲۷۷
سہ نثر ظہوری دیباچہ خوان خلیل
ظفر نامہ شرف الدین علی یزدی ۲۰، ۳۱۶
نفحات الانس جامی ۴۹
دستور العمل میر اصفہان صادق دست غیب ۶۵، ۸۴، ۳۴۲
رسالہ عبداللطیف خان تنہا ۳۲۵
وقایع محاصرہ حیدر آباد نعمت خان عالی ۸۱، ۸۷، عالی مفرح القلوب ۲۷۲
ترجمہ جہاجارت ۱۳۰ تیمور نامہ ہاتفی ۳۳۱
شرح قصاید عرفی ۱۵۱ رسالہ ظہرای تفرشی ۲۱۷، اعجاز خسروی ۳۳۱
رسالہ محسن فانی ۸۰ تذکرۂ دولت شاہی ۳۱۶

...رائے کثرت سے حوالے ہیں، بعضوں کے نام یہ ہیں:

حرف ا

اشرف مازندرانی، الٰہی ہمدانی، آہی، آصفی، اسماعیل ایما، ابن یمین امامی خرد
میرافسر، میر سنجر (خانزماں)، امانی، افضل کاشی، افضل ثابت، اہلی شیرازی، ابراہیم ادہم
اختر یزدی، امیر شاہی، بسحاق اطعمہ، اعجاز اصفہانی، اثیر اخسیکتی، میر مومن ادائی،

حرف ب

شرف الدین پیام

حرف ت

تاثیر (محسن)، تقی اوحدی، تجلی (علی رضا)، عبداللطیف خان تنہا

حرف ج

جلال اثیر، جلال سیادت، جامی، جلال آذری، جعفر تبریزی، سید محمد جامہ باف
داراب جویا، سید حسین جرأت خلف سید علی سبزواری

حرف ح

حافظ، حیاتی گیلانی، حسین ثنائی، حاذق گیلانی، حسن رفیع، حسن دہلوی

حرف خ

خاقانی، خاشع صفاہانی، امیر خسرو، خان خالص، خان آرزو، خواجوی کرمانی، خال
(امتیاز علی خاں)

حرف د

درکی قمی، درویش والہ، رضی دانش

حرف ذ

ذوقی اردستانی، ذہنی تبریزی

حرف ر

حکیم رکنا، رہی شاپور، رفیع واعظ، فصاحت خان راضی (میر محمد علی)، رائج،
رضای کاشی، ریاضی، اسعد اللہ راقم

حرف ز

زلالی، زکی ندیم، زکی ہمدانی

حرف س

میر سنجر، سالک، سلیم، ساطع، سلمان ساوجی، حکیم سنائی، سعید، عطا حکیم، سیفی، سوزنی
سحابی لاری، سعدی

حرف شین

شوکت، شانی تکلو، حکیم شفائی، شاپور، شکوہی جربادقانی، شہیدی قمی، شرف شفوہ
شہرت محمد حسین، شریف تبریزی

حرف ص

صائب، صادق دست غیب، صیدی تہرانی، میر صیدی، میرزا صادق، صالح ہروی

حرف ط

ملا طغرا، طالب آملی، طاہر وحید

حرف ظ

ظہوری

حرف ع

عرفی شیرازی، علی نقی کرہ، حسن بیگ عجزی، عزت فیروز آبادی، علی قلی خان اعظم
بن حسین خان شاملو، سلطان عبداللہ، عظیم نیشاپوری

حرف غ

غنی کشمیری، عبدالغفور بروجردی، غزالی مشہدی، غیاث نقش بند

حرف ف

فغانی، فیضی فیاضی، فیاض لاہجی، فرج اللہ شوشتری، فوقی یزدی، فانی ہروی،
فردوسی، فصیحی، فہمی، فکرت (غیاث منصور) فوجی نیشاپوری

حرف ق

قدسی، عبدالغنی بیگ قبول، قاسم گنابادی، قاسم مشہدی، قاسم ارسلان
حرف ک: کمال اسماعیل، کمال خجندی، کاتبی، کلیم کاشانی

حرف گ

گرامی ولد قبول

حرف ل

لسانی، لطفی نیشاپوری

حرف م

میر معصوم کاشی، مسیح کاشی، مومن، مفید بلخی، مخلص، محتشم، معز فطرت، منیر لاہوری، مغانی بلخی، میر معزی، میلی ہروی، میر نجات، موجی، مولوی رومی، مظہر کاشی، میرم سیاہ، میرزا محمد سعید، مومن بیگ ترکمان، محمد امین سبزواری، میر عبد الہادی، مومن استرآبادی، ملک قمی، میر محمد رضا، منصف تہرانی، محمد علی ماہر، محمد زمان لاہجی

حرف ن

نظام دست غیب، نظیری نیشاپوری، ناظم تبریزی، نصیرای ہمدانی، نصیرای بدخشی، نسبتی کاشی، نظامی گنجوی، نزاری قہستانی، نصیبی گیلانی، نادم گیلانی، نجیب خالص استرآبادی، نشاطی سمرقندی۔

حرف و

وحشی، والہ ہروی، وجہی سیستانی، وحید (شاید طاہر وحید)، والا (اسلام خان)، واعظ قزوینی، وارستہ، وحدت قمی

حرف ہ

ہاتفی، ہجری، شمشیر گر قمی

حرف ی

یمی کاشی

شاعروں کی فہرست پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں متقدمین شعرا بہت ہی کم ہیں، اکثر متاخرین ہیں، ان میں بعض ایسے ہیں جن کا ذکر صرف تذکروں تک محدود ہے۔ قابل ذکر امر یہ ہے کہ مشکل سے ایسے مندرجات ہوں گے جن کی مثالیں کتاب میں دی نہ

ان امثلہ کی تلاش میں ہمسال کی مدت زیادہ نہیں ہے۔

ترتیب کتاب: کتاب کی ترتیب حروف تہجی سے ہے، لیکن عنوانات کے ساتھ، حرف اول، تناظر اور حرف دوم منظر کے عنوان سے ذکر ہوئے ہیں، مثلاً تناظر الف از منظر الف: آب و گل۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آیۂ مجاب ۳-۲۶

تناظر الف از منظر بای موحدہ: ابا۔ ۔ ۔ ۔ ابو المطراق ۲۶-۲۹

تناظر الف از منظر حای مہملہ : احرامی واحرام۔ ۔ ۔ ۲۹

تناظر الف از منظر رای مہملہ : اردہ۔ ۔ ارتنگ ۳۰-۳۱

تناظر الف از منظر زای معجمہ : از آسمان۔ ۔ ۔ ۳۲-۳۹ وغیرہ وغیرہ

مصطلحات الشعراکے خصائص

۱۔ اس کتاب میں ایسے مفرد و مرکب الفاظ ہیں جو فنی تخصیص سے عاری ہیں مثلاً آبخانہ، آبدانی، آتش کش، آتش گیر، آسن، الفتہ، آماج، آماجگاہ، ابداری، ابریشم امرود، ام الصبیان، ابلق، آفتابی، ارجاف و اراجیف، ارسال، ارغنون، استان، اصول، الماس، الک، انگورک، بیوگ، بیوگانی، بے روزگاری، بے حضوری، بادفروش، بارانداز، بادفگن، بادگیر، بارخانہ، بارگر، بارانی، بازگوئی، بازندگی، بالاخوانی، پاپیچ، پادگاتی، پای دکان، پاروب، پای کلاغ، پیشوا، پیش نماز، پیشانی، پیش دامن، پیشکش، پیلور، تابدار، تالار، تاہو، ترند، توز، توشس، تدارک، تلخ، تماشا، تمکین، تن آسانی، تیرداں، دستکار، دستکاری، دست افزار، دبنگ، دخل، داہول، زنگ، زنگولہ، صحن، صورت، صبوحی، صاحبی، صاحبقران وغیرہ وغیرہ

۲۔ ترکی زبان کے عام الفاظ، مثلاً

اتاق، اختہ بیگی، اختہ چی، اغزی، اقچہ، اوجدی، آل، آل تمغا، ایچ، باشی، پسراک پچاق، ترک، تشتاق، تزک، تقاق، توق، جارچی، چپر، چہرہ (غلام ص ۱۶۵) چوب یساق، چماق، چیلان، چوری، درناق، ساقری، ساقدوش، ساوری، سدق، سورن،

سو، سوچی، شلاق، شلتاق، شرباشرن، قاب، قراب، قراسورن، قرباقہ، قلباق، قراول، قپچاق، قرقچی، قشو، قپان، قلزاناسی، قورچی، قیلغہ، قیقاق، قرغہ، قشلاق، قاپی (علیقاپی)، کودہ، کسکن، مشتلق، ییلاق۔ وغیرہ۔

۳۔ مصطلحات الشعراکتاب کا نام ہے، عنوان کا تقاضا ہے کہ یہ رسالہ شاعری کی اصطلاحات کا حامل ہوگا، مگر ایسا نہیں، اس میں مختلف فنون کی اصلاحات شامل ہیں شاعری کی اصطلاحات کے مقابلے میں اور دوسری اصطلاحات زیادہ ہیں، دراصل مولف کے مخاطب خواص وعوام دونوں ہیں، اسی وجہ سے علمی وادبی اصطلاحات کے ساتھ ساتھ کشتی گیری کی بھی اصطلاحات اس کتاب میں زیادہ ملتی ہیں، بلکہ اکثرالذکر اصطلاحات خاصی تعداد میں ہیں، اس لیے اسی اصلاح سے ہم شروع کرتے ہیں؛

ـــــ نخاک کردن ؛

باصطلاح کشتی گیران حریف را بر زمین انداختن[1] و از جا بر داشتہ بہر دو پا و بہر دو دست مثل چارپا و استادن[2]

میرنجات : گر بر زمین اُری و در نخاک کنی
بافلک کشتی خصمانہ خود پاک کنی (ص ۶۲-۶۳)

ـــــ بَدَل بفتحتین باصطلاح کشتی گیران فنی کہ دفع فن حریف بدان کنند چو ہر فنی کشتی بدل دارد، میرنجات ؛

دارد آن تیر جہان دیدۂ ہر فن ماہر ہر فنی را بدلی ہمچو فلک در خاطر (ص ۶۰)

ـــــ پروانی نام فنی است از کشتی و آن گردحریف گشتہ پایش برداشتن و اجبار بودن است، میرنجات ؛

چہ شود گر بمخالف رسی از پرواتی پای او گیری و بر دو سرش گردانی (ص ۹۱)

ـــــ پس خیز شاگرد کشتی گیر کہ بعد از پاک شدن کشتی حریف کہنہ سوار از

---

[1] نسخہ اصل : نواختن

[2] کذا فی الاصل، اس وضاحت سے اصطلاح میں نخاک کے بجائے درخاک ہونا چاہئے

جهت تعلیم با او کشتی گیرد، میر نجات؛

بر تر از سرو گل اندام طفل دشمن پایۀ تست
نیست پس خیز تو جز سایه که همسایۀ تست (۹۳-۹۵)

بوسۀ لب خویش زدن، حالتی است که کشتی گیر در اول کشتی گرفتن
دستی ببازوی خود می زند و آوازی که آنرا مچو گویند
بر کشد و بعد از آن دست حریف گرفته زور زنند

میر نجات؛

بوسه زد بلب خویش دگر مستانه رفتم از کار ازین کش زدن مردانه (۱۰۴-۱۰۵)

پیش خیز به اصطلاح کشتی گیران شاگرد دست که مقابل پس خیز است،

طاهر وحید در صفت معشوق کشتی گیر گوید؛

چه می پرسی از فتنۀ آن عزیز که اورا قیامت بود پیش خیز (ص ۱۱۴)

تخته شلنگ زدن، مقرر کشتی گیرانست که هفت هشت تخته بدیوار قایم کرده ونگها
بدان بسته بوضع معهود بران شلنگ زنند، و شلنگ جستن و پا افشاندن شاطران و کشتی
گیرالست، میر نجات؛

دل دگر گرم طپیدن شده در سینۀ تنگ
می زند آن بت طناز مگر تخته شلنگ

خان خالص چنین گر به در مردم شلنگ تخته خواهی زد
ترقی گر کنی آخر تو کشتی گیر خواهی شد (ص ۱۲۰)

تنکۀ تنتین، تنبان چرمی که تا سر زانو باشد و وقت کشتی گرفتن پوشند و بسیار تنگ
باشد، ازین رو بدین نام خوانند، میر نجات؛

تنکه در قدمش زود بهم می باشد هر که رویش تنک افتاد چنین می باشد (ص ۱۳۰)

توی شاخ، فنی است از کشتی که دست درون هر دو شاخ حریف انداخته
یعنی در میان هر دو ران، زور کنند، شاخ دست و پای آدمی است از کتف

تا سر انگشتان و از ران تا انگشتان، در کشتی گیران گویند دست توی دو شاخ حریف کردیعنی در میان هر دو ران یا هر دو دستش دست خود قایم کرد و توی بمعنی درون است. (ص ۱۲۲)

ــــ چوب تعلیم، چوبی که معلم اطفال و کشتی گیر شاگردان را بدان ادب کنند (ص ۱۴۴)

ــــ دست بر داشتن، به اصطلاح کشتی گیران دست خود بر زمین بند کردن و حریف بدعوی گفتن که بردارد، میر نجات:

دست برداشتن را چو فلک تاب نداشت
پشت دستی زمه و مهر به پیش تو گذاشت (ص ۲۰۶)

ــــ در کشتی بست، یعنی کشتی را تمام کرد، میر نجات:

داد در کشتی خصما نه دگر دست بدست
بنگاهی همه را کشت و در کشتی بست (ص ۲۰۲)

ــــ دست دادن، باصطلاح کشتی گیران در شروع کشتی دست یکدگر گرفتن که که آن مرسوم آنجاست (ص ۲۰۷)

ــــ روی دست، نام فنی است از فنون کشتی و آن پای در پای حریف بند کرده روی دستی به سینه اش بزور زدن است که از جا در آید. (ص ۲۲۴)

ــــ سجود صمدی، باصطلاح کشتی گیران سجده ایست که در وقت کشتی گرفتن کنند، میر نجات، شاید از فخر اگر پای بر افلاک نهی
بسجود صمدی جبهه چو بر خاک نهی (ص ۲۳۹)

ــــ سگلی کاف دوم تازی و یای حطی معروف، فنی است از فنون کشتی و آن دو قسم است: یکی سگلی واژونه که دستهای هر دو حریف در کار نباشد و پا با هم بند کرده یکدیگر را بکشند و زور کنند، دوم سگلی رو برو که دستها و پاها با هم بند کنند مثل بند شدن دو سگ، درویش واله هروی:

قرب تو چهرهٔ عزازیل بنهاد بترک سجدهٔ نیل

پا در سنگلیش لعن بنہاد — بر خاستنش زیادہ افتاد
میر نجات، عزیز گشت فغان زین سنگی واژہ

فیل زور راست مبارک بود این میمونہ (ص ۲۷۵)

— شنذ پہلوان، آواز بلند لیست کہ کشتی گیر در اول کشتی گرفتن برکشد،

ملاحظہ: شنذ پہلوان را از زبردستی شنذ روح می خوانم (ص ۲۸۰)

— شنا و شنو، ورزش پہلوانان، میر نجات، نیست زور تو ضمانت از من بشنو
می رود بیہدہ در معرکۂ خاک شنو

اشرف: بیم طوفان بلا در شکیم بیش از تری است
ہمچو کشتی گیر از مشق شنا دارم بہ خاک (ص ۲۸۵)

— شیر غلط، فنی است از کشتی کہ چون حریف را بینند از ند و خواہند پشتش بر زمین رسانند
حریف مغلوب نگذارد کہ پشتش بر زمین رسد، وجہ تسمیہ آنکہ شیر بر پشت اصلاً
خوابد. میر نجات: شیر غلطید ز زور بت شیرین فن ما
شیر غلط است فن دلبر شیر افگن ما (ص ۲۸۶)

— فیل میمونہ، فیلی بود کہ لندہور بن سعدان بر آن سوار شد و او یکی از پہلوانان دست
راست حضرت امیر حمزہ بود و میمونہ نام فنی است از کشتی، سند در سنگی
واژہ گذشت. (ص ۳۰۹)

— چتر زدن، ورزشی است کشتی گیران را و آن چنانست کہ بر روی دو دست ایستادہ
پاہا بہوا جفت کنند، میر نجات: دل بسیر فلک از رشک کنی دیوانہ
ہمچو طاؤس زنی چتر بہ ورزش خانہ (ص ۱۴۴)

— فتح، نام فنی است از فنون کشتی، و آن حریف را از پس در میان کمر دست انداختہ
بالا کشیدن است (ص ۳۰۶)

اصطلاحات مصوری

— پرتانہ، باصطلاح مصوران خامۂ مروجۂ دو لایت، از پر بار یک قاز خامہ می بندند

ز منصوری؛ طغرا؛
تا دست تبصویر رخت بردہ مصوّر   موی قلمش بسر پی تازہ در آتست (ص ۹۱)

اصطلاحات موسیقی

زیر افگن، نام پردہ سرودکہ آنرا در ہندی بہیروین گویند، بقول صاحب برہان قاطع کوچک نیز ہمان است، منیر در رزمیہ کہ مناسبات موسیقی سرکردہ گوید، فقرہ ؛ نسبت بخانعان زیر افگن وزیرکش گردیدند (ص ۲۴۵)

عمل گیسو، نوائی است از موسیقی کہ در ہند دھناسری گویند (ص ۳۰۲)

سنبلی، نوائی است از موسیقی، رباعی؛

سید پسری کہ رفت دلہا سویش   از خوبی آواز و رخ نیکویش
ترسم کہ بعشوہ سنبلی خوان سازد   مرغان چمن را عمل گیسویش

سرخانہ، با صطلاح موسیقی آواز بلنداست و میانخانہ آواز متوسط، مومن استرآبادی.
ای کار دلم از تو ز قانون شدہ بیرون   سرخانہ از چنگ و رباب گلہ بشنو (۲۵۶)

مصطلحات رنگرزی

تہ بندی با صطلاح صبّاغان رنگی کہ برای تقویت پیش از رنگ مقصود کنند، باقر کاشی، مصراع؛ لالہ تہ بندی داغ از شب ہجرانم کرد
تاثیر؛ خون در دل می کند تہ بندی صہبای تو
گلشن بغارت می دہد رنگ حنای پای تو (ص ۱۳۳)

رنگ بریدن معمول رنگرزان است کہ چون رنگ زیادہ برآنچہ مقصود است گردد، حامضہ آن را بشویند تا نیم رنگ گردد، گویند رنگش را بریدم
اشرف؛ نی ہمین از تیغ رنگہای شہید ان می برد
رنگ خون را ہم ترشروئی جانان می برد
خان خالص؛ تا تیغ بدست یار دیدہ است
رنگ از رخ خون من بریدہ است (ص ۳۳۳)

اصطلاحات نجوم

کف الخضیب، شفیع اثر: سیاه معلی زکف الخضیب
بطفرمان او دست برسرنهاد (ص ۲۰۶)

ـــــ سهم السعاده و سهم الغیب، بقاعدهٔ علم نجوم سهام بسیار است و آن دلایل چیزهای
مخصوص باشد که مواضع کواکب و خانه ها گیرند، از سی فصل معلوم شد:
کواکب قوی حال و انظار نیک   سهام دلایل بیکبار نیک
قوی تر از جمیع سهام سهم السعاده و سهم الغیب است، سهم السعاده حامل است

از فلک البروج که بُعد سهام او از درجهٔ طالع بر توالی بروج مثل قمر باشد از
شمس علی التوالی، مثلاً هرگاه آفتاب در اول حمل و قمر در اول ثور باشد و اول جوزا طالع
سهم السعاده اول سرطان است و هرگاه شمس در اول حمل و قمر در بست و پنج درجه و بیست و
چهار دقیقهٔ حمل باشد بیست و پنج درجه و سی و هشت دقیقه از میزان سهم الغیب است.
سهم السعاده دلیل مال و جاه و سهم الغیب دلیل فرح و خرمی است، طالع جزویست از
فلک البروج بر افق مشرق، قاسم گونابادی در معراج گوید.
از ان تیر سهم سعادت شده   چو برجیس فرخنده عادت شده
حکیم حاذق گیلانی: به برج طالع او رخ نماست سهم الغیب
بموت در شده سهم الشرف به نهانی

طغرا: چو اہل دل بود کش صد ہزار سهم الغیب
بجله خانه اگر پا نهد کمان تنها. (ص ۲۴۹-۲۷۰)

چاه زیج و ستاره جوئی بکسر زای معجم و جیم عجمی، از زمین هموار که در نشیب و
فراز نباشد بعمق شصت گز جای فراخ کاوند و از چوبها پای برآرند، شصت
گز باشد و آنرا شبک سازند و دران نشینند تا کیفیت افلاک و نجوم دریابند، استاد
از شرم ارتفاع فرو رو بچاه زیج
اختر شناس طالع وا ذون خویش باد

ملاطفزا؛ فقرہ وجدولش رصد بندان را انجام ستارہ جوئی بی نیاز ساختہ (ص ۱۴۲)

اصطلاح طبی؛

پردۂ عنبی نام طبقۂ از طبقات ہشتگانۂ چشم است کہ آن شبکیہ ملتحمہ قرنیہ، عنبیہ، علبیہ، قرنیہ و ملتحم است، عالی؛

مراکہ جام چو نرگس شدہ است چشم و چراغ
چو نور دیدہ شرابم بہ پردۂ عنبی است . (ص ۹۱)

کہنکو نام رگی است کہ آن را در تازی عرق النساء گویند، بلکہ کہنکو باد ریحی است کہ دراں رگ انصباب یابد و موجب مرض گردد، اشرف؛

کہ ماخیر است، ہمچو دردزانو
زمین گیر است چون باد کہنکو. (۳۵۵)

اصطلاح فقہی؛

سرجدا کردن، معنی ترکیبی ظاہر است، چون زکوۃ عید الفطر کہ پیش از نماز یک من و نیم سیر تبریزی کہ شش سیر ہند باشد ہر فرد از مال خود جدا کند ہنگام قسمت گوید این سر فلان مستحق، این سرہا آن مستحق، مخلص کاشی؛

چون دہی ای مہ! زکوۃ عید فطر
بار اول کن سر مخلص جدا (ص ۲۵۴)

سرعشر، بضم عین، دہ آیات قرآنی کہ در وقت بسم اللہ باطفال نخشتہ و ہندو وابرا کہ برسر دو آیت مذکورہ نویسند، صائب؛

سرعشر این کتاب مبین است آفتاب
زنہار بر مدار نظر از کتاب صبح (ص ۲۵۸)

شبہای طاق، نوزدہم و بیست و یکم و بیست و سوم ماہ رمضان المبارک کہ زہاد ایران این شبہا زندہ دارند و شب قدر درین شبہا دانند، مخلص کاشی؛

رخسارہ و لعل فرو زنت باشد مہ مبارک شبہای طاق این ماہ آن ابروان طاقست.

(و اینہا) شب احیا ہم گویند، میر نجات :

عنبر نعل شویدہ عاشق نشاسد قدر شب احیای سر زلف بتان را (ص ۹۶)

اصطلاح دیوانی

حکم بیاضی، ملاّی فہّامی در آئین اکبری نوشتہ کہ چون برخی احکام سلطنت درنگ برنمی تابد از جہت تعجیل و اخفای راز منشور مقدس تنہا بہ نگین شاہی پیرایہ گیرد و از دفاتر نگذرند و آن را حکم بیاضی گویند، شفیع اثر،

صبح صادق نیست کز جیب افق سر می زند
دارد از رایش بسر حکم بیاضی آسمان

در وقت عرش آشیانی حکم بیاضی معتبر تر از احکام دفتری بودہ در عہد اخلاف آنجناب کم رتبہ شدہ در سہولش بہ نگین شاہی ہم نماندہ، بمہر امرا باشد، لیکن از دفتر نگذرد و ازین جہت کم اعتبار است نظر باین معنی صائب گوید :

اگر چہ حکم بیاضی بلند رتبہ نبود بدور کردن او اعتبار پیدا کرد (ص ۱۷۲)

نظری باصطلاح میرزایان دفتر است الخ (ص ۲۰۶)

مرغ فلانی درست می خواند ۳۶۸

آل بزبان ترکی مہر سرخ پادشاہ

را گویند از جہت آنکہ در قدیم الایام مہر پادشاہ بر مناشیر و امثلہ بر شنجرف می زدند (ص ۲۰)

آل تمغا از ترکی مہر پادشاہ را گویند یعنی مہر سرخ ص ۲۱۔ صائب

روز محشر سرخ رو چون لالہ برخیزد ز خاک آل تمغای شہادت ہر کہ دارد بر جبین

جہانگیر نے توزک (ترجمہ اردو ص ۷۳) میں یہ اطلاع بہم پہنچائی ہے :

ہمارے آبا و اجداد جس کو جاگیر عطا فرماتے تھے بطور ملکیت کے عطا کرتے تھے اور اس فرمان کو آل تمغا کی مہر سے مزیّن کرتے تھے، آل تمغا وہ مہر ہے کہ شنجرف کے ساتھ کاغذ پر لگایا جاتا ہے، میں نے حکم دیا کہ مہر لگانے کی جگہ کو طلائی کرکے اس پر یہ مہر لگائی جائے اور میں نے اس کا نام التون تمغا رکھا۔

بنه بستن بضم اول و نون و یای حطی معروف و جیم تازی، جمعی که بر املاک بندند، و آن دفتر خارج الال و صادر مملکت موسوم است، ظهوری رباعی:

ظلم آخر نتیجه خواهد بست　　زخم بر دل دریچه خواهد بست
داغ تو که چیده بر سر هم دفتر　　بر سینهٔ من بنیچه خواهد بست

(ص ۱۰۳)

اصطلاح موسیقی:

شهناز نام نوائی است از موسیقی　　شفیع اثر:
بجان آتش زند چون از مرقع پرده بردارد
به شهناز رسد هر گاه گیر اوج شهنازش　　(ص ۲۸۶)

اصطلاح شعری: مرقع هم نام نوائی است.

شارح دیوان حکیم انوری از تکمیل الصناعا آورده که جمع کردن میان حرف عجمی و عربی در قافیه مانند چپ و طرب، سگ و سگ و نتیجه و دریچه عیب بغایت ناپسندیده است امادر اشعار شعرا بسیار دیده شد، چنانکه در رباعی ظهوری و دریں شعر شوکت و طاهر وحید فلک و سک و ترک و برک بهم آمده، شوکت:

چو نفس آید بزاری کی دگر بیم از فلک باشد
که خواب کلم از افسانهٔ آواز سگ باشد

وحید:

دیده تا دیده جمالش دل و جان ترک شده است
دلم از داغ جنون لاله صد برگ شده است　(ص ۱۳۰)

دو بحر زدن، شعر ذو بحرین گفتن که از صنایع شعری است　ص ۲۲۰

اصطلاح خط و خطاطی:

خط آتشخوان: خطی که از آب پیاز بر کاغذ نویسند، چون آنرا بر کاغذ گذارند اشکال حروف بنظر در آید و خوانا شود، خان آرزو:

برزبان حال دارد شمع خاموش ایں سخن
سرنوشت کشتگانت خط آتشخوان بود (ص ۱۸۵)

خط الماسی و شہابی وصلی۔ خط میگون، میرزا صاحب:

از خط الماسی لعل لب جانان مپرس
برق در جانم ازین زدّین گیاہ افتادہ است

شوکت: پیمانہ بدامن گل آن لعل شرابی برد
ریحان بسفال آتش زان خط شہابی برد

نظری نیشاپوری:

لعل تو ز لطف شہد بر گوشہ کشید — خط عسلیت گرد رخ گشتہ پدید
یا عکس شفق بدامن صبح افتاد — یا پرتو خورشید بخورشید تنید (ص ۱۸۶)

خط توامان، بر دو صفحہ کاغذ نقوش مختلف گشتہ، چون آن ہر دو صفحہ را بر روی ہم گذارند صورت حروف برنگ سفید از آن نمایاں شود، خان آرزو:

دہم یاد ہم آغوشی بدان طفل
کہ مکتوبم بخط توامان است

کبوتر دُم: با صطلاح خطاطان قلمی است بطرز خاص تراشیدہ کہ مشابہ بہ دُم کبوتر باشد، اشرف: گر کنم شوق دل از کلک کبوتر دُم رقم
نامہ زین تقریب خود بال کبوتر می شود (ص ۲۲۵)

کتابت کشمیر: مکتوبی کہ حروف پیچیدہ ناخوانا داشتہ باشد چنانکہ حروف براہمہ کشمیر کہ اشکال آن مختلف است بصور حروف براہمہ ہند،

اسیر: گر طوطی خیال خطت نامہ بر شود
آئینہ را کتابت کشمیر می کند (ص ۲۲۶)

خط دیوانی، خط شکستہ پر زشت ناخوانا کہ خط میرزایان دفتر است، طالب آملی:

بیاد شکایت بی تامل کودک امی   تواند خواند بر لوح عطارد خط دیوانی ص ۱۸۶

اصطلاح شطرنج :

بقایم ریختن، با صطلاح شطرنج بازان بازی حریف دیدن وازراه عجز مہرہا از دست ریختن وگفتن بازی قایم است چہ در آنوقت گویند اغلانی بقایم ریخت، ظہوری در رسالہ خوان خلیل در صفت شطرنج بازی ممدوح گوید :

چون بجد رخش بازی انگیزد   مفت بردار بقایم ریزد (ص۹۹)

اصطلاح شکار :

تیغ بخاک کردن کنایہ از ترک فتنہ وخونریزی است و ماخذ آن رسم شکاریان است کہ بعد از صید ہزار جاندار تیغ بخاک کنند واز شکار دست بر دارند، طالب آملی :

مقرر است کہ بعد از ہزار صید کنند   بلی شکاریان بخاک پنہان تیغ

بدین قیاس ہمانا شکاری مژہ اش   بخاک کردہ بود ہر قدم ہزاران تیغ

(ص ۱۳۵)

جرگہ بفتح اول، روشنی از شکار و آن چنین است کہ لشکریان گرد صحرا حلقہ زنند تا صید بدر نرود و در ترکی آنرا قمرغہ گویند،

طالب کلیم : دچرخ بصیدگاہ بخشش

یک دورۂ جرگۂ شکار است (ص ۱۴۴)

اصطلاح بیع وشرا :

دست بدلال و بیع دادن، در صدد بیع وشرا بودن، چہ رسم است کہ در حالت تشخیص قیمت کالا دلال نخستین دست بایع را زیر جامہ بدست خود گرفتہ باشارات معینۂ اصابع تعین قیمت کند و بعد از ان ہمین دستور بمشتری اخبار کند، محسن تاثیر :

واعظ مکن مصافحہ را دست بیع زہد

کی خودفروش دست بدلال می دہد

مہوری: گر بہ بیعش اجل دہد دستی
کیسۂ پر کنم بسود و زیان

دست بزیر سال بردن دلّال نیز آہیں است، سیدا شرف؛

بہلہ در سود جود دلّالی او میرو دستی بزیر شال او

دست بدست دادن نیز ہمیں کاشی:

از تو متاع حسن و ز ما نقد جان و دل
دستم بدہ بدست کہ سودا مبارک است (ص ۴۷۰-۴۸۰)

اصطلاح کیمیاگری:
عمل شمسی و قمری باصطلاح کیمیاگراں طلا و نقرہ ساختن، نعمت خان

عالی، فقرہ:
روز و شبی راکہ کیمیاگر ایجاد بعمل شمسی و قمری خزینہ فیض سازند (ص ۳۰۲-۳۰۳)

سند دو وجودی
آنست کہ چون باکسی معاملت کنند بنا بر مزید اعتبار از معامل وآشنا یا برادر او بالاتفاق سند گیرند تا عند الطلب ہر کہ از آن دو استطاعت داشتہ باشد از عہدہ برآید، عامۂ خلق آنرا سند یک وجودی گویند، محسن تاثیر:

خواہد چو لبش نقد دل از من زبُودی
گیرم سند از ہندوی زلفش دو وجودی (ص ۳۶۸)

وارستہ نے بعض ایسی اصطلاحیں اپنی کتاب میں درج کی ہیں کہ ان سے اس دور اخلاقی پستی اور سماجی برائی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، مثلاً مصطلحات الشعرا میں لواطت کی بیسیوں اصطلاحات بلا جھجک درج کر دی گئی ہیں، اور ہر ایک اصطلاح کی تائید میں شعرا کے اشعار نقل کئے ہیں، ذیل میں کچھ اصطلاح نقل کی جاتی ہیں، لیکن ان کی تشریح و توضیح نظر انداز کی جاتی ہے۔

برسرپاآمدن	ص ۸۳	دادن	۱۹۴
بندکردن	۱۰۲	رقص طلا	۲۳۱
تاب زخمہ دارد	۱۱۷	زہ گیر	۲۴۴
تنخواہ گرفتن	۱۳۰	سرقوچ توسلات	۲۵۹
چشمۂ سلسبیل	۱۵۲	سہوالقلب	۲۷۰
جلقی	۱۵۳	علم و قلم	۳۰۱
چکمہ مراج	۱۵۵	غرقی وغرق	۳۰۴
چلہ نشیں	۱۵۷	قل احمدی	۳۱۵
تنخواہ دادن	۱۵۸	درکار	۲۹۶
خوش گاہ رس	۱۹۲	نون قوسی	۳۹۱
بتلنک دائرہ بدر کردن	۷۰	لطف گفتی	۳۶۰

(۴) محاورات وکنایات

ان کے علاوہ اور دوسرے فنوں اور پیشوں کے اصطلاحات اس مفید کتاب میں ملتے ہیں، لیکن سب سے بڑا عنصر جو اس کتاب میں پایا جاتا ہے، وہ محاورات اور کنایات کا ہے۔ اور حق تو ہے کہ اس کتاب کا نام کتاب المحاورات والکنایات زیادہ مناسب ہوتا۔ ذیل میں اس سلسلے میں کچھ مثالیں درج کی جاتی ہیں،

آب وگل کنایہ از قالب بشری

آب طینت بالاضافہ، آبی کہ خاک ابدان بدان سرشتہ اند

آب دندان شکن، آب بسیار سرد

آب بر آینہ زدن و ریختن، چون کسی بعزم سفر از خانہ برآید چند برگ سبز بر آئینہ گذاشتہ آب بر آن ریزند و این را شگون عازود بہم رسانید نہادند

آب روشن، رونق وبہا

آبکش برگ، رگ اوراق نباتات

آب بخشیدن چیزی، شستن آنست

آب آتشناک، آب آتش رنگ، آب گلنار رنگ کنایه از شراب

آب بی لجام وافسار خوردن، مطلق العنان وخودسر معاش کردن

آب گرفتن خانه، خراب وویران شدن خانه،

آب مرده بالاضافه، آب غیرجاری وافسرده

آب در سبد کردن مرادف آب در غربال کردن، وآن کنایه است ارتکاب امر بیفایده

آب جاویدان، آب حیات۔

آب جو، کنایه از دولت ومال

آب از دہان رفتن وبدہان گردیدن، کنایه از آب حسرت بدہان آمدن

آب زیرکاه انداختن، مکاری کردن

آب کشادن، کنایه از ضائع شدن وقت۔

آب بردن چیزی، کنایه از نہایت اتصال وغرابت آن۔

آب درجگر داشتن، کنایه از استطاعت مالی داشتن، اگرچه میر عضد الدوله وشیخ عبدالرشید

این محاوره را بنون نافیه بمعنی مفلس ونادار نوشته اند، واز آب در

جگر داشتن انکار دارند، اما شعرا آورده اند چنانچه آقای رہی شاپور

گوید،

ز آسودگیت گر بودت پیرہن درست

از خامی است گر بودت آب در جگر

باد، نخوت کردن، کنایه از ناز بالیدن

باد بداماں کردن، کنایه از غرور ورعنائی

باد در کله داشتن، کنایه از غرور ونخوت

بار گرفتن، آبستن شدن

بار بستن زبان، ظہور کردن برزبان رنگہائی سیاہ و سفید و زرد و سرخ از علبہ غلطی۔
بازکردن، جدا نمودن
پا از پیش بدرفتن، لغزیدن و کنایہ از غنا بعنا افتادن
پاخالی کردن کنایہ از سفر کردن
پای قدم جفت کردن در تلاش کار سعی فوق مقدور بجا آوردن

اگرچہ پوری کتاب محاورات وکنایات سے پُر ہے، مولف نے چند جگہ ضرب المثل بھی نقل کئے ہیں، اور ان کو محاورے سے الگ رکھا ہے۔ مثلاً
چوب فلانہ در آبست ص ۱۶۳

درد کراخوش است رئیس و برادر ص ۲۰۱
درد دہ درو دیدہ کہ دردا زا سیراست ص ۲۰۴
سیب تا فرود آمدن ہزار چرخ زند، مثلی است مشہور یعنی تا چشم بہم زنی چرخ ہزار چرخ زند و عجیب چیز ہا بر روی کار آرد ماخذ آنکہ پادشاہی بود سیبی در دست داشت و قاش خربزہ بیکار و بر داشتہ در دہان می کرد، در آنحالت بکشتن گنہگاری فرمان داد، او عرض کرد کہ سیب را بہوا باید انداخت تا فرود آمدنش مہلتم بخشند، سلطان ہمچنان کرد، اتفاقاً سیب ہنوز در چرخ بود کہ کارد با قاش خربزہ بحلق ملک فرو رفت و قضا کار خود کرد، گنہگار از ہلاک نجات یافت، از آن باز مثل شد (ص ۲۷۱-۲۷۲)
نام آباد و دہ ویران مثل (ص ۳۰۲)
آدم بہ آدم میرسد (۱۵)
مبارک مردہ آزاد کرد ۳۷۴
ملا ہم از این نمد کلاہی ۲۷۳

آسیای خلاں بآب چشمۂ خضر واز آب طلا میگردد   (ص ۱۷)
آسیای طلائی از بی آبروی دائرات   (ص ۱۷)

(۵) زیر نظر کتاب تلمیحات سے بھری پڑی ہے، ان میں سے چند تلمیحات جن میں کچھ ندرت ہے، ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

ابن سیرین ایک معبّر جس کا نام محمد بن سیرین تھا، حکیم رکنا لکھتا ہے:
سر بسر خواب پریشانم ہوی زلف دکت   ابن سیرینی نمی یابم کہ تعبیرم کند (ص ۲۸)

ازرق شامی، نام شخص کہ در شہادت امام حسین معاون شمر بود، تاثیر:
ہر صبح بچشم فلک تیر و حامی است   ہر شام گہم چرخ کبود ازرق شامی است (ص ۲۵)

پنجۂ مریم، ایک گھاس ہے، کہتے ہیں کہ حضرت مریم نے دردِ زہ کے موقع اسے ہاتھ میں لیا، اور وہ پنجہ کی شکل اختیار کر گئی، اس کو چھونے سے دردِ زہ میں سہولت ہو جاتی ہے، اس کو بخور مریم بھی کہتے ہیں، سلیم:
چو دایگان نہ پذیرد نشہ نہادۂ صدف   ز شاخ پنجۂ مرجان در آب پنجۂ مریم (ص ۱۰۴)

ترنج طلا و نارنج زدن، کہتے کہ ایران کی ایک قدیم رسم تھی کہ جب کوئی شہزادی شادی کی عمر کو پہنچتی تو اطراف سے شاہزادے محل میں جمع ہوتے، شاہزادی کوٹھے پر جاتی، اور جس شاہزادے کو پسند کرتی، اس پر ترنج طلا پھینکتی اور اس سے شاہزادی کی شادی ہو جاتی، صاحب نگارستان لکھتا ہے کہ ایران کا قدیم فرمانروا گشتاسپ اپنے باپ سے ناراض ہو کر روم چلا گیا، وہاں شاہزادی سے عقد کے خواہاں امیر زادے جمع تھے، گشتاسپ بھی انھیں میں شامل ہو گیا، اتفاق دیکھئے کہ شاہزادی اس کے حسن و جمال پر شیدا ہو گئی اور ترنج طلا اس پر پھینکا، چنانچہ اس سے گشتاسپ کا عقد ہو گیا۔ (ص ۱۲۴)

تعجب ہے کہ وارستہ کے یہاں پرویز کے ترنج اور ترۂ زریں کی تلمیح، جو خاقانی کے مشہور قصیدے کے ان اشعار میں ہے، نظر انداز ہو گئی ہے:

کسری و ترنج زر پرویز و ترہ زرین   بر باد شدہ یکسر با خاک شدہ یکسان
پرویز بہر خوانی زرین ترہ آوردی   کردی ز بساط زر زرین ترہ را بستان

پرویز کنوں گم شدہ زان گم شدہ کمتر توئی زرین تنہ کو برخوان رو کم ترکو ابر خوان

کف الخضیب : وارستہ نے کف الخضیب کی تلمیح درج نہیں کی ہے، البتہ دست برنہادن محاورے کے ذیل میں شفیع اثر کا یہ شعر نقل کیا ہے۔

سپہر معلی زکف الخضیب بفرمان او دست برسر نہاد (ص ۲۰۶)

کف الخضیب جانب شمال سرخ رنگ کا ایک ستارہ ہے جس کے بارے میں قدما کا یہ عقیدہ تھا کہ اس کے دایرۂ نصف النہار پر پہنچنے پر اجابت دعا کا وقت آجاتا ہے، انوری:

براستقامت حال تو بر بسیط زمین
بر آسمان کف کف الخضیب کردہ دعا

غالب نے کف الخضیب کو غلطی سے صور جنوبی کی ایک صورت بتائی ہے، اس کے طلوع کا وقت: غالب کو معلوم تھا: اختر شناسان ہند کو، قبولِ دعا وقت طلوع منجملہ مضامین شعری ہے (غالب کے خطوط، مرتبہ خلیق انجم، ۱۹۸۵، ص ۷۰۲) راقم نے اس موضوع پر اپنے ایک مقالے میں تفصیل سے بحث کی ہے (دیکھئے غالب پر چند مضامین، طبع دہلی

سجاوندی: علم قرأت کی ایک کتاب ہے جس میں اوقاف کی علامتوں پر ہونے کے نقطے رکھے گئے ہیں، اور صاحب ہفت اقلیم کے بقول کابل کے نواح میں ایک قصبہ ہے اور صاحب نگارستان کے نزدیک خلاف خراسان کا ایک قصبہ ہے جہاں کا مصنف رہنے والا تھا، اور صاحب رشیدی نے لکھا ہے کہ سیستان میں ایک پہاڑ ہے جہاں کتے (سگ) بہت ہوتے ہیں، سجاوند اس سے معرب ہے۔

اور سجاوندی کردن یا شدن سے کنایۃً مراد منقش کرنا یا ہونا ہے، تاثیر:

از حیا گل گل شود چون آن رخ محبوب سرخ
مصحف خوش خطِ رخسارش سجاوندی شود

اشرف: خواہم آن رخ را ز نقش بوسہ گلبندی کنم
مصحف رخسارۂ او را سجاوندی کنم (ص ۲۴۹)

سجاوندی کا نام ابو الفضل محمد بن ابو زید طیفور غزنوی تھا، وہ چھٹی صدی ہجری کا علم قرأت کا نہایت مشہور دانشمند تھا، اس کی حسب ذیل تین کتابیں ملتی ہیں۔

۱. کتاب الوقف والابتداء ۔ اس میں قرآن کے وقف کے جدا انواع کی تشریح و توضیح ملتی ہے ۔ اسی کو وارستہ نے سجاوندی کہا ہے ۔
۲. کتاب الموجز ، اس میں وقف کے بعض اقسام کی شرح و تفصیل ہے ۔
۳. کتاب عین المعانی در تفسیر سبع الثانی ۔

سجاوندی ، سجاوند سے منسوب ہے ، سجاوند سگاوند (سکاوند) سے معرب ہے ، اور حدود العالم میں ہے کہ ۱ ۔ استاخ ، سکاوند اندخو دمیں دو شہر ہیں جو پہاڑ کے دامن میں واقع ہیں ، سکاوند میں ایک محکم قلعہ ہے ، یہاں کھیتی اچھی ہوتی ہے ، ۲ ۔ سیستان کے نواحی میں ایک پہاڑ ہے ۔

سمند اسلار ، ایک جانور ہے جو سکندر ذوالقرنین کے زمانے میں ظاہر ہوا ، کہتے ہیں جس شخص پر سمند اسلار کی نظر پڑ جاتی وہ مر جاتا ۔ ارسطو نے جب آئینہ ایجاد کیا اور اس جانور کا عکس جب اس میں نمایاں ہوا تو اس پر اس کی نظر پڑی اور وہ مرگیا ۔

غیاث نقش بند : علاج ذات شوقت ثوی ذات کند آری
سمند اسلار را عکس سمند اسلاری باید (ص ۲۴۶)

موتی خان بنای ہندی و خای معجمہ نام طنبورلیست کہ ابراہیم عادل شاہ حاکم بیجاپور داشت ، از بس توغل بعلم موسیقی اینمہ عزیزش می انگاشت کہ چون از جائی بجائی بر دند لہ تخت روان گذاشتہ علم و نقارہ و کر نا ہمراہ می بود و امرا اورا کورنش میکردند ، سنجر کاشی در قصیدۂ مدح پادشاہ مذکور گوید :

روا ست کورنش و تسلیم از آن بہ موتی خان
کہ شاہ چون خلفانش گرفتہ در دامن
دری کہ دامن شاہش صدف بود شاید
کہ جان فشاندش از ہر دایۂ معدن

دراصل اس طنبور کا نام موتی خاں نہیں بلکہ موتی خاں تھا ، ابراہیم عادل شاہ کی تصنیف

کتاب نورس میں اس طنبور کا نام کئی بار موتی خاں درج ہے، اس کے صحیح تلفظ کا تعین ملک کی کی ایک رباعی سے ہوا جس میں "موتی خاں" بطور قافیہ استعمال ہوا ہے، اور اس کے دوسرے قوافی لاہوتی، ناسوتی ہیں۔ تیس سال سے زیادہ ہو رہے ہیں، مشہور محقق قاضی عبدالودود نے "موتی خاں" کی قرأت کے بارے میں مجھ سے سوال کیا، میں نے ملک قمی کی متعدد رباعیاں میں جو اس طنبور کی تعریف میں نظم ہوئی ہیں، وہ رباعی پڑھی جس کے قوافی لاہوتی، ناسوتی ہیں، اس سے وہ مطمئن ہو گئے کہ واسطہ کا "ٹ" سے اندراج صحیح نہیں، مجھے قاضی صاحب کے سوال پر انتہائی حیرت ہوئی کہ انھوں نے وارستہ کی مصطلحات الشعرا کو کتنی دقت نظری سے مطالعہ کیا ہے، دراصل ہمارے قدما کا علم و فضل اسی نوعیت کا تھا، آج کل کے دانشمندوں نے تو اس کتاب کا نام نہ سنا ہوگا، اس کے مطالعے کا کیا سوال۔

ل چند مثالیں یہ ہیں (کتاب نورس (انگریزی) طبع دہلی ۱۹۵۶)

بیگ ملا سے پیلے سہان — نا بھاوے سکہ مجھا ان پان

ابراہیم برسے موتی خان — (گیت ۴۳)

ل آراستہ شاہدی است در مجلس خاص — صد جا کر خویش بخدمت بستہ کلیات

سازِ تو ز نغز گشت لاہوتی خان — گسترده ز نغز ہای ناسوتی خاں ۸۶۴

بحرین و بدخشان چو طالب گشتند — شد دست تو لعل و اد و موتی خاں

ظہوری کی دو رباعیاں یہ ہیں:

این ساز کہ تاج تارک تکریم است — بر زہرہ ز رتبہ صد تقدیم است

در کعبہ دل زوجہ غم پامال است — از دست گرفتگان ابراہیم است

شاہ ابراہیم در ہنر جمشید است — ہر مطرب بزم عشرتش ناہید است

طاہراست خط شعاع بر طنبورش — آری ز فروغ عارضش خورشید است

جھنن جھنن موتی خاں کی تانت گاجے
تال بردنگ بھید سوں نورس باجے (گیت ۲۷)

موتی خاں ساگر ایماں پور تاپر تنت کلول لپو گور (گیت ۱۵)

موتی خاں باجا کو بھید کو واکی بتا نو اتپت پھتن (گیت ۲۴)

اس طنبور کی تعریف میں ملک قمی اور ظہوری نے کم از کم ۱۲۸ رباعیاں نظم کی تھیں، ملک کی رباعیاں یہ ہیں:

طنبور تو تار و پود عشرت بستہ با عیش ابد عقد اخوت بستہ

(۶) مصطلحات الشعرا باوجود اس کے کہ ایک فنی کتاب ہے، لیکن اس میں نفیس تاریخی و ادبی واقعات درج ہیں، ان کی وجہ سے اس فنی کتاب کی تاریخی و علمی اہمیت بھی مسلم ہو جاتی ہے بعض واقعات ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

تنورہ زدن، ہوا گرفتن و یواست از ترجمہ مہابھارت کہ نقیب خان حسب الحکم عرش آشیانی واستصلاح شیخ علامی تصنیف نمودہ معلوم شد (ص ۱۳۰)
بہبہان شہر یست پای تخت کو ہکیلو یہ کہ سا کنان آنجا ہمہ نامقید وارذل اندو ہیم آنجا ہم کم عیار است، والہ ہروی
اثرہای نیکو ز نام نکو نہ گواہم عیار زر بہبہانی (ص ۱۰۷)
چہرہ معشوق نو خط، این لفظ در ظفر نامۂ شرف الدین علی (یزدی) بو اقعات بابری کہ عبد الرحیم خان خانان رحیم تخلص حسب الحکم عرش آشیانی از لغت ترکی بفارسی ترجمہ نمودہ بمعنی غلام بیلداست و از فرہنگ ترکی نیز بمعنی غلام معلوم شد و صاحب تذکرہ دولتشاہی نیز بہمیں معنی آوردہ۔ (ص ۱۶۵)
چوب سیاق، چوب زدن سلاطین اتراک مجرمان را بدستور و قاعدۂ کہ معین اہلست چوب یاسا بحذف ق نیز گویند، سیاق و یاساق و یاسا تورہ آئین ترکانست۔

صاحب تذکرہ دولت شاہی می نویسد کہ در یاساق مغل ہر کس روز در آب رود و غسل کند کشتنی باشد۔۔ در ظفر نامہ گفتہ، فقرہ:
تمام یساق آنحضرت ترک کردہ و اموال و خزانہ را باسراف و تبذیر تلف نمودہ (ص ۴۴)
حروفی، فرقہ ایست کہ احداث عقاید کنند، احروفیون المحروثون، وحید:
این رقصیان بنام صوفی یا نقطوی اندیا حروفی " (ص ۱۶۸)
یہ فرقہ تیمور کی حکومت کے زمانے میں ایران میں رایج ہوا، اس کی تاسیس فضل اللہ استرآبادی نے ڈالی، اس کے عقاید کی بنیاد حروف اور ان کی تاویلات پر ہے، حروفیوں پر کافی لٹریچر وجود میں آچکا ہے، اس کا شعری ادب فارسی اور ترکی میں کافی اہمیت حاصل کر چکا ہے، اگرچہ اس فرقے کے پیرو ایران میں نہیں رہے لیکن ترکی میں بکتاشی درویش کے نام سے انھوں نے کافی ترقی کی (فرہنگ فارسی معین ۵ / ۴۵۷)
نقطوی، فرقہ ایست از حکماکہ برای آفرینندہ جسم و جان ثابت کنند، و آن قوم را مجسمہ نیز خوانند، ظہوری:

این یوز کز انداز وی انداز رساست
از تیزی ناخنش خرد عقدہ گشاست
دیباچہ پیکرش نشد حرف پذیر
گر نقطو یانش بپرستند بجاست (۳۸۸-۳۸۹)

نقطوی پسیخانی بھی کہلاتے ہیں، اس کا بانی محمود پسیخانی گیلانی تھا جس نے ۸۰۰ھ میں اس فرقے کی بنیاد ڈالی، ابتدا میں وہ حروفی فرقے میں شامل تھا، لیکن اس نے وہ مذہب ترک کرکے نقطوی مذہب کی بنیاد ڈالی، اس کی وفات ۸۳۱ھ میں ہوئی، صفویوں کے زمانے میں اس مذہب کے ماننے والوں پر بڑا ظلم و ستم ہوا، محمود پسیخانی کا عقیدہ تھا کہ سب چیزوں کا مبدا خاک ہے جس کو وہ نقطہ کہتا تھا، نقطوی قیامت، بہشت، دوزخ، عاقبت کے قائل نہ تھے، وہ انسان کامل کی پرستش کرتے اور تناسخ کے قائل تھے (فرہنگ معین ج ۶ ص ۲۱۴۱)

راقم سطور[1] نے نقطویوں پر کئی مقالے لکھے ہیں، آخری مقالہ مجلہ علوم اسلامیہ سال رواں میں شائع ہوا ہے، ڈاکٹر صادق کیا کی کتاب "نقطویان یا پسیخانیان" اس مذہب پر نہایت اعلیٰ تصنیف ہے۔

______ حسن صباح نام مزوریت کرتفصیل مکاری او درکتب تواریخ مفصلاً و درتذکرۂ دولت شاہی مجملاً مسطور است، نعمت خان عالی در محاصرۂ حیدرآباد گوید، فقرہ:

کفایت خاں کہ درامور ملکی رسید نش از حسن صباح بیش است دہقانان را طلبیدہ گفت کہ انتم تزرعونہ ونحن الزارعون (ص ۱۰۰)

حسن صباح کی بابت یہ اطلاع نہایت ناکافی ہے، وہ اسماعیلیہ مذہب کے فرقۂ نزاریہ کا پیرو تھا، اس کا باپ صباح یمن سے کوفہ، پھر قم اور رے آگیا، حسن کی ولادت رے میں ہوئی، باطنیوں کی دعوت پر اس نے اسماعیلی مذہب قبول کرلیا، ۴۶۴ میں عبدالملک[2] عطاش رے آیا اور حسن نے اس کو اپنا نائب بنایا، حسن صباح ۴۷۱ میں مصر پہنچا، اور اپنے ڈیڑھ سالہ قیام میں مصر کے فاطمی خلیفہ المستنصر کے بیٹے نزار کا طرفدار رہا، ۴۷۲ میں ایران واپس

---

1. نقطوی فرقے پر ایک رسالہ ۲۰ ھ شمسی (۱۹۴۳ء) میں بعنوان نقطویان یا پسیخانیان تہران سے فارسی میں شائع ہوا، اس کے ماخذ میں ۴۴ کتابیں تھیں، راقم نے ۶ اور کتابوں کے اضافے سے ایک مقالہ فرقۂ نقطوی کے نام سے فکر و نظر نمبر ۱۔ ۱۹۷۰ میں شائع کیا، ۱۹۶۹ میں ڈاکٹر محمد اسلم کی کتاب "دین الٰہی اور اس کا پس منظر" شائع ہوئی، اس میں نقطویوں پر ایک نئی کتاب مبلغ الرجال مؤلفہ خواجہ عبیداللہ بن خواجہ باقی باللہ کا ذکر تھا، اس کا ایک مخطوطہ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ میں محفوظ ہے، ۱۹۸۹ پروفیسر نظامی کی کتاب AKBAR AND RELIGION شائع ہوئی اس میں اکبر کا وہ فرمان ہے جو نقطوی سربراہ میر احمد کاشی کے نام تھا نئے ماخذ کی روشنی میں راقم نے فرقہ پر ایک مقالہ تحقیق (سندھ یونیورسٹی) میں شائع کیا، پھر وہی نظر ثانی کے مجلۂ علوم اسلامیہ ج ۱۹، ۱۹۹۴ میں شائع ہوا۔
2. عبدالملک عطاش اور اس کے بیٹے احمد عطاش کے بارے میں دلچسپ واقعات راحۃ الصدور راوندی (چاپ ڈاکٹر محمد اقبال ص ۱۵۵ ــ ۱۶۱ پر درج ہیں۔

اُیا اور ایران کے جنوبی صوبوں میں بالخصوص خوزستان اصفہان یزد کرمان میں اپنی دعوت کی اشاعت کی فرقہ رفتہ وہ دامغان اور دوسرے خطوں میں بھی دعوت میں سرگرم رہا، اور اپنے داعی دیلمان، طبرستان اور الموت بھیجے، ۴۸۳ھ میں الموت کا قلعہ اس کے قبضے میں آگیا اس کے بعد اس کی دعوت میں بڑی وسعت پیدا ہوئی، اس کے داعی قہستان تک پہنچ گئے اور اس اطراف کے قلعوں پر اپنا قبضہ جمالیا، سلجوقیوں نے اس کی بڑھتی ہوئی طاقت روکنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے، حسن نے دامغان اور لمسر (لمبسر یا رودبار الموت) پر اپنا قبضہ جمالیا، اور کیا بزرگ امید کو جو لمبسر کا محتشم تھا، اپنا جانشین بنایا، اس کی وفات ۵۱۸ھ میں ہوئی۔

(فرہنگ معین ج ۵ ص ۳۵۹)

معرّف لور فارس قومی است کہ اُنرا معرفیہ خوانند، چون کسی بمیرد روز سوم یا چہارم نظم یا نثری در تعریف و تعزیت مرحوم درست کردہ بر روی ابناو اقوامش خوانند و ازآنہا نقدی و خلعتی ستانند (ص ۱۰۳)

—— قبلی طایفہ ایست از کُران کہ بعیاری معروف اند، حسین خان عباس کُرقبلی از امرای شاہ عباس ماضی از آن جماعۃ بود، محسن تاثیر:

دارد آن شوخ عجب دزد نگاہی تاثیر

می ربایند دل اگر از کُرقبلہ باشد (ص ۳۰۹)

—— کُسیالضم قومی بود از ذرّیات شیاطین حضرت سلیمان معتمدی راجہت آوردن جواری باکرہ بہ ترکستان گسیل کردہ حرزی باو آموختہ بود کہ از شر اباالسہ محفوظ باشد، چون او بابل مقصود برگشت قضا را در منزلی حرز محفوظ از یاد برد، ابالسہ وقت غنیمت دانستہ با جواری جمع شدہ ازالۂ بکارت نمودند، چون حضرت سلیمان جواری را ثیبہ یافت از آن شخص پرسید کہ ہیچ جا حرز را فراموش کردی، گفت: بلی در فلان منزل، حضرت سلیمان امر کرد تا کنیزان را در ہمان منزل برد و ہمان جا گذاشتہ برگشت، ابالسہ با کنیزان درآمیختند و قوم کُرا از آنہا بوجود آمدند نقل از نگارستان۔ (ص ۳۵۹)

کپیتان[1] بکاف تازی دبای عجمی ویای حطی.. ریش سفید صاحب اختیار مہمات بادشاہ فرنگ وکسی کہ ازجانب ملک فرنگ داروغہ بندرعباسی باشد از عالم آرای عباسی اسکندر بیگ منشی معلوم شد، میر نجات؛

خوشادمی کہ کپیتان حسن یار شود
زفیض بادہ کشی سید گلستانہ

وگلستانہ[2] نام جائی است از ولایت ایران (ص ۳۲۴)

قلعہ الموت نام قلعہ است در قہستان دیلم کہ حسن بن زید در شہور سنہ اربعین و مائتین بنا کردہ دراصل آلہ اموت است یعنی آشیانۂ عقاب چہ آلہ بالف ممدوہ ولام مضموم عقاب وآموت آشیانہ و میرزا در کارستان در صفت قلعہ گوید، فقرہ، قلعۂ الموت از ممدودہ شکش صورت مرگ در خود دید۔

(ص ۳۱۵)

فرہنگ معین ۵ ص ۱۷۰۴؛ الموت = آلموت = آلہ اموت بمعنی آشیان عقاب یا عقاب آموز

۱. قلعہ ای از کوہہای طالقان بین قزوین وگیلان۔

۲. قلعہ ایست کہ بر فراز کوہ مزبور قرار داشتہ و مدتہا مقر و مرکز عملیات حسن بن صباح اسمٰعیلی وپیروانش بودہ۔

نزہت القلوب ص ۶۰-۶۱: رود بار ولایتی است کہ شاہرود برمیانش می گذرد وبدان باز میخوانند، ودرشمال قزوین شش فرسنگی افتادہ است درآنجا قریب بہ پنجاہ قلعہ حصین مستحکم است وبہترین آن قلاع الموت، ومیمون دژ ولنبسر بودہ ومعتبر ترینہا ہم قلعۂ الموت.. الداعی الی الحق حسن بن زید الباقری در سنہ ست و اربعین و مائتین ساخت۔

---

[1] خیال ہوتا ہے کہ شاید یہ لفظ انگریزی لفظ CAPTAIN سے معرب ہے۔

[2] گلستانہ اصفہان کا ایک محلہ ہے جہاں کے سادات مشہور ہیں، وہاں کے تین مشہور فاضل سادات گلستانہ کے نام سے فرہنگ معین ج ۶ ص ۱۱۷۲ میں مذکور ہیں

تاریخ میں قلعۂ الموت کی اہمیت کا ذکر ملتا ہے، چنانچہ علامہ میرزا محمد قزوینی کی کتاب یادداشتہای قزوینی، جلد سوم، ۱۳۴۲، ج ۲۰۱ (ص ۱۰۲-۱۰۷) میں ان سارے منابع کا ذکر ہوا ہے جس میں قلعہ الموت کا ذکر ہے۔ حسن صباح اسماعیلی کے قبل اسفار بن شیرویہ الدیلمی کے احوال کے ضمن میں ۴۱۷ھ کے حوادث کے ذیل میں الموت کا نام بالتکرار ملتا ہے، ابن الاثیر کے علاوہ مجمل التواریخ میں ہے کہ جب اسفار بن شیرویہ اور اس کے اطراف پر قابض ہوا، مرداویج بن زیار جیلی اس کے ساتھ تھا، دونوں ایک دوسرے سے مل گئے اور مرداویج اسفار کا وزیر ہو گیا، اسفار نے لاکھوں دینار الموت جہاں خزانہ تھا بھجوایا، مرداویج نے تقریباً تین لاکھ اس میں سے لے لیا، اس کی بنا پر اسفار اور مرداویج سے آویزش ہوئی اور اس آویزش میں اسفار مرداویج کے ہاتھوں قتل ہوا اور مرداویج کے لیے حکومت کا راستہ صاف ہو گیا۔

مجمل التواریخ میں پھر ہے کہ سلطان محمد بن ملک شاہ نے باطنیوں کے قلع قمع کرنے کا فیصلہ کیا تھا، اس وقت حکومت سے جتنے معزز وابستگان تھے وہ باطنی قاتلوں سے بہت محتاط تھے، سلطان قلعہ الموت پر جو اسماعیلی باطنیوں کا ملجا و ماوی تھا برابر حملہ کرتا رہا اور اس کے اطراف کے بعض قلعوں پر قابض بھی ہو گیا لیکن ابھی قلعۂ الموت فتح نہیں ہوا تھا کہ سلطان محمد بن ملک شاہ کا انتقال ہو گیا، اور سپاہ جو قلعہ کی تسخیر پر مامور تھی منتشر ہو گئی۔

(یادداشتہای قزوینی۔ ۲ ص ۱۰۵)

راحۃ الصدور راوندی میں بھی سلطان محمد بن ملک شاہ کی کوششوں کا ذکر ہے جو اس نے ملاحدہ کی طاقت ختم کرنے کے سلسلے میں کی، صاحب راحۃ الصدور لکھتا ہے (ص ۱۵۲)

دین کے اعزاز اور ملعون ملاحدہ کے قلع و قمع اور اس طرح ملت اسلام کی حفاظت میں اس نے بڑی جدوجہد کی، گویا قہر کے ہنسیے سے کفر و بدعت کے کانٹے کو کاٹ کر صاف کر دیا، جس نے دراصفہان پر دژ کوہ کو دیکھا ہوگا وہ جان سکے گا کہ اس بادشاہ نے قلعے کے فتح اور اس طایفے کے قمع میں کتنی کوشش کی ہوگی، اور حق بات تو یہ ہے کہ اگر اس کو وہ فتح نصیب نہ ہوتی تو دین اسلام کا قلع قمع ہو جاتا، سات سال تک یہ نیک بادشاہ مجاہدہ کرتا رہا اور لمحہ بھر آرام نہ کیا یہاں تک کہ اس بڑی رکاوٹ کو اسلام کی راہ سے ہٹا دیا۔

اسی بادشاہ کے زمانے میں عبدالملک عطاش اصفہان سے بھاگ کر حسن صباح کے پاس پہنچا اور الموت میں باطنیوں کی قیادت سنبھالی، یہاں اس کا بیٹا احمد عطاش فتنہ پردازی میں مشغول اور باطنی تحریک کے آگے بڑھانے میں معروف رہا۔ وہ دژکوہ پر قابض تھا اور بڑی مشکلوں سے اس کو شکست دی جا سکی، ابھی وہ ملاحدہ کے فتنے فرو کرنے میں معروف ہی تھا کہ اس کی وفات ہو گئی، اور انو شکین شیر گیر کو جو الموت کا محاصرہ کئے ہوئے، ہم چھوڑ کر اصفہان واپس آنا پڑا اور اگرچہ اس کی وفات (۵۰۱ھ) پر اس کا بھائی سلطان سنجر جیسا جلیل القدر بادشاہ تخت نشین ہوا، لیکن وہ بھی ملاحدہ کے خلاف کوئی معقول اقدام نہ کر سکا۔ حالانکہ کم و بیش اس کی حکومت کی مدت ۱۲ سال رہی (راحۃ الصدور ص ۱۶۱)

اسی سلطان محمد کے دور کا مشہور قصہ احمد عطاش کے اصفہان لائے جانے کا ہے۔

وارستہ کی صلاحیت کا تقابلی مطالعہ

وارستہ فارسی فرہنگ نویسی میں بڑا کمال رکھتا تھا، الفاظ کی تحقیق و تنقید میں بلاشبہ خان آرزو (وفات ۱۱۶۹) اور ٹیک چند بہار کے ہم پلہ نظر آتا ہے۔ وہ اندھی تقلید کا قائل نہیں، اس میں شبہ نہیں کہ اس کی کتاب کے بیشتر الفاظ، فقرات، مصطلحات، محاورات وغیرہ قدماکے یہاں ملتے ہیں، مگر وہ سب پر تحقیق کی نظر ڈالتا ہے، اور جو کمی یا نقص نظر آتا ہے، اس کو دور کرتا ہے، کبھی کبھی کسی لفظ کی توضیح و تشریح میں زیادہ سند پیش کر کے اپنا بیان زیادہ مدلل کر دیتا ہے، اسی وجہ سے اس کے یہاں اکثر محققین اور نقاد کی کھلی تنقید ملتی ہے، البتہ مجھے ذاتی طور ان کی اس رائے سے اتفاق نہیں کہ زبان کے معاملے میں ہندوستانیوں کا بیان سند کا درجہ نہیں رکھتا، اہل زبان کو بلاشبہ غیر اہل زبان پر اس اعتبار سے فوقیت حاصل ہے کہ تخلیقی ادب میں ان کا پلہ بھاری رہتا ہے، لیکن تنقید و تحقیق میں، خواہ تاریخی و ادبی ہو، خواہ لسانی و فرہنگی، اہل ایران اور اہل ہند دونوں برابر ہوتے ہیں، اگر ایسا نہ ہوتا تو ہندوستان میں فارسی کے اتنے لغات نہ لکھے جاتے، فرہنگ نگار اس

وقت تک فرہنگ نویسی میں کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک زبان و ادب پر پوری دستگاہ نہ رکھتا ہو، اور جیسا کہ معلوم ہے اکثر و بیشتر فرہنگیں ہندوستان ہی میں لکھی گئیں، اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ لغات و فرہنگ کے علم میں اہل ہند اہل ایران سے ہرگز پیچھے نہیں، وارستہ احساس کمتری کا شکار ہے، اسی وجہ سے وہ اس مکتبۂ خیال سے وابستہ ہوا جو اہل ہند کی فارسی دانی کے قایل ہی نہ تھے، مجھے ڈاکٹر عبداللہ کے اس بیان سے اتفاق نہیں جو وارستہ کی مدح میں ہے:

"ہر واژہ و محاورہ را مورد وثوق قرار میدہد و ہر قسمت آن را مثل یک نفر ایرانی الاصل بررسی می نماید"

مجھے کہنے دیجیے کہ بعض اہل ہند نے فارسی زبان دانی کا جیسا ثبوت اپنی تصانیف سے دیا ہے، اس کی مثال اہل ایران پیش نہیں کر سکے ہیں، ان زبان دانوں میں عبدالرشید ٹھٹھوی، ٹیک چند بہار، سراج الدین علی خان آرزو، اور خود وارستہ کے نام بلا جھجک پیش کیے جا سکتے ہیں، خلاصۂ کلام یہ کہ وارستہ اپنوں کو کسی شمار و قطار میں نہیں رکھتا حالانکہ وہ خود بیسیوں ہندوستانی شعرا کے کلام سے شواہد پیش کرتا ہے۔ وارستہ کے اسی جذبے کا نتیجہ ہے کہ وہ اپنے ماخذ میں "محاورہ دانان ایران" کا اضافہ کرتا ہے۔ یہ زبان دانان ایران کون تھے، ان سے وارستہ نے کب اور کہاں ملاقات کی، پندرہ سال وہ کن محاورہ دانوں سے ملتا رہا۔ اس نے واضح طور پر بیشتر الفاظ کی توضیح کے آخر میں محاورہ دانان ایران کا مخفف نشان "م ع" لکھ کر ہم جیسے لوگوں کو ڈرا دیا ہے کہ اس نے اپنی کتاب کے تقریباً سارے مندرجات کی سند اہل ایران سے حاصل کر لی ہے۔

لیکن اس سے یہ خیال نہ کرنا چاہیے کہ مجھے وارستہ کی فرہنگ نویسی کی فضیلت سے انکار ہے، میرے نزدیک وہ ہندوستان کے ان چند فرہنگ نویسوں میں ہے جن کی قابلیت کا ڈنکا چار دانگ عالم میں بج رہا ہے، لیکن اس نے بلا استثنا سارے اہل ایران کی زباندانی اور فرہنگ نویسی کی صلاحیت کا ڈنکا پیٹ کر ہندوستانیوں کو رسوا کیا ہے، وہ علی حزین اصفہانی کا پیرو تھا اور مجھے یہی خیال ہوتا ہے کہ "محاورہ دانان اہل ایران" (م ع) سے مراد علی حزین اور ان کے چند ہمنوا ہوں گے۔

وارستہ نے سراج الدین علی خان آرزو سے بڑا استفادہ کیا ہے، کہیں کہیں اس کے بیان میں کچھ اضافہ، کہیں اختلاف کیا ہے، کہیں اس کے اشعار بطور سند پیش کئے ہیں، چند مثالوں سے اس کی توضیح ہو جائے گی۔

خان آرزو کی چراغ ہدایت سے اس طرح استفادہ ہوا ہے:

چراغ ہدایت (آرزو)

آب بر آینہ زدن و ریختن: رسمی است کہ در قفای شخص کہ بسفر میرود آب بر آینہ بریزند کہ
بسلامت باز آید و این را شگون می دانند
طغرا: کوی تو منزل گہ در سفر آشنا
بر رخ آینہ آب از پی بیگانہ ریز

مصطلحات (وارستہ)

چون کسی بعزم سفر از خانہ برآید، کس
در کوی او چند برگ سبز بر آینہ گذاشتہ
آب بر آن ریزند و این را شگون زود
ہم رسید نہا رانند (محاورہ دانان ایران)
نظام دست غیب:
دیدہ را تر کنم از اشک چو رفتی از بزم
در قفای سفری آب بر آئینہ زنند
طغرا: کوی تو منز لگہ اغ

ان دونوں بیانات سے صاف ظاہر ہے کہ وارستہ نے خان آرزو سے استفادہ کیا ہے، معنی میں چند لفظوں کا اضافہ ہے جس سے اصل بیان میں کوئی فرق نہیں پڑتا، وارستہ کی زیادتی ہے کہ اس بیان کا ماخذ چراغ ہدایت کے بجائے "محاورہ دانان ایران" قرار دیتا ہے وارستہ نے ایک شعر تو آرزو سے لیا ہے، مگر نظام دست کا شعر خود اس کا اضافہ ہے، اس نے تاثیر کے شعر کو نظر انداز کر دیا ہے، وارستہ نے طغرا کے شعر کے بعد گربستن آینہ، وچشم تر کردن آئینہ، و آئینہ از پی داشتن و آب از پی ریختن ہمان، پھر صائب، سنجر کاشی، ایجی کاشی کے اشعار سے معنی کی فصاحت کی ہے۔

چراغ ہدایت (آرزو)

آب بہ پوست افگندن میوہ: آنست کہ چون
میوہ بہ پختگی رسد آب از جوہر میوہ بہ پوست

مصطلحات (وارستہ)

آب بہ پوست افگندن میوہ: اکثری برآنند کہ کنایہ
از بالیدن است و ماخذ آن بالیدن د لو

آید و پوست از خشکی برطوبت گراید، لهذا
طفلی را کہ بالغ شود باصطلاح رندان
گویند کہ آب بہ پوست افگندہ است ومثل

میوہ رسیدہ، سعید اشرف :
میوہ شیریں تر شود چون آب انداز بر دپوست

مشک پُر آبت و بعضی گویند کہ
چون میوہ بہ پختگی رسد آب از جوہر میوہ
بہ پوست آید و بالیدہ شود، اینما الملاق
آن را بر میوہ دانند ۔۔ اس کے بعد ظہوری
کی رباعی، سلیم کا ایک شعر اور ساطع کا
ایک جملہ نقل کیا ہے۔

ان دونوں کے مطالب پر نظر ڈالنے سے ظاہر ہے کہ وارستہ نے خان آرزو کے بیان پر اضافہ کیا ہے، پھر دو تین دوسرے شاعروں اور ایک نثر کے جملے سے مطالب کی توضیح کی ہے۔

چراغ ہدایت (خان آرزو)

بت اشرفی، صورتی است کہ بر اشرفی سکہ کنند
وظاہر امراد از اشرفی ہون است کہ رایج دکن
است، با آنکہ مطلق طلای مسکوک را اشرفی
خوانند؛ اشرف:
اشرف از حرص چہ چسپی بہ زر و سیم مگر
چون بت اشرف از بہر زرت ساختہ اند

مصطلحات (وارستہ)

بت اشرفی یا بت زر، صورتی کہ بر
اشرفی مسکوک کنند، در
عہد اکبری و جہانگیری در ہند بیک
رویۂ اشرفی صورت گاو و آہو و
امثال آن نقش می کردند، مولف
ازیں قسم اشرفی دیدہ، لمغرا:
رخسار بت زر کہ بنودش مژہ یک سو
تا گشتہ نظر کردۂ آن رو مژہ دارد
و اشرفی کہ ہر دو رویش صورت مسکوک
باشد، آن را دو بتی گویند، صادق تحبیب
از سکہ ہر شاں بہ بازار وفا
قلم چو طلای دو بتی گشت عزیز
(ص ۷۰)

ڈاکٹر سید عبداللہ نے اس پر یہ اضافہ کیا ہے کہ مولف کا مقصود جہانگیری کے

سونے اور چاندی کے ۱۰۱۴ اور ۱۰۳۰ کے ڈھلے ہوئے سکوں سے ہے، یہ سکے احمد آباد اور آگرے کے ڈھلے ہوئے تھے، اس کے علاوہ جہانگیر کا عکس بھی بعض سکوں پر تھا، ڈاکٹر موصوف فرماتے ہیں اس طرح کے سکے شیرانی صاحب کے ذخیرے میں تھے۔

راقم السطور کا خیال ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے یہ اضافی بیان غیر ضروری ہیں اس لیے کہ وارستہ نے صرف سونے کی اشرفی کا ذکر کیا ہے، چاندی کے سکے کا نہیں۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ توزک جہانگیری میں جہانگیر نے جو اپنے سکوں کی تفصیل دی ہے، اس میں اس نوع کی اشرفی کا ذکر نہیں، سرسید مرحوم نے جہانگیر کے بعض چاندی کے سکے حاصل کیے جن کا ذکر توزک کے مطبوعہ نسخے میں ہے اور اردو ترجمے (ج ۱ ص ۶۰-۶۳) میں بھی پایا جاتا ہے۔

ذیل میں چند مثالیں ایسی ہیں جن میں وارستہ نے خان آرزو پر اعتراض کیا ہے:

پس کار نشستن بمعنی مشغول شدن کے ذیل میں آیا ہے۔

صاحب سراج اللغۃ در شرح این بیت شیخ شیراز کہ:

شاید پس کار خویشتن نشستن لیکن نتوان دہان مردم بستن

معنی پس کار نشستن گذشتن از کار و مطلب نوشتہ و حال آنکہ این معنی باستناد اشعار مذکورہ خلاف قدما و متاخرین است، نون نافیہ کہ در شعر شیخ برسر نشستن است وافادۂ ترک کار و مطلب می کند آن را موحدہ فہمیدہ کہ منشای غلط گردید (ص ۹۵)

(صاحب سراج اللغۃ یعنی خان آرزو شیخ سعدی کی حسب ذیل بیت میں:

شاید پس کار خویشتن نشستن لیکن نتوان دہان مردم بستن

(اپنے کام کو چھوڑ دینا ممکن ہے لیکن لوگوں کا منھ بند نہیں کیا جا سکتا)

(پس کار نشستن کے معنی کاروبار بند کر دینا لکھا ہے حالانکہ یہ معنی قدما اور متاخرین کے خلاف ہے جیسا کہ مندرجۂ بالا اشعار سے واضح ہے، اور نون نفی جو شیخ کے شعر میں نشستن، میں ہے اور جس سے ترک کار و مطلب مراد ہے، اس کو مثبت سمجھا ہے، اور یہی ان کی غلط فہمی کی بنیاد ہے)

روزگاراست در تمنی و ترجی گویند یعنی کار عالم است شاید نقش بمراد نشیند،
سالک یزدی:

سالک منشین بہ نامرادی　　نومید مباش روزگاراست

صاحب سراج اللغتہ نے شرح گلستان میں لکھا ہے کہ " نامرادی " لفظ غلط ہے اس لیے کہ " نا " کا سلب اس جگہ ضروری ہوتا ہے کہ " مواطات "[1] کی صورت ہو یعنی مبتدا کی خبر بغیر زوابط کے آئے (مواطات)، وارستہ کہتا ہے کہ یہ لیسے کیسے ہو سکتا ہے متقدمین جو اہل کے امام فن ہیں، ان کے کلام اس لفظ (نامرادی) کی صحت کی دلیل ہیں، تو اس کو غلط قرار دینا بڑی غفلت کی بات ہے۔ (وارستہ ۲۲۵)

وارستہ نے حسب ذیل اشعار پیش کئے ہیں جن میں نامرادی کا لفظ موجود ہے۔

آصفی:　　ہمہ شب آصفی دست دعا بر آسمان دارد
　　زروی نامرادی مانده سر در پای دیوارست

طالب کلیم:　　در کنج نامرادی تاکی ز منع دشمن
　　درز بر سرگذارم دست دراز خود را

حیاتی گیلانی:　　زنہال نامرادی منم آن فتاده برگی
　　کہ ز حسرتی کہ دارم ہمہ شاخسار گویم

طغرا:　　مراد چرخ بود نامرادی ہمہ عالم
　　مراد او چو برآید کسی مراد ندارد　　(ص ۲۳۵)

غالب کے زمانے میں " نامراد " کی عدم صحت کا مسئلہ اٹھا تھا، چنانچہ انھوں

---

[1] مواطات موافقت کرنا، اصطلاحاً مبتدا کی خبر بلا واسطہ ہو، یعنی اس میں زد وغیرہ کا انضمام نہ ہو، جیسے زیدٌ قائمٌ بخلاف زیدٌ قیامٌ، قیام کے بجائے زد قیام۔ (غیاث اللغات، فرہنگ معین ج ۲ ص ۴۴۱۹)

نے مرزا تفتہ کے نام کے ایک خط میں اس طرح لکھا تھا۔
سنو میاں میرے ہم وطن یعنی ہندی لوگ جو وادی فارسی دانی میں دم مارتے ہیں وہ اپنے قیاس کو دخل دے کر ضوابط ایجاد کرتے ہیں جیسا وہ گدھا کہ سکی، ابوعبدالواسع ہانسوی لفظ نامراد کو غلط کہتا ہے الخ (غالب کے خطوط ج ۱ ص ۲۳۶) حق یہ ہے کہ خان آرزو ہوں یا ہانسوی انھوں نے "نامرادی" کے لفظ کو غلط قرار دینے میں بڑی غلطی کی ہے، وارستہ کا بیان اس کے غلط ثابت کرنے کے سلسلے کا اوپر نقل ہو چکا ہے، ذیل میں جدید دور کے سب سے معتبر محقق ڈاکٹر معین ایرانی کا قول نقل کرتا ہوں:

(الف) نامراد ۱۔ آنکہ بمقصود نرسیدہ، محروم، ناکام؛ "چاشت و شام شاعران
مفلس و نامرادان بینوا از دسترنج دکان او بود"
(عالم آرا، چاپ امیر کبیر ج ۱ ص ۸۸)
۲۔ ناراضی، ناخشنود
۳۔ ناامیدی، ناکامی
وزان خشت زرّین شدّاد عاد
چہ آمد بجز مردن نامراد (نظامی)
(ب) نامرادی ۱۔ ناکامی، بی مرادی، حرمان، یاس؛
بہ مجالست و مناقشت اہل آن بقعہ۔۔ تزجیت ایام نامرادی می کردم
(مرزبان نامہ ۱۳۱۷، ص ۹)
۲۔ عدم رضایت، ناخشنودی
۳۔ بدبختی۔
(ج) نامرادی بردن، محروم ماندن، ناکام بودن
اگر ہرچہ باشد مرادت خوری
ز دوری بسی نامرادی بری (سعدی)
(فرہنگ معین ج ۴ ص ۴۶۲۰)

صاحب عالم مارہروی کے خط میں نامرادی و بے مرادی کا قصہ اس طرح ہے۔
وہ میاں صاحب ہانسی کے رہنے والے بہت جوڑے چکلے جناب عبدالواسع فرماتے کہ بے مراد صحیح اور نامراد غلط، ارے تیرا ستیاناس جائے بے مراد اور نامراد میں وہ فرق ہے جو زمین اور آسمان میں ہے، نامراد وہ جس کی کوئی خواہش کوئی آرزو نہ برآئے اور بے مراد وہ کہ جس کا صفحۂ ضمیر نقوش مدعا سے سادہ ہو از قسم بے مدعا، بے غرض و مطلب۔ ادبی خطوط غالب (۱۹۲۳) (۷۶،۷۷)

لغت نامۂ دہخدا میں نامراد، نامرادی اور نامرادی بردن تین الگ الگ اندراج ملتے ہیں، نامراد بے مراد، ناکام، بمقصود نرسیدہ، مایوس، محروم، ناامید، بی بہرہ، بی نصیب

بدخواہ او نشرند و نوان بادو نامراد۔ احباب او بہ عشرت و اقبال کامران (فرخی)

ہمراہ او براہ وفا ہمدمی نبود — گر بہ عنان خود بمن نامراد داد (مشلفی)
نیامد از منت یکبار یادی — کہ گوئی بود اینجا نامرادی (وحشی)
بہ کوہ این نامرادی سنگ فرسای — بہ نقش پای شیرین چشم ترسای (وصال)
وزان خشت زرین شدّاد عاد — چہ آمد بجز خوردن نامراد (نظامی)
روزی بینی بکام دشمن — زرماندہ و نامراد مردہ

نامرادی، ناامیدی، یاس، حرمان، ناکامی۔
نامرادی را بجان در بستہ ام — خدمت غم را میان در بستہ ام (خاقانی)
نامرادی مراد خاصان است — پس قدم در رہ اہل منہید (ایضاً)
و در یں نامرادی بود تا در شب دوشنبہ از دنیا بہ عقبی رسید (جوینی)

این ہمہ سختی و نامرادی سعدی
گر تو پسندی سعادت است و سلامت (سعدی)
گر مراد تو ای دوست نامرادی ماست
مراد خویش دگر باره نخواہم خواست (سعدی)

ہرکہ درین کسوت تحمل نامرادی نکند مدعی است و خرقہ بروی حرام (مجالس سعدی)
نہ ہجرت غم وبدنی وصل شادی یکی دانی مراد و نامرادی (وحشی)
چو دیدا زیک نظر یک عمر شادی رسیدش نیز عمری نامرادی (وصال)
کجا شیرین کجا آن دشت و وادی کجا شیرین وکوی نامرادی (،)
نامرادی، ناخشنودی ۔
چو غوغا کند بردلم نامرادی من اندر حصلہ رضا میگریزم (خاقانی)
نامرادی بردن، ناکامی کشیدن، حسرت کشیدن، تحمل رنج و نومیدی کردن ۔
اگر برچہ باشد مرادت خوری زدوری بسی نامرادی بری (سعدی)۔
(لغت نامۂ دہخدا شمارۂ مسلسل ۸۰، ص ۲۳۶)

تفصیلات بالا سے واضح ہے کہ نامرادی فارسی میں کافی مستعمل ہے اور اس بنا پر سراج الدین علی خان آرزو اور عبدالواسع ہانسوی کے اقوال غیر مستند ہیں۔

خان آرزو نے حزین کے اشعار پر اپنی تصنیف تنبیہ الغافلین میں اعتراض کئے ہیں، وارستہ نے اپنے ایک رسالے رجم الشیاطین میں ان اعتراضات کا جواب دیا ہے، ان جوابات سے ان کی زباندانی، فن لغت نویسی میں غیر معمولی دستگاہ کا پتا چلتا ہے، مصطلحات میں ایک جگہ آیا ہے۔ بحذف یای حطی آخر (ہایہای)؛ مومن استرآبادی،

ہای ہوئی میرسد امشب بگوش ہوش یار
ہمنشین از گریۂ بر ہایہا معذور دار

وازین عالم است حذف یای لفظ وای چنانکہ میرمعز فطرت گفتہ :

نالہ انگشتی زند گر برلب خاموش من
آسمان فریاد بردارد کہ ای واگوش من

لا محالہ سراج الدین علی خان اعتراضی کہ بنا بر حذف یای آخر ہایہای درین شعر شیخ محمد علی حزین کردہ اند :

بی تو چو شیشۂ شکستہ ازگریۂ ہایہاست مارا

وارستہ کی علمی فضیلت کا صحیح اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب ہم اس کا موازنہ ٹیک چند بہار سے کرتے ہیں، بہار اور وارستہ معاصر تھے، بہار کی شہرۂ آفاق کتاب بہار عجم ہے، بہار عجم وارستہ کی مصطلحات سے کافی پہلے لکھی گئی، اس کا پہلا ایڈیشن ۵۲ ۱۷ مطابق ۱۱۶۶ھ میں شائع ہوا اس وقت تک مصطلحات کا نام ونشان نہ تھا وارستہ نے مصطلحات اس کے ۱۴ سال بعد لکھنا شروع کی اس کے مقدمے سے پتا چلتا ہے کہ وہ ۱۵ سال تک اس کے لیے مواد جمع کرتا رہا، اور چونکہ اس کو ہندوستانی فضلا و شعرا پر پورا اعتماد نہ تھا اس لیے وہ ایرانیوں سے ملتا رہا اور انھیں سے فارسی زبان و فرہنگ کے غوامض سیکھتا رہا۔ بہار کی کتاب بہار عجم اس کے مطالعے میں رہی، بہت ممکن ہے کہ اسی کتاب کی وجہ سے اس کو مصطلحات لکھنے کا شوق ہوا ہو اس کو بہار عجم میں کوتاہیاں نظر آئیں، غرض وارستہ نے مصطلحات ۱۱۸۰ھ کے بعد تیار کی اور بہار عجم کی بعض کوتاہیوں کو بھی رفع کیا، دراصل وارستہ کی کتاب کے منظر عام پر آنے سے قبل "بہار عجم" کے کئی ایڈیشن نکلے، ڈاکٹر سید عبداللہ کی تحقیق کے مطابق بہار عجم پہلی بار ۵۲ ۱۷ء میں اور ساتویں بار ۸۲ ۱۷ء میں چھپی، اور لطف کی بات یہ ہے کہ بہار ہر بار ضروری ترمیم و اضافہ کرتے رہے، چنانچہ ترمیم شدہ ایڈیشن میں مصطلحات کا بیشتر حصہ شامل کر لیا گیا ہے، ڈاکٹر عبداللہ کا اس سلسلے کا ایک طویل اقتباس نقل کرتا ہوں:

> "لالہ ٹیک چند بہار نے جب (بہار عجم کا) دوسرا ایڈیشن تیار کیا تو اس وقت وارستہ کی مصطلحات سے بہت فایدہ اٹھایا، چنانچہ وہ دیباچۂ بہار عجم میں لکھتے ہیں کہ مجھے رسالہ میر افضل ثابت، مصطلحات وارستہ اور رسالۂ مخلص تک پہلی ایڈیشن تیار کرنے کے بعد رسائی ہوئی، بلوخمن CONTRIBUTION میں لکھتے ہیں کہ بہار نے اس کتاب کو کاملاً بہار عجم میں شامل کر لیا ہے، یہی وجہ ہے کہ یہ رسالہ زیادہ مشہور نہیں ہو سکا۔ ہم نے خود بھی بہار عجم کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ بہار بالعموم وارستہ کی تمام عبارتوں کو حرف بحرف بہار عجم میں نقل کر لیتا ہے اور بہت کم اس پر تنقید کرتا ہے۔ ذیل میں ہم بعض الفاظ و محاورات نقل کرتے ہیں جو بہار نے وارستہ سے حرف بحرف نقل کئے ہیں:

(مصطلحات) (بہار عجم)

وارستہ: آب از آتش برون آوردن و بر کشیدن

امر غریب غیر ممکن بظہور آوردن، طبیع اثر: ایضاً

در گداز دل عجب دستی ست مژگان ترا

آب از آتش برون آرد برنگ شیشہ گر

میر معزی:

من چو خواہم کرد فریاد آب از آتش بر کشم

او چو خواہد خورد تشو بر آتش افروز زکب

آبی شدن معاملہ: برہم شدن معاملہ و از نظام افتادن بہار عجم

کار، نعمت خان عالی در محاصرۂ حیدر آباد گوید: فقرہ ایضاً

طائفہ را بمقتضای "فاغرقناہم فی الیم" معاملہ

چندان آبی شد کہ دست از حیات ستعار شستہ

اس کے علاوہ یہ مصطلحات حرف بحرف بہار عجم اور وارستہ میں ملتی ہیں:

آب دادن تیغ و خنجر، آب بر ریسمان بستن، آبلہ بستان، آبدانی، آب آتشناک، آتش کش، آتش گیرہ، آتش خوردن، آخر ندارد، آدم بہ آدم می رسد، آزاد درخت، آستین از چشم برداشتن و از خرد جدا کردن، آستین برخ کشیدن، آستین بر چیز زدن، آستین بر گذر گریہ سودن، آستین از دور برداشتن، آستین بر چشم و جبین و دیدہ و دل کشیدن، آستین نداشتن، آسیای فلان بلب چشمۂ خضر و از آب طلا می گردد، آسیای فلانی از بی آبروئی وا ثر است، آفتاب جگر، آفتاب مغربی، آلکی، آوردن آب چیز را، آواز با آواز رسانیدن، آئینہ بر پیشانی بستن وغیرہ وغیرہ۔

اس میں شک نہیں کہ بہار نے کہیں کہیں کاٹ چھانٹ کی... تاہم ہمیں یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ بہار نے مصطلحات وارستہ کو کاملاً بہار عجم میں شامل کر لیا ہے... اور جیسا کہ ہم

سطور بالا میں محاورات کی فہرست دے کر واضح کر دیا ہے کہ بہار نے وارستہ کی کتاب کو حرف بحرف نقل کیا ہے۔"

ایک بات قابل ذکر یہ ہے کہ جب تک بہار عجم میں یہ نہ ضبط ہو کہ سارے محاورے مصطلحات سے لیے گئے ہیں اس وقت تک صاحب بہار عجم پر وارستہ سے نقل کر لینے کا الزام عاید نہیں ہو سکتا، ممکن ہے کہ دونوں کے ماخذ میں یہ ہوں اور دونوں نے وہیں سے لیا ہو، ایک دوسرے سے نہ لیا ہو، یہ معاملہ بہت مشکل ہے، اور جب تک بہار عجم کے سارے ایڈیشن کا تنقیدی مطالعہ نہ ہو جائے اور پھر مصطلحات سے ان کا مقابلہ نہ ہو، اس وقت تک اس مسئلے کا فیصلہ یک طرفہ ہوگا اور وہ قابل قبول نہ ہوگا۔

البتہ مصطلحات میں بعض مقامات پر بہار عجم کے مندرجات پر اعتراض کیا گیا ہے، مثلاً، آہنگ بچند معنی آمدہ اوّل آواز موزون . . . وحید:

از نگہش باختہ گل رنگ خویش   بلبل دل سوختہ آہنگ خویش

وحید کی اس بیت میں ٹیک چند بہار نے آہنگ سوختن کو الگ سے ایک محاورہ سمجھا ہے، حالانکہ شعر کا مفہوم یہ ہے کہ پھول اپنا رنگ کھو چکا ہے اور دل سوختہ بلبل اپنی آواز، پیش نظر نسخے کے حاشیہ میں ہے کہ بہار عجم کے متداولہ نسخے میں آہنگ سوختن محاورہ نہیں ہے، (مصطلحات ص ۲۴)

ترک بمعنی کلاہ و گوشۂ کلاہ ۔ نظامی گنجہ فرماید:

زسر ترک بر داشت گفتا منم
ہنر بری کہ زین گونہ شیر افگنم . . .

مصنف بہار عجم گوید کہ بعض شارحین در معنی بیت مذکور شیخ گنجہ نوشتہ اند کہ وقت خوشی و مفاخرت کلاہ از سر برداشتن رسم ولایت است، اما این معنی از ہیچ کتاب ظاہر نیست، بل آنچہ دیدہ شد ہنگام تواضع از فرنگیان چنین رسم سر می زنند، بہتر آنست کہ کلاہ از سر مخالف برداشتن بود یعنی کلاہ از سر

خصم مقتول بر داشتہ بمردم نمود کہ از من چنین کاری بوجود آمدہ، و این از راہ
مفاخرت باشد انتہی کلامہ، بندہ وارستہ از ثقات ایران شنیدہ کہ چوں
کسی خواہد خود را مدیگری بشناساند کلاہ را از مقدم سر یک سو کند و بمو خود سر
بر ساند، و ایں کنایہ است از گردن سروری خود و گویدہاں! مرا بشناس کہ
من بایں بزرگی و شجاعتم۔ (ص ۱۳۲)
اس میں شبہ نہیں کہ سر سے ٹوپی اتارنے کے محاورہ کو مقتول کے سر سے خود اتارنے کے معنی میں
خیال کرنا صحیح نہیں ہے۔

عرفی شیرازی: بعشوۂ کہ زلیخا بریدازو کف دست
بفتنۂ کہ میحا گزید از وسردار

مصنف بہار عجم نے اس شعر پر ایراد کیا ہے اور کہا کہ اس پر اعتراض یہ ہے کہ زنان
مصر کا ہاتھ کاٹنا نص قرآن سے ثابت ہے، اس وقت زلیخا کے ہاتھ کٹنے کی صورت یعنی عرفی
سے اس کا صدور موجب تعجب ہے، اور دوسرے مصرعے کا مضمون واقعے سے دور ہے اس
لیے کہ حضرت عیسیٰ سولی پر نہیں چڑھائے گئے تھے، حضرت عیسیٰ پر جو اتہام لگایا گیا، جس
کی وجہ سے وہ سولی پر لٹکائے گئے اس کی وجہ جناب بہار کے گوش گزار نہ ہوئی اس کی بنا پر وہ
ایسا کہتے ہیں، یہ حکایت تفسیر بیضاوی میں مفصل مرقوم است، جس کو خواہش ہو وہاں دیکھ
لے، اور صاحب جلالین (جلالین مختصر اور مفید تفسیر ہے) کہتے ہیں:

المقتول المصلوب هو صاحبهم ای القی علیه شبهہ نظنوہ
ایاہ،

مطلب یہ کہ مصلوب اصحاب یہود میں سے تھا جو خدا کی قدرت سے حضرت عیسیٰ کی صورت میں
ظاہر ہوا اور ان لوگوں نے حضرت عیسیٰ سمجھ کر اسے سولی پر چڑھا دیا، پس حضرت عیسیٰ کی پھانسی
کے منصوص ہونے میں شبہ نہیں رہا، زنان مصر کا ہاتھ کاٹنا زلیخا کے عشوہ کی بنا پر تھا جس نے
اپنی برأت کے لیے یہ کھیل کھیلا تھا، درحقیقت زنان مصر کے ہاتھ زلیخا نے کاٹے تھے نہ
کہ زلیخا نے اپنے ہاتھ کاٹے، غرض (بہار کے) دونوں اعتراض عدم واقفیت کے نتیجے

ہیں۔ خطای بزرگان گرفتن خطاست (ص ۱۶۱-۱۶۲)

اگرچہ میرے نزدیک وارستہ کی تاویل میں وزن نہیں اور بہار کے اعتراض اپنی جگہ باقی ہیں لیکن اس کے باوجود وارستہ نے بہار کے اعتراض کے رد میں اپنی بڑی قابلیت اور علمی فضیلت کا ثبوت دیا ہے۔

سیاہ پستاں، زنی کہ فرزندش نزیدو اگر بہ پسر غیر شیر دہد او ہم بمیرد،
باقر کاشی، امسال خوش بہار است ای باغبان مبارک
ابر سیاہ پستان بر بوستان مبارک

مصنف بہار عجم نے اعجاز رشیدی ہیں اس شعر میں سیاہ پستان کے معنی بہت برسنے والا بادل قرار دیا تھا، حالانکہ این معنی جمہور کے قول کے خلاف ہے، اور ساتھ ہی سیاہ پستان کے اصلی معنی اس شعر میں بالکل ٹھیک اترتے ہیں، فتامل (ص ۲۷۰-۲۷۱)

میرے نزدیک وارستہ کا مصنف بہار عجم پر اعتراض صحیح نہیں، اس لیے کہ زن "سیاہ پستان" نحوست کی علامت ہے، تو ابر سیاہ پستان بھی منحوس ہونا چاہیے، اس کی نحوست یہ ہوگی کہ جس زمین پر وہ برسے گا اس پر گھاس، پیڑ پتی، سب سوکھ جائیں گے، ایسا ابر بوستان کے لیے قابل مبارک نہیں ہوسکتا، بالفاظ دیگر ابر سیاہ پستان سے مراد ایسا بادل ہو جو پانی سے لدا ہو، اور ایسا بادل خوب برسے گا اور اس کی وجہ سے باغ سر سبز و شاداب ہوگا، سیاہ بادل برسنے والا ہوتا ہے، سیاہ پستان جب بادل کی صفت ہو تو اس سے یہ مراد ہوگی کہ جس طرح پستان مادر دودھ سے بھر ہوتی ہے، اسی طرح بادل بھی پانی سے بھرا ہوتا ہے۔

ڈاکٹر معین کی فرہنگ ج ۲ ص ۱۹۶۸ میں سیاہ پستان کے یہ معانی درج کئے ہیں ۱۔ زنی کہ پستانش سیاہ رنگ باشد
۲۔ زنی کہ کودک خود را مراقبت و تربیت نکند (کنایہ)
۳۔ زنی کہ ہر کودک کہ شیر او را بخورد بمیرد (کنایہ)

اس بیان سے واضح ہے کہ سیاہ پستان اصلی لغوی معنی میں (یعنی سیاہ رنگ)

استعمال ہوتا ہے، اس کی رو سے ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ ابر سیاہ پستان کے معنی ابر سیاہ کے ہیں جو خوب برسنے والا ہوتا ہے، اور ایسی صورت میں باقر کاشی ابر سیاہ پستان کی آمد پر بوستان کو تبریک عرض کرتا ہے۔

وارستہ اور ان کی مصطلحات کے بارے میں جو تفصیلات پیش کی گئی ہیں، ان سے صاف ظاہر ہے کہ ہندوستان فارسی زبان کا بڑا مرکز ہو چکا تھا جس کو چار و ناچار تسلیم ہی کرنا ہے، دوسرا اہم نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ فارسی زبان اور فرہنگ کے معاملے میں ہندوؤں کی خدمات مسلمانوں سے زیادہ ہیں، ان کی زباندانی مسلّم ہے، اس لئے بوے کچوری می آید" کا فقرہ خود اس فقرے کے چست کرنے والوں پر عاید ہوتا ہے، البتہ افسوس کی بات یہ ہے کہ فارسی فرہنگ نویسی کا صحیح مطالعہ نہیں ہو سکا ہے، ضرورت ہے کہ یہ موضوع تحقیقی مطالعے کا موضوع قرار دیا جائے تاکہ محققین زبان کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ ہو سکے۔

پروفیسر وحید اختر

فکرِ غالب اور اردو تنقید

غالب نے دُعا کی تھی کہ

"یارب میرے بعد ایک ایسا انسان پیدا کر، جو میری ہی طرح گفتار کا گرویدہ ہو تاکہ وہ پہچانے کہ میری شاعری کے ایوان کی دیوار کتنی بلند ہے اور میری کمندِ خیالی کا سلسلہ کس مقام تک رسا ہے

ذوقیست ہمدمی بہ فغاں بجز رم زرشک
خارِ رہت بہ پائے عزیزاں خلیدہ باد"

غالب کے بعد ان کی راہ کے کانٹے چننے کی کوشش تو بہت سے رہ نوردانِ شوق نے کی، مگر ان کی خلش کی لذت سے آشنا ہونے والوں کی تعداد اب بھی بہت کم ہے۔ حالی نے غالب آشنائی کی راہ کھولی، بجنوری نے اس زمین کو آسماں سے ملانے کی کوشش کی، انھیں دیوانِ غالب میں وید مقدس کی الہامی کیفیت و شان دکھائی دی۔ ڈاکٹر عبداللطیف نے بجنوری کا رد لکھنے کے زور میں غالب نافہمی کی اس روایت کا سلسلہ دراز کیا جس کی بنا محمد حسین آزاد ڈال گئے تھے۔ غالب کی راہ کے کانٹے چننے اور انھیں آنکھوں سے لگانے والوں کی تعداد میں کمی نہیں آئی ان میں عبدالحق، نیاز فتح پوری، جوش ملسیانی، عبدالستار صدیقی، شیخ محمد اکرام،

طباطبائی، سہا، حسرت، شوکت میرٹھی، ناطق، غلام رسول مہر، شیخ اکرام، عرشی، مالک رام، رشید احمد صدیقی، حمید احمد خاں، سالک، آل احمد سرور، مجنوں گورکھپوری، احتشام حسین، ضیاء الدین، خورشید الاسلام، ظ۔ انصاری، ممتاز حسین، سردار جعفری، خلیفہ عبدالحکیم، عبدالمالک آروی، شوکت سبزواری، قاضی عبدالودود، قدرت نقوی، نذیر احمد اور ان کے علاوہ سیکڑوں راہ پیما ملتے ہیں۔ ہر ایک نے بقدرِ ظرف دادِ شوق دی۔ کچھ نے جواہر کو پہچانا اور پرکھا، کچھ نے سنگریزوں کو حاصل سمجھا، کچھ نے خاکِ راہ کو سُرمہ بنایا، بہت کم نے ان کانٹوں کی خلش کو رگِ جاں میں محسوس کیا جو غالب کے تخلیقی کرب اور ذہنی کیفیت سے عبارت ہیں۔ تنقید نے غالب کا حق کم ادا کیا، تحقیق نے ضرورت سے زیادہ غالب شناسی کی، جس کے نتیجے کے طور پر غالب کے خاندان، مذہب، تلامذہ، قیام گاہوں، ادبی مناقشوں، ان کے مخاطبوں، دوستوں، رشتہ داروں، خطوط، ممدوحوں، ملازموں، سفروں، مقدموں اور دشمنوں کے متعلق اتنی ضروری، غیر ضروری، کم ضروری معلومات جمع ہو گئیں کہ اس رطب و یابس کے ڈھیر میں غالب کو ڈھونڈنا پانا اور پہچاننا مشکل ہو گیا۔

تحقیق کا اصل کام ضروری اور متعلقہ مواد فراہم کرنا ہے جو ادب و شعر کی تفہیم و تفسیر و تنقید میں معاون ہو، تحقیق گورکنی اور مردہ فروشی نہیں کہ اپنی دکان چمکانے کے لیے جس کے ہاتھ کفن کا جو ٹکڑا لگ گیا وہ لے بھاگا اور اسی کی تشہیر و نمائش سے ادیبوں کی صف میں اپنے لیے کہیں نہ کہیں کوئی جگہ نکال لی۔ یہ غالب کی عظمت کی دلیل بھی ہے اور ساتھ ہی بدقسمتی بھی کہ آج اُن کے حاشیہ نشینوں کو بھی عظمت کا دعویٰ ہو چلا ہے۔ غالب پر تحقیق کرنے والوں میں ایسے حریفانِ مے مردافگنِ عشق" بھی ہیں جو غالب کی کم علمی، فارسی زبان اور لغت سے عدم واقفیت، اُن کی کمزوریوں اور خود نوشت اعمال ناموں (خطوط) کے داغوں کی تشہیر سے ہی اپنے احساسِ کمتری کو تسکین دیتے رہتے ہیں، اور ایسے بھی جو آج تک غالب کے کردار کو قتل کر کے اُن کے خون سے ذوق یا دوسرے کم اہم شاعروں کی عظمت کی مدھم تصویروں میں رنگ بھرتے ہیں۔ ایسے محققوں کی رسائی غالب کے ایوانِ سخن کی بلندی تک تو کیا ہوتی اُن کے لیے اس ایوان کے در، دیوار اور دیوار در بن گئے (کہ بن گئے میرے دیوار و در، در و دیوار)

اس طرح بظاہر تو غالب پر بہت کام ہوا۔ غالب صدی تقاریب کے شور و غل نے تو غالب کی طرف اتنے اہلِ قلم کو متوجہ کر دیا کہ مزارِ غالب پر مضامین، کتابوں، تحقیقات کا انبار لگ گیا مگر گہری نظر سے جائزہ لیا جائے تو بہت حیرت اور افسوس کے ساتھ معلوم ہوتا ہے کہ جہاں تک غالب کے فکر و فن کا تعلق ہے اِسے بیشتر لکھنے والوں نے بھاری پتھر سمجھ کر چوما اور چھوڑ دیا۔ فکر و فن پر جتنا بھی اور جیسا بھی کام ہوا ہے، وہ تشنہ ہے۔ دراصل ہوا یہ کہ غالب کو ہم نے اپنا ہیرو تو بنا لیا مگر اُن کے ظاہر ہی کو دیکھتے رہے، روح تک پہنچنے کی بہت کم کوشش کی گئی۔

غالب کو جن شاندار الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا گیا ہے اس کے آگے خدائے سخن میر کی خدائی بھی ماند پڑ گئی۔ بجنوری کی مبالغہ آمیز، تاثراتی طرزِ تحریر نے غالب کا رشتہ آسمان سے ملا دیا، انھیں ہومر، ورجل، شکسپیر، ملٹن، ڈانٹے، فردوسی، کالیداس سے ٹکرا کر ہر ایک کو غالب سے فروتر ثابت کیا۔ صرف ایک گوئٹے کو بخشا اور انھیں غالب کا ہم سر مانا۔ غالب کا میدان غزل قصیدہ اور مثنوی ہے۔ اِن اصناف کے حدود اور دائرۂ کار مغربی اصنافِ سخن بالخصوص رزمیہ اور ڈرامے سے اسقدر مختلف ہیں کہ اِن اصناف کے عظیم المرتبت عالمی شعرا سے غالب کا موازنہ ہی بذاتِ خود غلط ہے۔ غالب کی عظمت اِس میں نہیں کہ وہ ان تمام شعرا سے بہتر اور برتر ہیں بلکہ غالب کی عظمت اِس میں ہے کہ وہ اِن سب کے باوجود عظیم ہیں اور اپنی شاعری کے مخصوص و محدود دائرے میں رہ کر بھی اس بلندی تک پہنچ گئے ہیں جہاں تک دُنیا کے عظیم شعرا نے رسائی حاصل کی۔۔۔ غالب کی عظمت کا ایک اور راز ہے، وہ یہ کہ غالب کی صدسالہ برسی منائے جانے کے باوجود غالب آج بھی زندہ اور آج بھی جدید ہیں۔ یہ شرف اُن کے معاصرین کیا، اُن کے بعد کے شاعروں میں بھی شاید ہی کسی کو حاصل ہو۔ اس کے علاوہ یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ اردو کے عظیم اساتذہ میر، سودا، نظیر، انیس اور اقبال کو بڑا ماننے سے بھی غالب کی عظمت پر حرف نہیں آتا۔ غالب اِن شعرا کے مخصوص میدانوں میں اِن سے الگ الگ بازی نہیں لے جا سکے، پھر بھی وہ اپنے ذہن اور رویے، اپنے طرزِ اظہار اور بیان کی جرات کے ساتھ بحیثیت مجموعی اِن سے آگے نکل جاتے ہیں۔ غالب کی تنقید میں عام طور پر اِن حدود کو پیشِ نظر نہیں رکھا گیا۔ بجنوری نے موازنہ و مقابلہ کی حدود کے توڑنے میں سب پر سبقت

کی تھی اور آج تک ان کی تنقید کی کمزوریوں کے باوجود، ان کا اثر ہماری تنقید پر گہرا ہے۔
حالی اور بجنوری کے بعد غالب پر کام کرنے والوں کا ایک پورا گروہ سامنے آیا۔ محققین میں عرشی نے بنیادی کام کیا، اُن کا سارا کلام، منسوخ اور متداول، اکٹھا کر دیا۔ مہیش پرشاد اور غلام رسول مہر نے خطوط کی از سرِ نو تدوین و ترتیب کی، مالک رام اور قاضی عبدالودود نے ضروری مواد مہیا کیا۔ لیکن جہاں تک غالب شناسی کا سوال ہے شیخ اکرام کی "غالب نامہ" یادگار اور محاسن کے بعد پہلی کتاب ہے جس نے غالب کی شخصیت کو ان کی شاعری کی روشنی میں، اور شاعری کو شخصیت کی نفسیات سے سمجھنے کی قابلِ قدر کوشش کی۔ غالب کے شارحین میں طباطبائی، حسرت اور سُہا، کی شرحیں غالب شناسی کی ایسی کوششیں ہیں جو بہت سی دشواریوں کو آسان کرتی اور راہ کے بہت سے کانٹے ہٹاتی ہیں۔ خلیفہ عبدالحکیم کی کتاب "افکارِ غالب" بھی ایک طرح کی شرح ہے۔ خلیفہ عبدالحکیم نے بہت سے قدیم اور جدید فلسفوں کو غالب کی فکر میں تلاش کرنے اور غالب کے اشعار کو ان فلسفوں کی قبا پہنانے کی جو کوشش کی ہے وہ ہر جگہ یکساں طور پر کامیاب نہیں۔ پھر بھی یہ کتاب اسی طرز کی دوسری کتاب "فلسفۂ غالب" (شوکت سبزواری) سے زیادہ وقیع اور مفید ہے۔ رشید احمد صدیقی، آل احمد سرور، اور احتشام حسین کے چند مضامین، سردار جعفری کا "مقدمۂ دیوانِ غالب" اُن گنتی کی چند تنقیدوں میں شمار کیے جا سکتے ہیں جن سے غالب کے فکر و فن کی قدر متعین کرنے کے کام کا صحیح سمت میں آغاز ہوتا ہے۔ مستقل کتابوں میں خورشید الاسلام کی 'غالب، ابتدائی دور کے کلام اور ان کے ماخذ پر' اور ظ۔ انصاری کی "غالب شناسی" غالب کے بعض اہم پہلوؤں پر مفید اور مستند کتابیں ہیں۔ قدرت نقوی کے مضامین (مطبوعہ ماہِ نو) کے علاوہ عالم خوندمیری اور خلیل الرحمٰن اعظمی نے بھی غالب پر اچھے مضامین لکھے ہیں۔ ان مضامین میں کچھ اور نقادوں کے ناموں اور مضامین کا اضافہ کیجیے تب بھی فہرست مایوس کن ہی رہے گی۔

دراصل غالب پر کام کرنے کی راہ آج زیادہ ہموار اور روشن ہے اس لیے کہ ہم تحقیق سے ضروری مواد چن کر الگ کر سکتے ہیں اور اگلوں کی افراط و تفریط پر نظر رکھ کر غالب تک پہنچنے کی صحیح سمت اختیار کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔

میرے اس مقالے کا اصل موضوع "فکرِ غالب اور اردو تنقید کا جائزہ لینا ہے اور اسی سلسلے میں غالبؔ کی فکر کے اہم سرچشموں کا سراغ لگانا بھی ہے۔ اس کام کے لیے بنیادی مواد تو غالب کی خود اپنی شاعری فراہم کرسکتی ہے، لیکن ان کے ساتھ اُن کے مکاتیب، حالاتِ زندگی، ماحول اور مطالعے کے اُن پہلوؤں کو بھی پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے جنھوں نے غالبؔ کے مخصوص فکری رویّہ کی تشکیل میں نمایاں حصّہ لیا ہے۔ انھی ماخذوں سے ان اثرات کا سراغ بھی مل سکتا ہے جو غالب کے مخصوص طرزِ فکر پر اثرانداز ہوتے رہتے ہیں۔ مجموعی طور پر تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کی ہند۔ ایرانی تہذیب کا ورثہ ہی غالبؔ کا اصلی فکری سرچشمہ ہے۔ لیکن اس مُشترکہ تہذیب میں اُن عناصر کو جاننا ضروری ہے جو بطورِ خاص غالبؔ کی فکر میں روشن نظر آتے ہیں۔ غالب کی شاعری کو رشید احمد صدیقی نے بجا طور پر مغل تہذیب کا ایسا بیش بہا نمونہ قرار دیا ہے جسے تاج محل کے برابر قابلِ قدر مانا جا سکتا ہے۔ مغل سلطنت کا دور، ہند ایرانی تہذیب کے عروج کا دور ہے اور غالبؔ اس دور کا وہ نقطۂ عروج پیش کرتے ہیں جس سے آگے جانا قرونِ وسطیٰ کی اس جاگیردارانہ تہذیب کے لیے ممکن بھی نہ تھا۔ مگر خود غالبؔ اس تہذیب کے نمائندے ہونے کے ساتھ آنے والی نئی تہذیب اور ابھرتی ہوئی نئی اقدار کے نقیب بھی ہیں۔ مغل تہذیب جس نقطے پر آکر انحطاط کا شکار ہو گئی غالبؔ کی نظر اُس سے آگے تک گئی۔ وہ قدیم دور کے نمائندے اور جدید دور کے نقیب ہیں، اسی لیے شیخ اکرام کا یہ خیال کہ "غالبؔ قدیم و جدید کو ملانے والی اہم کڑی ہیں" حقائق پر مبنی ہے۔

غالبؔ کے فکری رویّوں، زندگی اور شخصیت میں ہمیں جاگیردارانہ تہذیب کی اچھی اور بُری خصوصیات کے ساتھ اس ذہن کی کارفرمائی بھی ملتی ہے جو اپنے زمانے اور ماحول کے حدود کو توڑ کر آئندہ زمانوں کے امکانات اور ان کی توانائی کو محسوس کر رہا تھا۔ اُن کے یہاں قدیم اور جدید کا تصادم بھی ملتا ہے اور اس تصادم کے نتیجے میں تذبذب اور تشکیک بھی، لیکن اِس کشمکش میں اُن کا میلان کعبے کی بجائے کلیسا کی طرف اور "پیچھے کے بجائے آگے" کی طرف واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ غالبؔ کے ناقد کے لیے کعبہ اور کلیسا "آگے اور پیچھے" کی علامتوں کو سمجھنا اور ان کی تفسیر کرنا بھی ضروری ہے۔ اور ان

مخصوص پہلوؤں کی نشاندہی کرنا بھی لازم ہے جن سے غالبؔ کی انفرادیت بنتی ہے۔

غالبؔ سے پہلے بھی اردو شاعری میں فکری عناصر ملتے ہیں مگر ہماری شاعری پر بحیثیت مجموعی غلبہ جذبے اور احساس کی شاعری ہی کا رہا ہے اس لیے آل احمد سرور کے الفاظ میں یہ کہنا کہ "غالبؔ نے اردو شاعری کو سوچنے والا ذہن دیا" غلط نہ ہوگا۔ غالبؔ کی شاعری، دوسرے شعراء کے مقابلے میں ذہن کی شاعری ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ ان کی شاعری جذبے اور احساس سے عاری ہے، صحیح نہ ہوگا۔ شاعری اور ادب کے عناصر ترکیبی میں خیال یا فکر پر جذبے، احساس اور تخیل کو اولیت حاصل ہے۔ صناعی بھی شاعری کی ایک لازمی شرط ہے اس لیے کسی اچھے شاعر سے بحث کرتے ہوئے ہم یہ مان کر چلتے ہیں کہ اس کی اچھائی اور بُرائی کا دار و مدار ان لازمی اجزائے ترکیبی کے متناسب امتزاج ہی پر ہے۔ غالبؔ کے یہاں جذبہ اور احساس بھی ہے اور صناعی بھی۔ غالبؔ کی فکر پر زور دینے کا مقصد دوسرے شاعروں کے مقابلے میں اُن کی انفرادیت کی نشاندہی کرنا ہے، جذبے احساس اور صناعی کی نفی کرنا نہیں۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ غالب کی شاعری ذہن کی شاعری ہے تو ہمارا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اُن کے یہاں وہ ذہنی توانائی اور فکری شان ملتی ہے جو اُن کے علاوہ دوسروں کو کم میسر آئی۔ اسی طرح جب ہم یہ کہیں کہ میرؔ کی شاعری جذبے کی شاعری ہے تو اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ اُن کے یہاں سوچنے والے ذہن کی کارفرمائی نہیں۔ میرؔ کے یہاں ایسے فکر انگیز اشعار قابلِ لحاظ تعداد میں نکالے جا سکتے ہیں جو غالب کے منتخب فکری اشعار کے پہلو بہ پہلو رکھ دیے جائیں تو میرؔ کا پلہ ہلکا نہ ہوگا۔ اس کے باوجود میرؔ کی شاعری کا غالب عنصر جذبہ ہے اور جذبے پر زور دے کر ہم میرؔ کی انفرادیت کا تعین کرنے میں مدد لیتے ہیں۔ اسی نقطۂ نظر سے غالبؔ کے یہاں جذبے کے ایسے چمکتے ہوئے نشتر ڈھونڈنا مشکل نہیں جو اردو کے اس قبیل کے بہترین اشعار کے ہم پایہ ہوں، پھر بھی غالب کی انفرادیت ان کے فکری اشعار سے جتنی نمایاں ہوتی ہے، ان اشعار سے نہیں ہوتی۔ میرؔ اور غالبؔ کے اس فرق کو اس طرح بھی بیان کیا جا سکتا ہے کہ میرؔ کے یہاں فکر بھی جذبہ بن جاتی ہے اور غالبؔ کے یہاں جذبے میں بھی فکر کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں۔

ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کا یہ بیان کہ "شاعری میں فکر نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی بلکہ گہرا اور

قطعی جذبہ ہی فکر کا روپ دھار لیتا ہے" ایک حد تک صحیح ہے۔ شاعری اور فلسفے میں بنیادی فرق یہی ہے کہ فلسفہ عقل کی پیداوار ہے اور شاعری جذبے کا نتیجہ۔ بڑا شاعر یا دوسرے الفاظ میں مفکر شاعر جذبے اور فکر کی دوئی کو مٹا دیتا ہے اُس کے یہاں جذبہ فکر اور فکر جذبہ بن جاتا ہے۔ میر اور غالب دونوں کے یہاں فکر ہے مگر میر کی فکر کا سرچشمہ جذبہ ہے اور غالب کی فکر جذبے سے ماورا ایک غیر جذباتی سطح سے پھوٹتی ہے۔ اس لیے غالب فلسفی نہ ہونے کے باوجود شاعری میں فلسفیانہ ذہن کے نمائندے بن جاتے ہیں اسی کے ساتھ اگر ہم جذبے اور احساس کے اس فرق کو بھی تسلیم کر لیں کہ ایک محدود مفہوم میں جذبے کا رُخ داخل کی طرف ہوتا ہے اور احساس کا خارجی دُنیا کی طرف تو ہم دیکھیں گے کہ غالب کا طرزِ احساس میر کے مقابلے میں خارج کی حقیقتوں، رنگوں اور خوشبوؤں کو اپنے اندر سمیٹنے کی زیادہ صلاحیت رکھتا ہے اور میر کا طرزِ احساس جذبے کے زیرِ اثر ہونے کی وجہ سے خارج کے مطابق رنگوں اور خوشبوؤں کا ہوا اثر قبول کرتا ہے وہ محض گزراں اور گریزاں ہے۔ یہ کہنا تو نفسیاتی حقیقت کے خلاف ہوگا کہ جذبہ موضوعی ہوتا ہے اور احساس معروضی۔ کیونکہ جذبہ اور احساس دونوں اپنی اصل داخلی حالتوں کے نام ہیں۔ دونوں کے محرکات خارج میں ہوتے ہیں، فرق یہ ہے کہ احساس جذبے کے بعد کی کیفیت ہے جس میں جذبے کی تشنگی کے راستوں اور تشنگی کے معروضات کا علم بھی ایک حد تک شامل ہوتا ہے۔ جذبے کی سطح پر عقل اور ادراک کا عمل بہت کمزور بلکہ ایک حد تک معدوم ہو جاتا ہے۔ احساس کی سطح پر عقل اور ادراک پھر بیدار ہونے لگتے ہیں اس لیے غالب کی شاعری جذبے سے زیادہ احساس کی شاعری ہے، اس سطح کی شاعری جہاں عقل اور ادراک از سر نو بروئے کار آتے ہیں، اسی لیے غالب کے یہاں جذبہ، شعور اور ادراک کے تابع نظر آتا ہے۔ شاعری میں فکر استدلالی نہیں بلکہ محسوسی فکر ہوتی ہے۔ غالب کے یہاں احساس اور فکر دونوں شانہ بہ شانہ چلتے ہیں اور یہی چیز انھیں اپنے پیشرووں سے ممتاز کرتی ہے۔

غالب کی فکر کا جائزہ لینے کے معنی یہ ہیں کہ ان کے حواس (جو ادراک کا ذریعہ ہیں) کی بیداری، شعور اور بصیرت کے ساتھ اُن کے مخصوص طرزِ احساس کا بھی تجزیہ کیا جائے۔ شاعری میں مجرد فکر یا فلسفہ و سائنس کی استدلالی عقل، جسے اقبال کے الفاظ میں حضور کی دولت نصیب نہیں، کوئی مقام نہیں رکھتی۔ شاعری میں وجدان بھی، جو حواسِ خمسہ کے علاوہ ایک اور ذریعۂ

علم ہے، اہمیت رکھتا ہے۔ دیکھنا یہ ہوگا کہ غالب وجدان کی سطح پر بھی کس حد تک عقل کے ہم نوا ہیں اور کس حد تک مخالفِ عقلیت (ANTI-INTELLECTUAL) رجحانات کی نمائندگی کرتے ہیں۔ غالب کی فکر میں عقلی میلانات کے ساتھ ہر تخلیقی فنکار کی طرح ایسے مخالفِ عقل رویے بھی ملتے ہیں جو بیسویں صدی کے بعض جدید مکاتیبِ فلسفہ سے انھیں قریب کر رہے ہیں۔ غالب کے اس خلافِ عقلیت رجحان کا سب سے بڑا باعث ان کا متصوفانہ میلان ہے جو آج کی فلسفیانہ اصطلاح میں وجودی تجربے (EXISTENTIAL EXPERIENCE) کے مترادف قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں غالب کا وحدت الوجودی تصورِ حیات و کائنات بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اسی لیے میں سمجھتا ہوں کہ غالب کے فکری سرچشموں میں بنیادی حیثیت ان کے متصوفانہ طرزِ فکر و احساس کو حاصل ہے۔ تصوّف کے متعلق اُن کے مخصوص رویّوں کو سمجھے بغیر غالب کی فکر کا تجزیہ ممکن نہیں۔ غالب کی عقلیت اور تصوّف میں ایک اندرونی ربط ہے اسی ربط کی وجہ سے اُن کے یہاں عقل و وجدان، یا عقل و خلافِ عقل (REASON AND UN REASON) اور عقلی اور غیر عقلی RATIONAL AND IRRATIONAL کا تضاد اور دوئی DI CHOTOMY' ایک نامیاتی کل کے دو لاینفک اجزا بن کر تحلیل ہو جاتی ہے۔ یہ دو الگ رنگ نہیں رہتے، ایک ہی روشن انعکاس کے دو ایسے آئینے بن جاتے ہیں جو روبرو رکھے ہوں۔

غالب پر ابتدائے عمر میں جو اثرات مرتب ہوئے اُن میں بیدل کے علاوہ نظیری، ظہوری، عرفی، فیضی اور پھر صائب، غنی، ناصر علی، شوکت، جلال اسیر کا فنی رویہ نمایاں ہے۔ اردو شعرا میں وہ میر کی استادی کے قایل ہیں، ناسخ نے بھی شاید انھیں اپنی مشکل پسندی کی وجہ سے بہت عارضی طور پر اپنی طرف متوجہ کیا ہے۔ انیس کے میدان مرثیہ گوئی کو انھوں نے چند قدم چلنے کے بعد یہ سوچ کر چھوڑ دیا کہ

بھلا تردّد بے جا سے اس میں کیا حاصل اٹھا چکے ہیں زمیندار جن زمینوں کو

قصیدے میں وہ سوداؔ اور ذوقؔ کے قدم بقدم چلے۔ مثنویات (فارسی) میں انھوں نے اپنے لیے اردو کی روایت سے ہٹ کر راہ نکالی "ابر گہربار" اور اس کا شاہکار حصّہ "مغنّی نامہ"

ان کے اجتہادِ فن فکر کے شاندار کارنامے ہیں اردو میں مثنوی کی روایت میرؔ سے ہوتی ہوئی میرحسنؔ تک پہنچی تھی، یہ روایت عشقیہ شاعری کی تھی۔ غالبؔ نے مثنوی کو فکر کی گہرائی سے آشنا کیا اور عشق کے متصوفانہ تصورات سے آگے بڑھ کر عقل و خرد کی قصیدہ خوانی کی۔ ان اصناف سے قطع نظر غالبؔ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ غزل ایسی محدود و تنگنائے کو اپنے شوق کے بقدر وسعت دی اور اُسے جذبے کے ساتھ ذہن کی زبان میں بات کرنے پر بھی قادر کر دیا۔

اُردو کے جس شاعر پر عام طور سے، غالبؔ کے سلسلے کا سراغ لگانے میں، نظر نہیں رُکتی، وہ خواجہ میر دردؔ ہیں۔ حالانکہ اگر دردؔ اور غالبؔ کی ہم طرح غزلوں اور تراکیب و الفاظ کا بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ غالبؔ نے دردؔ سے گہرا اثر قبول کیا تھا اس کا سبب یہ ہے کہ اردو کے قدیم شعرا میں دردؔ بھی اکیلے شاعر ہیں جنھوں نے غزل سے ایک مشکل اور منضبط نظامِ تصوّف کی ترجمانی کا کام لینا چاہا تھا۔ اُن کی زبان میں بھی فکر کا بوجھ سہارنے کی قوت تھی۔ غالبؔ جو غزل کی زبان سے ذہن کی ترجمانی کا کام بھی لینا چاہتے تھے، دردؔ سے غیر متاثر نہیں رہ سکتے تھے۔ دردؔ کے اشعار میں ایسے مابعد الطبعیاتی مسایل بھی شعر کے قالب میں نظر آتے ہیں جنھیں دردؔ سے پہلے بھی اور بعد بھی غزل کی زبان کا جامہ نہ پہنایا گیا تھا۔ دردؔ صوفی تھے، لیکن اُن کی شاعری کا حقیقی رنگ عشقیہ شاعری میں نمایاں ہوتا ہے۔ اُن کے متصوفانہ یا فلسفیانہ اشعار فنّی لحاظ سے کمزور ہیں اور تغزل کی کیفیت سے بڑی حد تک عاری۔ اس کے باوجود دردؔ کی یہ کوشش اپنی جگہ اہم تھی اور بعد میں اس کے راستے پر چلنے والوں کے لیے نقشِ قدم کی طرح رہنمائی کرنے کے لیے کافی تھی۔ غالبؔ نے درد کے اِس تجربے سے پورا فائدہ اٹھایا۔ تفصیلات کو بعد کے لیے چھوڑ کر اس جگہ میں اتنے اشارے پر اکتفا کروں گا۔

فارسی کے شاعروں میں ذہنی لحاظ سے غالبؔ پر دو شعرا کا اثر واضح ہے۔ ایک بیدلؔ جن کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے غالبؔ ایسے بُت شکن کی زبان نہیں تھکتی، دوسرے فیضیؔ، حالانکہ فیضیؔ کا ذکر غالبؔ نے شاید ہی ایک دو مقامات پر کیا ہو۔ لیکن غالبؔ کے یہاں روشن خیالی، وسیع النظری اور وسعتِ مشرب کے ساتھ تشکیک اور کفر کو ایمان بنانے کا حوصلہ رکھنے والی خصوصیات فیضیؔ کے ذہن کا پرتو معلوم ہوتی ہیں۔ فیضیؔ کا براہِ راست نہ سہی، پھر بھی

غالبؔ کا اِن خصوصیات میں اگر کوئی اور شریک ہے تو وہ فیضیؔ ہی ہیں شیخ اکرام نے توفیضیؔ کا ذکر کیا ہے مگر غالبؔ کے کسی اور نقاد یا شارح نے فیضیؔ اور غالبؔ میں جو مشترک اقدار ہیں اُن کی طرف سرسری توجہ بھی نہیں کی۔

غالبؔ پر دوسرے شعرا کے اثرات کا کھوج لگانے کے معنی یہ نہیں کہ غالبؔ کی فکر ان سے مستعار ہے۔ غالبؔ نے بہت سے لکھے ذہن، اور سوچنے والے انسان کی طرح اپنے علمی، تہذیبی اور شعری ورثے سے استفادہ کیا ہے۔ اُن کے چراغ میں کئی چراغوں کی لویں محفوظ ہیں۔ مگر اس چراغ کی روشنی کا حقیقی مصدر غالبؔ کا اپنا ذہن ہے، جو اپنے تمام پیشرووں سے زیادہ وسیع، دُور بیں اور کشادہ تھا۔ بیدلؔ، فیضیؔ، میرؔ، دردؔ سب اپنے زمانے اور حالات کے حصار میں محصور ہے جب کہ غالبؔ نے زماں اور مکاں کی حدود کو توڑ کر آفاقیت کی حدود کو چھو لیا۔ غالبؔ کا تصورِ حیات و کائنات آئندہ زمانوں کی پیش بینی میں اپنے تمام ماخذوں سے زیادہ لچکدار اور وسیع تھا۔ اسی لیے ان کے پیشرو، جن سے خود غالبؔ نے اثر قبول کیا، قدیم کی حدوں میں ہی رہے مگر غالبؔ نے جدید کی دہلیز تک پہنچے اور آئندہ امکانات کی آہٹوں کو سننے میں کامیابی حاصل کی۔

غالبؔ کی فکر کے جن اجزا کو میں اہمیت دیتا ہوں اُن کی ترتیب یہ ہوگی:

۱۔ غالب کی متصوفانہ فکر ۲۔ غالبؔ کی عقلیت اور تشکیک

۳۔ غالبؔ کا تصورِ حیات، جس میں اُن کی لذت کوشی اور حقیقت پسندی REALISM کو مرکزی حیثیت حاصل ہے اور اس کے نتیجے کے طور پر

۴۔ غالبؔ کے یہاں جدید ذہن کی پیش بینی کی صلاحیت

ان اجزا کو سمجھنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ہر عنوان کے تحت اُن فکری سرچشموں کا بھی سُراغ لگایا جائے جن کے اثر سے غالبؔ کے مخصوص ذہنی روّیوں کی تشکیل و تعمیر ہوئی ہے اِس ذیل میں علمی اور تہذیبی ورثے کو بھی بنیاد بنانا مناسب ہے، مختلف پیشرو شعرا کے اثرات کا ذکر بھی اس ذیل میں کیا جا سکتا ہے۔

اِس فکری جائزے کے اپنے حدود ہیں، اس لیے میں غالبؔ کے فنی کمالات

کا ذکر محض ضمنی طور پر کروں گا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہ لینا چاہیے کہ کسی شاعر کے یہاں فن اور فکر کو دو الگ الگ خانوں میں تقسیم کرکے سمجھا جا سکتا ہے۔ فن اور فکر دونوں ایک دوسرے سے وہی مناسبت رکھتے ہیں جو مادّے اور صورت (CONTENT AND FORM) درمیان میں مادّے کا تصوّر بغیر صورت کے اور صورت کا وجود بغیر مادے کے ممکن ہی نہیں۔ ہم ان میں سے ہر ایک کو دوسرے کی وساطت سے بھی دیکھتے اور سمجھتے ہیں۔ مجھے اپنے موضوع کے حدود کو ملحوظ رکھنے کے لیے کئی پہلوؤں کو نظرانداز کرنا پڑا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ کسی شاعر کی فکر کی اہمیت محض اس لیے ہوتی ہے کہ وہ اول و آخر شاعر ہے۔ اس لیے شاعر کی فکری عظمت کا سب سے بڑا راز اس کی فنکارانہ خلاقی میں مضمر ہے۔ جو اہم تصورات اور مسایل نثر کی سیدھی سادی استدلالی زبان میں عامۃ الورود معلوم ہوتی ہیں فن کی کسوٹی پر کس کر، جذبے کی آگ میں تپ کر، اور شاعر کے خوابوں کا رنگ پاکر پیمبرانہ بصیرت کی حامل بن جاتی ہیں۔ غالب کا کمال یہی ہے کہ انھوں نے اپنی بصارت کو بصیرت اور اپنی لذت کوشی کو ابدی مسرت کا خزینہ بنا دیا۔ وہ ہمارے لیے بھی اتنے ہی اہم ہیں، جتنے اپنے زمانے کے لیے تھے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ وہ اپنے زمانے کے لیے ہی نہیں ہمارے زمانے کے لیے تھے۔ اسی لیے اُن کی فکر جو "گرمیِ نشاطِ تصوّر" کا نغمہ ہے ان کی زندگی تک نا آفریدہ زمانوں کے لیے زیادہ کشش رکھتی ہے۔ غالب شناسی کا حقیقی کام بیسویں صدی میں ہوا ہے اور غالب کو پہچاننے میں اُن نئے معیاروں اور اقدار نے مدد دی ہے جو غالب کے لیے نا آفریدہ تھے اور ہمارے لیے عہد آفریں ہیں۔

غالب کی شاعری میں اُن کی فکر کو بنیادی اہمیت دینے کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ یہی خصوصیت انھیں اردو اور فارسی کے دوسرے شعرا سے ممتاز کرتی ہے۔ جہاں تک فنی دروبست کا سوال ہے میر، سودا، میر حسن، انیس ہی نہیں، بلکہ آتش، ناسخ، مصحفی اور انشا بھی فن کے قواعد کا علم غالب کے برابر ہی رکھتے تھے اور انھیں برتنے میں بھی قادر تھے۔ جہاں تک زبان کے صرف کا سوال ہے غالب کی زبان آج بھی اُن سے کم درجے کے شعرا آتش، ناسخ، ذوق، مومن ہی نہیں بلکہ داغ اور امیر مینائی کے مقابلے میں سند کے طور پر پیش نہیں کی جا سکتی۔ غالب کے یہاں زبان کے مقام ہی نہیں بلکہ ایسے اشکال

بھی ہیں جو شعر کو چیستاں بنا دیتے ہیں اور ابتدائی دور کے بعض اشعار پر تو اہمال کا بھی گمان گزرتا ہے۔ اس کے باوجود غالب ان سب سے اہم ہیں، اور اس کا راز یہی ہے کہ اُن کی فکر ان تمام شعرا سے زیادہ بسیط، وسیع اور گہری تھی۔ غالب کے یہاں زبان کا وہ جامد تصور نہیں ملتا جو شاعری کو محض لفظی شعبدہ بازی اور قافیہ پیمائی بنا دیتی ہے۔ غالب کی زبان کو روایت پرست زباں داں سند نہ مانیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ غالب نے اُردو شاعری کو جو زبان دی وہ اپنی دشواریوں کے باوجود، اردو شاعری کی نئی سمتوں میں توسیع کرنے کی، دوسرے شاعروں کی زبان سے زیادہ صلاحیت رکھتی تھی۔ اس میں بوجھ اٹھانے کی وہ توانائی تھی کہ اقبال ایسے فلسفی کو بھی غالب سے زبان مستعار مانگنی پڑی۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اُردو شاعرانہ خصوصیات میں تو غالب کے شریک مل جائیں گے مگر فکر کی حد تک غالب آج بھی اُردو شاعری میں شریکِ غالب ہی نظر آتے ہیں۔ غالب کو اس معاملے میں اقبال پر بھی اس لحاظ سے فوقیت حاصل ہے کہ غالب کا ذہن نابستہ NON-CONFIRMIST، اور اقبال کا بستہ (CONFIRMIST) غالب کی یہ خصوصیات انھیں ہمارے زمانے کے لیے اقبال کے مقابلے میں بھی زیادہ قابلِ قبول بنا دیتی ہے۔ اقبال کی شاعری اور فکر کا بڑا حصہ آج رد کیا جا سکتا ہے اس لیے کہ اُن کے تصورات ایک مخصوص و محدود نظامِ فلسفہ کے پابند ہو گئے تھے۔ مگر غالب آج بھی کُل کے کُل قابلِ قبول ہیں۔ غالب قدما میں آخری قدیم ہیں اور جدیدوں میں پہلے جدید۔ اِس لیے اُن کی فکر کا مطالعہ کیے بغیر نہ تو قدیم کا عرفان ممکن ہو سکتا ہے نہ جدید کو سمجھا جا سکتا ہے۔ وہ جدید اور قدیم کو ملانے والی ایسی کڑی ہیں جو قدیم اور جدید کے صحت مند رشتے کو سمجھاتے ہیں اور جدید کے لیے قدیم سے انحراف کے علاوہ حدود متعین کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ غالب کو اپنی اِس حیثیت کا احساس تھا اس لیے انھوں نے جو دعویٰ کیا تھا اُس کی صداقت آج ہم پر روشن ہو رہی ہے ؎

گر شعر و سخن بدہر آئیں بودے
دیوان مرا شہرت پرویں بودے

غالب اگر ایں فنِ سخن دیں بودے
آں دین را ایزدی کتاب ایں بودے

اردو شاعری اور ہندوستانی تہذیب کے نشاۃ الثانیہ پر اگر ایمان لانا ہے تو غالب کا دیوان ہی اِس کا سچا وسیلہ ہو سکتا ہے۔ اُن ہی کی فکر نے حالی اور سرسید کی مقصدی تحریک، اقبال کے فنی اجتہاد، ترقی پسند تحریک کی بغاوت اور جدید ادب کی انحراف پسندی کو یہ نکتہ سمجھایا اور ہر نئے تجربے کے لیے جواز فراہم کیا ؎

با من میاویز اے پدر ، فرزندِ آزر را نگر
آں کس کہ شد صاحب نظر دینِ بزرگاں خوش نہ کرد

محمد مشتاق تجاروی

بدرالدین علی خاں ـــــ مُہر کَن

بدرالدین علی خاں مُہر کَن عہد غالب کے ان اصحاب میں ہیں جنھیں کافی شہرت حاصل ہوئی مُہر کَنی کے ساتھ خطاطی میں بھی وہ کافی دسترس رکھتے تھے۔ وہ چھ قسم کے خط لکھنے پر قادر تھے۔ ان میں بھی نستعلیق کی شان سب سے بلند تھی،(۱) نسخ بہت خوبصورت لکھا کرتے تھے۔(۲) لیکن ان کا اصل میدان مہر کنی تھا جس میں انھیں یدطولیٰ حاصل تھا۔ ان کی شہرت ان کی مہر کنی ہی کی بنا پر ہے۔ شہنشاہِ ہند، ملکہ انگلستان اور نواب گورنر جنرل بہادر کی مہر وہی بنایا کرتے تھے۔ لیکن اس غیر معمولی شہرت اور عظمت کے باوجود ان کے حالات زندگی تفصیل کے ساتھ نہیں ملتے جگہ جگہ مختصر اشارے ملتے ہیں۔ ذیل کے صفحات میں انہی جستہ جستہ عبارات اور ان کے خاندان کے افراد سے حاصل کی گئی معلومات کو مرتب انداز میں یکجا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

بدرالدین علی خاں دہلی کے باشندے تھے۔ نسلاً پٹھان تھے۔ خاندان کے سلسلہ میں مزید تفصیلات دستیاب نہیں ہیں۔ آبائی اقامت گاہ دریبہ کلاں دہلی میں تھی۔ دریبہ کلاں میں سورج والی مسجد کے پاس ایک پیاؤ تھی اسی پیاؤ کے مخالف سمت میں ان کا آبائی مکان تھا۔ گلاب گندھی (عہد مغلیہ کے مشہور عطر فروش گلاب سنگھ جن کے احفاد کی عطریات کی دکان ہنوز چاندنی چوک میں موجود ہے) ان کے پڑوسی تھے۔ بلکہ دونوں کے مکان کی دیوار بھی ایک ہی تھی، سال ولادت

معلوم نہیں۔ البتہ آثار خواجہ حسن ثانی نظامی کے حاشیہ پر یہ عبارت درج ہے۔
"افسوس بدر الدین پنج سالگی بتاریخ ۱۹ ذی قعدہ ۱۲۹۳ھ / مطابق ۸ دسمبر ۱۸۷۵ء بروز شنبہ
بعارضہ فالج فوت شد" (۳) (افسوس کہ ۷۵ سال کی عمر میں ۱۹ ذو قعدہ ۱۲۹۳ھ مطابق ۱۸۷۵ء
بروز شنبہ فالج کے مرض میں وفات پائی) اس کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کا سال ولادت
۱۸۰۰ء کے قریب رہا ہوگا۔

بدر الدین علی خاں کی ابتدائی تعلیم و تربیت ان کے نانا محمد یار خاں کے زیر نگرانی ہوئی۔
کرسی بندی اور مہر کنی انھوں نے اپنے نانا ہی سے سیکھی۔ (۴) اس کے بعد اپنے گھر پر ہی مہر کنی کا
کام شروع کر دیا۔ (۵) خطاطی کی تکمیل سید امیر رضوی المعروف بہ میر پنجہ کش سے کی

بدر الدین علی خاں نے اپنے فن مہر کنی اور خطاطی کو بام عروج پر پہنچانے کے لیے جہاں
بہت زیادہ محنت اور مشق کی۔ قدیم خوشنویسوں کے خاص نمونہ ہائے تحریر اور ان کی لکھی ہوئی
وصلیاں جمع کیں۔ خاص طور پر آقا عبد الرشید دیلمی کی وصلیاں جمع کیں۔ اور ان کو سامنے رکھ کر اپنی
مشق کو بام عروج پر پہنچایا اگرچہ اس شوق پر ان کو خطیر رقم صرف کرنا پڑی تھی (۶)، تاہم اس ذریعے
ان کو اپنے فن میں غیر معمولی مہارت اور عالمگیر شہرت حاصل ہوئی۔ ان کے فن کا اعتراف معاصرین
اور بعد کے تذکرہ نویسوں اور فن کاروں نے کھلے دل سے کیا ہے۔ غلام علی ہفت قلمی جو سید
محمد امیر رضوی کے بھی استاد تھے۔ ان کے فن کے بڑے معترف تھے۔ غلام علی نے سید امیر رضوی کے
شاگردوں میں ان کا تذکرہ سب سے زیادہ تفصیل سے کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

"در علم مہر کنی و حکاکی بے نظیر و بے عدیل و در عقل معاش یگانہ و مہر کنی در خط نستعلیق
و نسخ و شاہ شتری و انگریزی وغیرہ بآئین شائستہ بجلوہ ظہور می آرد۔ آں قدر
قوت درست و دقت طبع در ایجاد و تراکیب و اسلوب و کرسی بندی دارد کہ
عقل ہم پیش کار ایں فن بداں نیر سعد بلکہ بدیدن حسن اختراع و ابداع و ایجاد
و احداث دیدۂ حاسداں حیراں می ماند۔ ایں ہم لطف خداداد است" (۸)

(ترجمہ) مہر کنی اور حکاکی کے فن میں بے نظیر و بے مثال اور عقل معاش میں یگانہ،
فارسی، عربی، ہندی اور انگریزی میں بہترین مہر کندہ کیا کرتے ہیں۔ ہاتھ میں اتنی چابکدستی اور

ترکیب، اسلوب وکرسی بندی میں ایسی ذہنی اختراع وابداع وایجاد کا مادہ ہے کہ عقل کی رسائی وہاں تک نہیں پہنچ سکتی، ان کی ابداع وایجاد واختراع کی صلاحیتوں کو دیکھ کر حاسد حیران رہ جاتے ہیں۔ اور یہ ایک خداداد صلاحیت ہے)

سرسید احمد خاں آثار الصنادید میں لکھتے ہیں،

"مہر کنی کے فن میں تمام ہندوستان میں اس سرگروہ اہل کمال کا نظیر نہیں۔ ہر حکام وقت کی علی الخصوص نواب گورنر جنرل بہادر کی اسس یگانۂ روزگار کے ہاتھ سے کھدا کرتی ہے۔ جو دائرہ اس کے قلم سے نکلتا ہے۔ ہزار حرف اس کی یگانگی پر اپنے ذہن سے ادا کرتا ہے۔" (۹)

مرزا غالب ایک خط میں لکھتے ہیں؛

"آج شہر میں بدرالدین علی خاں کا نظیر نہیں پس مہر اور کون کھودے گا؟" (۱۰)

ایک فارسی خط بنام منشی ہرگوپال تفتہ جو ۲۳ اکتوبر ۱۸۴۸ء کو لکھا گیا تھا۔ اس میں لکھتے ہیں؛

"پس از بزد وحش پدید آمد کہ قریب صد کس از ہوسناکان دہلی نگین فرستادہ و در کشمیر کندانند ندو ہمہ شرمسار و پشیماں شدہ اند حالیا آں سعادت نشان را باید کہ درد سرنہ کشند و مہر دیگر بکندن نہ دہند امروز دریں فن نظیر بدرالدین یگیتی نیست چوں او بد نوشت پندارم کہ شومی سرنوشت من است۔" (۱۱)

ترجمہ (تحقیق کرنے سے پتہ چلا ہے کہ دہلی کے تقریباً سو شوقین آدمیوں نے کشمیر نگینے بھیج کر مہر کندہ کروائی تھی، لیکن وہ سب بھی شرمندہ اور پشیمان ہیں۔ اسس وقت اس نیک بخت کو چاہیے کہ درد سری مول نہ لے اور دوسری مہر کھدوانے کو نہ دے۔ آج اس فن میں بدرالدین (بدرالدین علی خاں) کی مثال پوری دنیا میں نہیں ہے۔ جب اسس نے برا لکھا تو میں سمجھوں گا کہ میرے نوشتہ کی خرابی ہے)

بدرالدین علی خاں کا تذکرہ کتابوں میں بہت کم ملتا ہے۔ جہاں ملتا بھی ہے وہاں ان کی مہر کنی اور حکاکی کی غیر معمولی صلاحیتوں کا تذکرہ ہے اسس کی شخصیت پر برائے نام گفتگو کی گئی ہے۔ البتہ مرزا قادر بخش صابر دہلوی نے اپنے تذکرۂ گلستان سخن میں ان کی مہر کنی کی مہارت کے

ساتھ ساتھ ان کی شخصیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"رنگ آمیز نگارستان ہنر، جلائے صافی گوہر رنگ بہارستان مکارم ذات آب گوہر، محاسن صفات، زبدۂ انام، اسوۂ عظام، والا دودمان بدرالدین علی خاں کہ شرق تا غرب اس کی صیت یکتائی نے اس طرح مملو کیا ہے جیسے عالم کو ہوا نے۔ اور زمین تا آسمان آطنزۂ کمال نے ایسا بے سپہر کیا ہے جیسے فضا کو نگاہ تیز پا نے پائے دولت کرسی نشیں آسمان اور فرق عبودیت وقف آستاں، گفتار و کردار اور تہذیب و اخلاق کا باپ، اوضاع و اطوار لطف و مروت کی کتاب۔ مشغلہ اوقات دل ہائے خراب کی مرمت اور سرائے عقبیٰ کی معموری، مصرف توجہ حضرت واجب سے تحصیل قرب اور ماسوا سے تلاش دوری، ہر چند اکثر فنون میں علم یکتائی اور پایہ کمال ارجمند ہے۔ لیکن صنعت حکاکی میں ان کو نظر اول ہی ایک جانتی ہے اور اس تلاش دوئی پر ان کو یگانہ پہچانتی ہے، اس کی زبان قلم کے فیض سے اصاغر و اداانی کا نام اسم اعظم کے برابر اور ہر نگین خاتم سلیماں سے ہم سر۔" (۱۳)

بدرالدین علی خاں کے مرزا غالب سے بہت قریبی تعلقات تھے، مرزا نے اپنے خطوط میں متعدد جگہ ان کا ذکر کیا ہے۔ وہ اپنے احباب کی مہریں انھیں سے کھدوایا کرتے تھے۔ غالب کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ نواب اقبال الدولہ شفق کی مہر انھوں نے ان سے کھدوائی اسی طرح انھوں نے منشی شیونارائن آرام کے لیے عقیق پر ایک مہر انھی سے کندہ کروا کر انھیں بھیجی تھی"

میر سرفراز حسین کو ایک خط میں لکھتے ہیں کہ میں بدرالدین علی خاں سے تمہارے لیے ایک مہر کھدوا دوں گا۔ (۱۴) مرزا نے اور بھی متعدد مقامات پر بدرالدین علی خاں کا ذکر کیا ہے۔ اور ان کے فن کی تعریف کی ہے۔ مرزا کے خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بدرالدین علی خاں کو تحریری دعوت مہریں کھدوانے کے سلسلہ میں بھیجتے رہا کرتے تھے (۱۵)، لیکن افسوس کہ اس طرح کا کوئی رقعہ محفوظ نہیں ہے۔ غالب اور بدرالدین علی خاں دونوں ایک ہی علاقہ میں دہلی میں سکونت پذیر تھے۔ اس لیے ملاقات کا سلسلہ بھی یقینی طور پر رہتا ہوگا۔

بدرالدین علی خاں کی رسائی دربار سلطنت اور کمپنی بہادر کے اعلیٰ حکام تک تھی اپنی مہرکنی کی وجہ سے وہ خلعت پارچہ جات سے بھی سرفراز ہوئے۔ چنانچہ ۱۹ دسمبر ۱۸۴۵ء کو انھوں نے زمرد کا ایک نگینہ جس پر نواب گورنر جنرل بہادر کا نام کھدا ہوا تھا انھیں نذر کیا۔ جس کے صلے میں انھیں خلعت پنج پارچہ عطا کیا گیا۔ (۴۱)

شہنشاہ ہند بہادر شاہ ظفر اور نواب گورنر جنرل بہادر کو اپنی مہر کھدوانی ہوتی تو وہ بھی بدرالدین علی خاں ہی سے کھدوائی جاتی تھی۔ بہادر شاہ ظفر کے روزنامچے میں یہ عبارت ملتی ہیں۔

"۱۴ اگست ۱۸۴۶ء کو نواب گورنر جنرل کی چھٹی چھٹی کے بموجب صاحب کلاں بہادر نے ان کو طلب فرما کر حکم دیا کہ نواب گورنر جنرل کے نام کی ایک مہر بنادو اور ملکہ انگلستان جو نیا خطاب فتح لاہور کے وقت مرحمت فرمایا ہے وہ بھی مہر میں درج ہونا ضروری ہے۔" (۴۲)

بدرالدین علی خاں نے ملکہ انگلستان اور ملکہ کے شوہر شہزادہ البرٹ کے نام کی مہر بھی بنائی تھی۔ ۹ دسمبر ۱۸۵۰ کے اسعد الاخبار آگرہ میں صادق الاخبار کے حوالے سے یہ خبر چھپی تھی۔

"ان دنوں بدرالدین علی خاں مہر کن نے جو اس فن میں وحید العصر ہیں بموجب فرمائش ملکہ معظم انگلستان وایمائے جناب صاحب ایجنٹ دہلی کے دو مہر کندہ کی ہیں۔ ایک تو ملکہ معظم انگلستان کے نام کی۔ دوسری شہزادہ البرٹ شوہر ملکہ معظم کے نام کی۔ ملکہ معظم کی مہر میں یہ عبارت ہے۔

"شہنشاہ سلیمان جاہ۔ کیوان بارگاہ، خاقان الدھر، سلطان البحر مورد الطاف ایزد رحمان، بادشاہ انگلستان وایرلنڈ فرمانفرمائے ملک ہند، ناصر دین مسیحا ملکہ معظمہ وکٹوریہ۔"

اور شہزادہ موصوف کی مہر میں یہ عبارت نقش تھی:

"المویدبتائید الٰہی، فخر خاندان شہنشاہ برنسوک، انیس معزز ملکہ معظمہ رفیع القدر والا شان، سرآمد بارگاہ انگلستان، البرٹ فرانسس اگسٹس

چارلس ایلان ول: (۱۸)

بدرالدین علی خاں نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں بھی حصہ لیا تھا۔ اس دوران وہ مسلسل دربار شہنشاہی میں حاضری دیتے اور انگریزوں کے خلاف منصوبہ بنانے میں شریک رہتے تھے۔ (۱۹) ۱۳ اگست ۱۸۵۷ء مطابق ۱۱ ذوالحجہ ۱۲۷۳ھ میں جب مولوی احمد علی نے ناہر سنگھ راجہ بلب گڑھ کی جانب سے نذر پیش کی۔ ناہر سنگھ کی عرضی سے یہ امر ظاہر ہوا کہ اس نے اپنے چچا زاد بھائی نول سنگھ کو نامزد کرکے دہلی بھیجا ہے تو بدرالدین علی خاں نے ایک نگینہ جس پر آیت "نصر من اللہ وفتح قریب" کندہ تھی ان کو نذر کیا۔ (۲۰)

۷ اگست ۱۸۵۷ء کو بہادر شاہ ظفر نے بدرالدین علی خاں کو یہ خط لکھ کر بھیجا تھا:

"نہیں بہترین مہر تیار کرکے ہمارے حضور میں پیش کرنے کی تاکید کی جاتی ہے جس میں مشیر سلطنت وقار الملک ابدولت کے خادم محمد بخت خاں لارڈ گورنر بہادر ناظم جملہ معاملات ملکی و فوجی کا نام مع القاب کے کندہ کیا جائے اور موافق دستور مہر میں سال جلوس ۲۱ بھی درج ہوگا۔" (۲۱)

بہادر شاہ ظفر کے خلاف جو فرد جرم عائد کی گئی تھی۔ اس میں یہ خط بھی پیش کیا گیا تھا۔ (۲۲)

سعی انقلاب سنہ ستاون کی ناکامی کے بعد گرفتاریوں کا سلسلہ شروع ہوا تو بدرالدین علی خاں اور مرزا غالب دونوں کو ایک ساتھ گرفتار کیا گیا۔ کرنل برن مرزا غالب سے واقف تھا۔ اس لیے اس نے انھیں رہا کردیا۔ بدرالدین علی خاں نے گورنر جنرل اور ملکہ معظمہ کی عطا کردہ اسناد پیش کیں تو انھیں بھی چھوڑ دیا گیا، نیز انھیں اپنے گھر میں رہنے کی بھی اجازت مل گئی (۲۳)، جہاں انھوں نے زندگی کے بقیہ ایام گوشہ نشینی اور عزلت پسندی میں گزار دیے۔

بدرالدین علی خاں کو اپنی زندگی میں خاصا عروج حاصل ہوا۔ ایک فنکار جس مقام و مرتبہ کی توقع کرسکتا ہے وہ ان کو حاصل تھا۔ شہنشاہ ہند اور ملکہ برطانیہ کے دربار تک ان کی رسائی تھی دولت و ثروت کا یہ عالم تھا کہ دہلی میں یہ مشہور تھا کہ پون دلی (۴/۳) بدرالدین علی خاں کی ملکیت ہے۔ دہلی کے مضافات میں بھی شاید کوئی گاؤں ایسا نہیں تھا جہاں ان کا بنایا ہوا کنواں یا

سرائے وغیرہ نہ ہو۔) لیکن اس شہرت وعظمت کے باوجود وہ انتہائی سادہ مزاج، نرم خو اور متواضع انسان تھے۔ ان میں کبر و نخوت کا شائبہ تک نہیں تھا۔ مولانا غلام علی ہفت قلمی نے لکھا ہے۔

دیا وجود بہم رسانیدن عزت و تمول و املاک   باوجود اس عزت و تمول اور دولت وخلقت کے
واقتدار ہمچشمان خود مطلق عجب و تکبر   کہ ہم چشموں کے ساتھ تکبر یا عجب و خود
نہ دارد (۳۴)   بینی کا شائبہ تک نہیں تھا۔

بدرالدین علی خاں مزاجاً کچھ تصوف کی طرف مائل تھے۔ مرزا قادر بخش صابر دہلوی نے ان کے تصوف کی طرف مائل ہونے کا تذکرہ کیا ہے۔ لکھتے ہیں۔

مشغلۂ اوقات دل ہائے خراب کی مرمت اور سرائے عقبیٰ کی معموری، مصرف توجہ حضرت واجب سے تحصیل قرب اور ماسوا سے تلاش دوری۔ (۲۵۱)

بدرالدین علی خاں بہت مخیر تھے۔ انھوں نے اپنی دولت میں سے عزیز ولی و مساکین کے لیے ایک معتد بہ حصہ مختص کر رکھا تھا۔ فقیروں، محتاجوں اور بے آسراؤں کی دل کھول کر مدد کیا کرتے تھے۔ ۱۲۸۰ھ میں انھوں نے کوچہ بلاقی بیگم دریبہ کلاں میں ایک مسجد تعمیر کروائی یہ مسجد آج بھی موجود ہے۔ دریبہ کلاں کی آبادی کے نقل مکانی کر جانے کی وجہ سے آج مسجد کے اردگرد مسلم آبادی قطعاً نہیں ہے تاہم مسجد میں ایک مسلم خاندان آباد ہے۔ جس کی وجہ سے بدرالدین علی خاں کی تعمیر کردہ یہ مسجد اذان و نماز سے محروم نہیں ہے۔

اس مسجد کی پیشانی پر سنگ سرخ کا ایک کتبہ لگا ہوا ہے۔ جس پر یہ اشعار کندہ ہیں۔

برائے حضرت سبحان و رحمان	شد این مسجد بنا صد شکر و احسان
تمام ملک خود زر می و سکنی	نمودم وقف آن ما از دل و جاں
ازان نصفے برائے وارثان است	دگر بہر مساکین مستحقاں
بریں تقسیم اگر حجت کند کس	زحاکم منع کردند شش مسلماں
الٰہی تا بحشر ایں را نگہدار	ز بیع و رہن و غصب و جملہ نقصاں
بگو سال از سر بسم اللہ نقشی	مساکیں جائے بدرالدین علی خاں
	۱۲۸۰ = ۳۰ + ۱۲۵۰

اس قطعۂ تاریخ سے جس کے ناظم خود بدرالدین علی خاں ہیں اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی تمام زرعی اور غیر زرعی جائیداد مساکین اور محتاجوں کے لیے وقف کر دی تھی۔ اور اپنی اولاد کے لیے اس میں سے نصف حصہ مخصوص کر دیا تھا۔

اس مسجد کے بیرونی دروازے پر بھی ایک شعر کندہ ہے جس کا مصرعِ ثانی یہ ہے جرع

نقشی نے دی صدا بنی مسجد خدا

ہو سکتا ہے یہ دونوں کتبے بدرالدین علی خاں نے ہی کندہ کیے ہوں۔ نہایت خوش خط اور دیدہ زیب ہیں۔ باہری دروازے کا کتبہ سفید پتھر پر ہے۔

اس مسجد میں بدرالدین علی خاں کے صاحبزادے سعادت اللہ خاں نے ایک مدرسہ قائم کر رکھا تھا (۲۶)، لیکن اب اس کے کچھ نشانات نہیں ملے۔

بدرالدین علی خاں کو بہ لگتا ہے فکر سخن بھی کیا کرتے تھے نقشی تخلص تھا۔ راقم کو ان کے اشعار تین جگہ ملے دو مسجد پر کتبہ اور ایک جگہ تذکرہ گلستان سخن میں دو جگہ اشعار کی زبان فارسی ہے صرف ایک شعر اردو کا دستیاب ہوا۔ باقی ان کی شاعری یا دیوان کے سلسلے میں راقم کو کوئی اطلاع نہ مل سکی۔ تذکرہ گلستان سخن میں ان کی شاعری کے بارے میں لکھا ہے۔

"باایں ہمہ سخن کا مرتبہ کس قدر بلند کیا ہے اور طرز کلام کو کیا کچھ دل پسند کیا ہے ہر لفظ لذت معنی سے شیریں اور ہر حرف ملاحت سخن سے نمکین، ہر صفحہ معنی خیال خیز سے ارباب کشف و شہود کا سینہ اور ہر بیت الفاظ آبدار سے گوہر شاہوار کا گنجینہ یہ چند شعر کہ مذاق اہل دانش میں لذت بخش ہیں صفحۂ تحریر پر ثبت اور مرقوم ہوتے ہیں ؎

دارم جنوں در ہجر او ویرانہ باید مرا | بیزارم از عیش و طرب غم خانہ باید مرا
ساربان چوں محمل جانانہ بر جمازہ بست | بر دلم بار غم و اندوہ بے اندازہ بست
بود ابتر دفتر دیوانگی ہا پیش ازیں | ایں قدر نقشی کتاب عشق را شیرازہ بست
ناخدا ترس کو از غمزہ بکشتی و دگر | بر سر نقشی من از بہر نماز آمدہ"(۲۷)

بدرالدین علی خاں نے طویل عمر پائی۔ آخر عمر میں فالج کا حملہ ہوا اور اسی مرض میں بعمر ۹۵ سال

۱۹ ذو قعدہ ۱۲۹۳ھ مطابق ۱۸ دسمبر ۱۸۷۵ء بروز شنبہ ان کا انتقال ہوا۔ (۲۸) نواب ضیاء الدین احمد خاں کے دیوان میں قطعۂ تاریخ وفات موجود ہے اس شعر سے تاریخ وفات نکلتی ہے۔

نام بدرالدین علی خاں باقلق ہرگز بند   پے بسال فوت آں مرحوم حق آگر بند

وہ اپنے آبائی مدفن قدم شریف میں مدفون ہوئے۔ قدم شریف میں ان کے خاندان کا ایک احاطہ تھا جو امتداد زمانہ سے ختم ہوگیا۔ اسی میں ان کی قبر تھی۔ یہ احاطہ ۴۷ء سے قبل ہی ختم ہوگیا تھا اب نہ قبر کا سراغ ہے اور نہ اس کی کچھ اطلاع کہ اس پر کوئی کتبہ تھا یا نہیں۔

بدرالدین علی خاں کے دو بیٹے تھے۔ سعادت اللہ خاں اور رشید الدین خاں۔ سعادت اللہ خاں نے کوچہ بلاقی بیگم میں اپنے والد کی تعمیر کردہ مسجد میں ایک عربی مدرسہ قائم کر رکھا تھا۔ جس کا ذکر اوپر بھی گذر چکا ہے۔ رشید الدین خاں مہر کنی کا کام کیا کرتے تھے۔ سعادت اللہ خاں کے کوئی نرینہ اولاد نہیں تھی صرف ایک بیٹی تھی۔ رشید الدین خاں کے ایک بیٹا ظہیر الدین تھا۔ ظہیر الدین کے دو بیٹے ہوئے جن میں سے ایک پاکستان چلے گئے اور دوسرے تقسیم ہند کے ہنگاموں کی نذر ہوگئے۔ سعادت اللہ خاں کی بیٹی کی اولاد اب بھی دہلی میں موجود ہے۔

راقم السطور اس مقالہ کی تیاری کے سلسلے میں دہلی گیا، وہاں برادرم عبدالعتیق خاں (کوچہ پنڈت دہلی) کے تعاون سے بدرالدین علی خاں کی مسجد واقع کوچہ بلاقی بیگم دریبہ کلاں ملی۔ اس مسجد پر ہنوز کتبہ موجود ہے۔ اس مسجد میں مولانا فرزند علی اور ان کے اہل وعیال قیام پذیر ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ بدرالدین علی خاں کا خاندان چوڑی والان میں موجود ہے۔ چوڑی والان میں پھاٹک کے نیچے بدرالدین علی خاں کے خاندان کی باقیات میں جناب عبدالرحیم شاہ سے ملاقات ہوئی۔ وہی بدرالدین علی خاں کی مسجد کے متولی بھی ہیں۔

ان کے والد جناب خلیل الرحمٰن مرحوم بدرالدین علی خاں کے بیٹے سعادت اللہ خاں کے حقیقی نواسے تھے۔ کرسی نامہ اس طرح مرتب ہوگا۔

بدرالدین علی خاں

رشید الدین خاں ← ظہیر الدین خاں ← بیٹا (وفات در دہلی ۴۴ء)، بیٹا (پاکستان)

سعادت اللہ خاں ← ایک بیٹی ← سید خلیل الرحمٰن ← جناب عبدالرحیم شاہ

عبدالرحیم شاہ صاحب کا نسبی رشتہ مطبع مجتبائی کے مالکوں کے خاندان سے ہے۔ انھوں نے بدرالدین علی خاں کے بارے میں بعض معلومات دیں مثلاً ان کے مکان کا محل وقوع، اور قبر وغیرہ۔ انھی سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بدرالدین علی خاں کی جمع کردہ وصلیوں اور تحریروں کا ذخیرہ بحق حکومت ضبط کر لیا گیا تھا۔ اور لال قلعہ میں جمع کر دیا گیا تھا لیکن بعد کو واگذار کر دیا گیا، ان کے خاندان کے افراد خاص طور پر ظہیر الدین خاں کی بے توجہی سے وہ پورا ذخیرہ ضایع ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ اس ذخیرہ میں ملکہ معظمہ اور نواب گورنر جنرل بہادر کی عطا کردہ توصیفی اسناد بھی شامل رہی ہوں گی۔ جو بدرالدین علی خاں نے کرنل برن کو دکھلائیں تھیں اور مرزا غالب کے وہ خطوط اور رقعات بھی شامل ہوں گے۔ جو وقتاً فوقتاً بدرالدین علی خاں کو لکھے گئے تھے۔

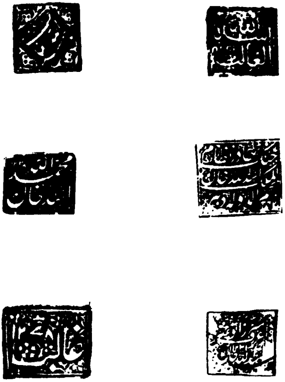
غالب کی مہروں کے تعلق سے پروفیسر مختارالدین احمد کا خیال ہے کہ غالب کی دریافت شدہ چھ مہروں میں سے چار تعجب نہیں بدرالدین علی خاں کی کندہ کی ہوئی ہوں۔ وہ مہریں یہ ہیں۔

۱۔ اسداللہ خاں عرف میرزا نوشہ ۱۲۳۱ھ خط نستعلیق

۲۔ اسداللہ الغالب ۱۲۳۱ھ خط نسخ

۳۔ محمد اسداللہ خاں ۱۲۳۸ھ خط نستعلیق

۴۔ نجم الدولہ دبیر الملک اسداللہ خاں بہادر نظام جنگ ۱۲۶۷ھ خط نستعلیق



(غالب کی مہریں)

مہرِ طلائی جس پر "نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ، ۱۲۶۰" کا نقش ہے اس کے بارے میں تو خود غالب کی تصریح موجود ہے۔ ان کے ایک خط بنام انوار الدولہ شفق سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مہر شفق نے بدر الدین علی خاں سے غالب کے لیے تیار کروائی تھی۔ غالب لکھتے ہیں:

"میں متوقع ہوں کہ میاں بدر الدین مہر کن سے میری مہر طلائی کھدوا کر بھیج دیجئے
چاندی کا نگینہ مربع اور قلم جلی فقیر نے سرانجام کر کے بھیج دیا ہے۔"

مالک رام صاحب لکھتے ہیں: "اس آخری دور میں بدر الدین علی خاں بے نظیر مہر کن تھے۔ مرزا کے خطوط میں بھی ان کا ذکر موجود ہے۔ ان میں سے اکثر مہریں یقیناً انہی کی تیار کردہ ہیں۔"(۳۰)

پروفیسر نظام الدین احمد کا خیال ہے کہ غالب کی آخری دو مہریں جن پر

یا اسد اللہ الغالب ۱۲۶۹ خط نستعلیق

اور

غالب ۱۲۷۸ خط نستعلیق

نقش ہے کسی اور مہر کن کی کندہ کی ہوئی معلوم ہوتی ہیں (۳۱)، ان مہروں کی نہ شکل و صورت دیدہ زیب ہے اور نہ یہ خطاطی کا اچھا نمونہ ہیں۔ آخری مہر میں تو نہ نام ہی خوشخط لکھا ہوا ہے اور نہ سال۔ یہ بدر الدین علی خاں کی تیار کی ہوئی نہیں معلوم ہوتی ہے۔

حواشی

۱۔ احترام الدین شاغل، صحیفۂ خوشنویساں۔ انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ ۱۹۶۳ء ص ۹۲
۲۔ مولانا غلام علی ہفت قلمی، تذکرۂ خوشنویساں۔ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ ۱۹۱۰ء ص ۴،
۳۔ آثار خواجہ حسن ثانی نظامی، بحوالہ آثار الصنادید مرتبہ خلیق انجم حاشیہ ص
۴۔ تذکرۂ خوشنویساں ص ۴، ۵۔ مصدر سابق ص ۴،
۶۔ سر سید احمد خاں آثار الصنادید مرتبہ خلیق انجم مطبوعہ اردو اکادمی دہلی ۱۹۹۰ء ص ۲۲۸/۲

۷۔ تذکرہ خوشنویساں ص ۴۴، ۸۔ مصدر سابق ص ۴۴،

۹۔ آثار الصنادید ص ۲۲۸/۲

۱۰۔ مرزا اسد اللہ خاں غالب، غالب کے خطوط۔ مرتبہ خلیق انجم۔ خط بنام انوار الدولہ شفق ص ۹۴۳/۳

۱۱۔ مرزا اسد اللہ خاں غالب، باغ دودر۔ تصحیح و تحقیق وزیر الحسن عابدی طبع دوم ۱۹۷۰ء لاہور ص ۱۳۰

۱۲۔ مرزا قادر بخش صابر دہلوی، تذکرہ گلستان سخن، مرتبہ خلیل الرحمٰن داؤدی۔ مجلس ترقی ادب لاہور ص ۴۴۵/۲

۱۳۔ غالب کے خطوط، حوالہ سابق ص ۳/۶-۱۰۶۵ بنام شیو نارائن آرام۔

۱۴۔ مصدر سابق ۱۵۔ مصدر سابق

۱۶۔ امداد صابری: دہلی کی یادگار ہستیاں مطبوعہ ۱۹۷۲ ص ۱۸۱

۱۷۔ خواجہ حسن نظامی: بہادر شاہ ظفر کا روزنامچہ، الزاں حصہ ص ۳۹

۱۸۔ اسعد الاخبار، کلکتہ بحوالہ خدا بخش جرنل شمارہ ۳۔ ۸۱ ص ۱۰

۱۹۔ دہلی کی یادگار ہستیاں ص ۱۸۲ ۲۰۔ ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ ص ۱۵۶

۲۱۔ خواجہ حسن نظامی: غدر دہلی کے گرفتار شدہ خطوط (از دہلی کی یادگار ہستیاں ص ۱۸۲)

۲۲۔ ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ ص ۱۵۶ ۲۳۔ تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ ہند ص ۶۰۳

۲۴۔ تذکرہ خوشنویساں ص ۵، ۲۵۔ تذکرہ گلستان سخن ص ۴۴۵/۲

۲۶۔ بشیر احمد، واقعات دار الحکومت دہلی، دہلی اردو اکادمی ۱۹۹۰ء ص ۱۶۲/۲

۲۷۔ تذکرہ گلستان سخن ص ۲/۶۰۔ ۴۴۵

۲۸۔ آثار خواجہ حسن ثانی نظامی، بحوالہ آثار الصنادید مرتبہ خلیق انجم حاشیہ ص

۲۹۔ اردوئے معلیٰ، مرتبہ سید مرتضیٰ حسین فاضل۔ مجلس ترقی ادب۔ لاہور طبع اول ۱/۱-۵۹۰

۳۰۔ مالک رام: فسانۂ غالب۔ مکتبہ جامعہ ۱۹۷۷ء بار اول ص ۹۱۔

فیضی کا یہ رویّہ خود اس کی علمی و ادبی شخصیت کی بلندی اور کردار کی عظمت کا ثبوت ہے۔

انشائے فیضی کا تاریخی نام لطیفۂ فیاضی ہے۔ اس کے مرتب فیضی کے بھانجے نورالدین ہیں جو حکیم عبداللہ کا بیٹا اور حکیم عین الملک شیرازی (متوفی: ۱۰۰۳ھ) کا پوتا ہے۔ یہ نورالدین کے دیباچے سے شروع ہوتی ہے۔ اس کے بعد دیوان فیضی موسوم بہ تباشیر الصبح کا دیباچہ شامل کیا گیا ہے۔ انشائے فیضی میں پانچ لطائف (ابواب) ہیں۔ لطیفۂ اوّل میں فیضی کے اکبر شاہ کی خدمت میں ارسال کردہ چھ عرضداشتیں ہیں۔ لطیفۂ دوم میں شرفا، علما اور عرفا کی خدمت میں لکھے گئے مفاوضات ہیں جن کی تعداد پینتالیس (۴۵) ہے۔ لطیفۂ سوم "حکمائے معاصر" کے نام فیضی کے چھبیس مفاوضات پر مشتمل ہے۔ لطیفۂ چہارم میں امرا و احباب کے نام لکھے گئے انیس (۱۹) خطوط ہیں۔ آخری لطیفۂ پنجم میں فیضی کی وہ تحریریں جمع کی گئی ہیں، جو اس نے اپنے والد، بھائی اور اقارب کو لکھی تھیں۔ سید بادشاہ حسین حیدرآبادی نے انشائے فیضی کا تعارف کرایا تھا اور ضمناً اس کی ادبی اور ثقافتی خوبیوں کا اجمالی ذکر بھی کیا تھا۔ انشائے فیضی کے مرتب ڈاکٹر اے۔ ڈی۔ ارشد صاحب نے اس کی دیگر خصوصیات پر بھی مختصر روشنی ڈالی ہے ان کے بقول: "انشائے فیضی ایک بڑا تاریخی مقصد حاصل کرتی ہے۔ سیاسی، معاشرتی اور تہذیبی حالات کے مطالعے میں بڑی مدد بہم پہنچاتی ہے۔ ۔ ۔ اکبر کے عہد کی ثقافتی تاریخ کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے ان مکاتیب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ ۔ ۔ انشائے فیضی اکبر کے انقلاب آفریں عہد کا ایک زبردست تہذیبی سرمایہ ہے جس سے اس زمانے کی تہذیب و تمدن کے خدوخال ابھرتے دکھائی دیتے ہیں"

پیش نظر سطور میں اسی اجمال کی تفصیل بیان کی جا رہی ہے۔

فیضی فارسی کا شاعر ہے اور ایک مفکر شاعر ہے۔ ہندوستان کے فارسی شعرا میں امیر خسرو کے بعد اسے سب سے بڑا شاعر ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اس کے باوجود فیضی کے دوست، معاصر اور اپنے دور کی ایک معروف علمی و ادبی شخصیت ملّا عبدالقادر بدایونی نے اپنی منتخب التواریخ میں فیضی کی سیرت، فضیلت اور علمی و ادبی حیثیت پر انتہائی طنزیہ انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ فیضی کے اسلوب تحریر کی تعریف تو بہت کرنی چاہیے

ہے، لیکن اس کے کلام میں استحکام نہیں۔ اس کے ہزارہا اشعار میں سے کوئی ایک شعر بھی کسی کو یاد نہیں[52] بدایونی کا یہ تبصرہ ایک حد تک اس لیے صحیح ہے کہ فیضی کے کلام میں صنائع کی کثرت اور آورد کی بھرمار ہے اور اسی وجہ سے اس کے کلام کو سمجھنے کے لیے غور و فکر کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس کے باوجود بدایونی نے فیضی کی علمی و ادبی استعداد کو ان الفاظ میں سراہا ہے:

در فنون جزئیہ از شعر و معما و عروض و قافیہ و تاریخ و لغت و طب و انشا،
عدیل در روزگار نداشت[53]

فیضی کے کلام سے بہر صورت بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے فارسی کے عظیم شعرا کا بالاستیعاب مطالعہ کیا تھا۔ بعض شعرا کی غزلوں پر غزلیں بھی کہی تھیں۔ فیضی کے لیے فارسی شاعری کی تاریخ کوئی اجنبی چیز نہیں تھی۔ فارسی شاعری کے تمام بنیادی پہلوؤں پر اس کی گہری نظر تھی۔ اسی وجہ سے اپنے فارسی دیوان کے دیباچے میں فیضی نے ہندوستانی فارسی شعر کے اسلوب شاعری پر، جسے سبک ہندی کہتے ہیں، جو مختصر تبصرہ کیا ہے، وہ اس طرز شاعری کی بنیادی حقیقت کو سمجھنے کے لیے کلیدی حیثیت کا حامل ہے۔ اس بارے میں فیضی نے لکھا ہے کہ:

کجا پایۂ من ہندوستانی با این ہمہ کج زبانی و کجا این پہلوانی و پہلوی دانی
ہمانا کہ سحر جادوگران ہند تواند بود کہ بعمل سیمیا اشکال و اشباح موہوم را کہ در
خارج وجود ندارند، موجود نما ساختہ بنظر ہی در آرند

فیضی اپنے ہندستانی ہونے اور اپنے کلام میں ہندستانی اسلوب شاعری کی خصوصیات پر فخر کرتا ہے اور کہتا ہے:

سپاہی لشکر سخنم نسخۂ سواد ہندوستانست و سواد شہر معانیم سنبلستان این کہن
بوستان[54]

سبک ہندی کی ایک خصوصیت یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ ہندستانی فارسی شعرا مشکل پسند ہیں، لیکن فیضی کو یہ انداز پسند نہیں۔ اس نے وضاحت سے لکھا ہے کہ میں مشکل پسند نہیں اور دوسرے بھی یہ خصوصیت میرے کلام میں تلاش نہ کریں:

چون من دشوار پسندی بر خود نپسندیدہ ام، پسندیدہ آنست کہ بندگان سخن

ہم ایں بار برمن نبندند و ایں کار برمن نپسندند[۸۱]

فیضی نے ایک دوسری جگہ بھی یہی اطلاع دی ہے کہ اسے تکلف و تصنع سے کوئی علاقہ نہیں؛

جبلت فقیر بر تکلف و تصنع نیست[۸۲]

فیضی نے اپنے دیوان میں نو ہزار سے کچھ زیادہ ابیات کی اطلاع دی ہے؛

ایں رطب و یابس کہ بر طبق عرض نہادہ ام، نہ ہزار بیت و کسر یست[۸۳]

فیضی نے اپنے اشعار کی یہی تعداد اپنے ایک قطعے میں بھی درج کی ہے؛

صد آفریں بخامۂ فیضی کہ ہر نفس — ہر سو ی جلوہ ی کند ایں آتشیں کمیت

از بہر باز کردن گوشش گراں سراں — کوسی بہ فلک زدہ زیں نہ ہزار بیت[۸۴]

فیضی کے شعور نے جیسے ہی آنکھیں کھولیں، اس کی طبیعت شعر و شاعری کی طرف مایل ہوئی۔ وہ تعلیم حاصل کرنے کے دوران اور فرصت کے لمحات میں شعر کہتا رہا۔ اس طرح ہر صنف جیسے قصیدہ، غزل، مثنوی وغیرہ میں طبع آزمائی کی، لیکن اس کی یہ تمام کوششیں پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکیں؛

چوں از مبادی صغر و فواتح صبی کہ عقل ہیولانی در اہتزاز بود، تا امروز کہ سنین عمر از اربعین گذشتہ، ہمیشہ طبیعت ما بنظم منظوم می یافت در خلال تحصیل و ایام تعطیل ہموارہ تخیلات شعری مخطور می شد، تا آنکہ بہ تدریج کارخانۂ اقسام شعر از قصیدہ و غزل و مثنوی وغیر آن فراہم آمد کہ اکثری از اں نتائج ضمیر و نسائج خمیر، علم اتمام و طراز اختتام ندیدہ[۸۵]

فیضی کی یہ شاعرانہ کوششیں اس کے پہلے دیوان تباشیر الصبح میں جمع کر دی گئی ہیں۔

از ان جملہ دیوان اوّل کہ موسوم است بہ تباشیر الصبح، مذیل با بعضی از لواحق اشعار بندہ کہ یک چند...[۸۶]

فیضی ایک حقیقی شاعر ہے۔ اس نے شعر کی نوعیت و کیفیت اور خود شاعر پر گذرنے والے احساسات اور اس کے ادراکات کے بارے میں یہ حقیقت افروز بیان دیا ہے کہ شعر کبھی کبھی درد دل اور حسب حال ہوتا ہے، جب بے اختیار ذہن میں القا اور صفحۂ قرطاس پر مرقوم ہو جاتا ہے۔ کبھی ایک

صنف کے تمام ابیات حسب حال ہوتے ہیں اور کبھی مقصود شاعر ایک یا دو ابیات میں سمو دیا جاتا ہے اور باقی دیگر ابیات زیب داستاں کے طور پر کہے جاتے ہیں۔ یہی کیفیت و روش غزل کی ہے۔ اس کا ہر بیت ایک مخصوص اور جداگانہ کیفیت کا حامل ہوتا ہے۔ ایسی غزل جو تمام کی تمام ایک ہی وتیرہ پر کہی گئی ہو (غزل مسلسل)، ندرت سے ملتی ہے[illegible]

فیضی نے ایک شاعر پر گذرنے والی اس کیفیت کا بھی ذکر کیا ہے کہ شعر کہنے کے معاملے میں سمند طبیعت کبھی کبھی خوب جولانیاں دکھاتا ہے اور اس کے برخلاف کوشش کے باوجود طبیعت کبھی کبھی اس طرف مائل نہیں ہوتی۔ ایک بار خود فیضی کی طبیعت شعر کہنے پر پہلے سے زیادہ مائل تھی۔ اس کے بقول ارتباط فقیر

دراین ایام بہ شعر کہ چوں سواد ہام و اضغاث احلام خاطر فریب است،
بیش از ان است کہ دیدہ بودند[illegible]

لیکن ایک بار لاہور میں وہ خدا کی خدائی کی قسم کھا کر کہتا ہے کہ ایک مصرع بھی موزوں نہ کر سکا:

امّا بہ خدائی خدا سوگند کہ بہ لاہور رسیدہ مصراع روی ننمود و فکر شد این
درہمان بی آرامی تگاپو دارد و بسیار پریشان است[illegible]

فیضی نے دربار اکبری سے وابستہ ہونے کے بعد ظاہر ہے کہ آگرے میں مستقل سکونت اختیار کی۔ اکبر نے علم و ادب کی زبردست سرپرستی کی جس کی وجہ سے اس کا دارالخلافہ علم و ادب کا ایک عظیم الشان مرکز بن گیا۔ فیضی نے اس دور میں آگرے کی اسی علمی و ادبی فضا کا ذکر کیا ہے، لیکن وہ خود اس ہنگامے سے دور رہا اور گوشۂ خلوت میں بیٹھ کر علم و ادب کی خدمت کرتا رہا:

دیگر دراین شہر ہنگامۂ شعر بسیار گرم است طبایع را جلای دیگر است
فقیر خود ترک صحبت ہا گرفتہ، خلوت گزین است[illegible]

فیضی نے اپنے بعض خطوط میں اپنی تصانیف کا تعارف کرایا ہے، جو تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ اس نے اطلاع دی ہے کہ اکبر نے (۹۹۳ھ میں) اس کو توجہ سے خمسہ نظم کرنے کا حکم دیا۔ اکبر نے یہ فرمائش بھی کی کہ وہ سب سے پہلے ہندستانی عشقیہ داستان نل دمن کسی مناسب

بحر میں مکمل کرے۔ فیضی نے نل دمن کے لیے نظامی کی لیلی و مجنوں[۲۰] کا انتخاب کیا۔ بادشاہ یہ بھی حکم تھا کہ نل دمن جیسے جیسے مکمل ہوتی جائے، اس کے یہ حصّے بادشاہ کی خدمت میں ہر ماہ پیش کیے جائیں۔ فیضی نے چار ماہ میں چار ہزار بیت نظم کیے۔ اس کے بعد کچھ ابیات کا اضافہ کرنا باقی رہا جو اس نے ایک ماہ میں مکمل کر لیے۔ اس طرح فیضی نے نل دمن پانچ ماہ میں مکمل کی[۲۱]

فیضی نے اپنے خمسے کا ذکر اس طرح کیا ہے کہ اس کی سب سے پہلی مثنوی مرکز ادوار ہے جس کا بیشتر حصّہ فتح پور میں نظم کیا گیا تھا۔ دوسری مثنوی سلیمان و بلقیس ہے جو ۱۰۰۲ھ سے سات سال پہلے لاہور میں شروع کی گئی تھی اور جس کا کچھ حصّہ نظم کیا گیا تھا۔ تیسری نل دمن ہے جو مکمل ہو گئی۔ چوتھی ہفت کشور ہے جس میں ہفت اقلیم کے احوال نظم کیے جائیں گے اور یہ مثنوی نظامی کی ہفت پیکر[۲۲] کے وزن پر لکھی جائے گی۔ خمسے کی پانچویں مثنوی اکبر نامہ ہے جو وقتاً فوقتاً لکھی جاتی رہی، لیکن فیضی اس پر نظر ثانی کی ضرورت محسوس کرتا تھا[۲۳]

فیضی اپنا خمسہ مکمل نہیں کر سکا، اس کی صرف درج ذیل مثنویاں یا ان کے بعض حصّے آج دستیاب ہیں:

مرکز ادوار: سلیمان و بلقیس کے بعض اشعار جو ابوالفضل نے اکبر نامے اور بدایونی نے منتخب التواریخ میں نقل کیے ہیں؛ نل دمن۔ فیضی اپنی تالیفات اپنے دور کے علما، ادبا اور اپنے دوستوں کو ارسال کرتا تھا اور ان سے اپنی علمی و ادبی کاوشوں پر اظہار رائے کا متمنی رہتا تھا۔

نل دمن مکمل ہوئی۔ فیضی نے اس کی ایک جلد شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۰۴۷/ ۱۶۳۸) کی خدمت میں ارسال کی اور انھیں اپنی اس منظوم تصنیف کے بارے میں لکھا کہ اس کے ابتدائی حصّے امتیازی حیثیت کے حامل ہیں:

از نل دمن اوائل بہ بیند کہ خالی از غرابتی نیست[۲۴]

فیضی عربی میں غیر منقوط تحریر کو بہت اہمیت دیتا تھا۔ اس نے اس نوعیت کی تحریروں کے بارے میں لکھا ہے کہ "بہ عربستان کی تجلی اسم المتکلم دران ولایت بہ مثابہ ایست کہ پایۂ فصاحت

بلاغت بہ معراج اعجاز رسیدہ بہ[۵۳]

فیضی نے ۹۸۵ میں موارد الکلم سلک درر الحکم تالیف کی۔ یہ تاریخی نام ہے جس سے سال تکمیل برآمد ہوتا ہے۔ اس میں آیات قرآنی، احادیث نبوی اور اقوال حکماء کے مضامین چھوٹے چھوٹے فقروں میں ادا کیے گئے ہیں اور تمام کتاب صنعت اہمال (بغیر نقطوں کے الفاظ) میں لکھی گئی ہے۔ فیضی نے اس کتاب کی تکمیل کے بارے میں شیخ حسن کو اطلاع دی کہ: دراین ہنگام چند جزو حرف بی نقطہ بہ زبان عربی مستنبط از نص و حدیث و کلام علما جمع کردہ شد و فتح نوشتہ شد[۵۴]

سید میر شاہ صحیح النسب سید اور علمی فضائل سے آراستہ اور پرہیزگاری کے زیور سے پیراستہ تھے۔ آگرے میں جمنا کے اس پار ان کی خانقاہ تھی جہاں طلاب اور عرفا جمع ہو کر ان سے کسب فیض کرتے تھے۔ ان میں قوت تصرف، سعی و عمل، ذہن نقاد اور فراوانی معلومات کی خوبیاں موجود تھیں[۵۵] فیضی نے انھیں اپنا رسالہ موارد الکلم ارسال کیا۔ اسے بادشاہ کے نام معنون کرنے کی اطلاع دی اور بتایا کہ یہ تحریر "بازیچۂ اطفال عرب" ہے کارنامۂ صنادید عجم "نہیں ممکن ہے شاہ صاحب کے زیر تربیت مبتدی اور صاحبان علم تشحیذ خاطر ذہن کو جلا بخشنے کی غرض سے اس کا مطالعہ کریں:

ایں گرفتار سلسلۂ حرف و نقط کہ ہرزہ گرد مرحلۂ بُعد و سخط است پیش ازیں
بہ چند گاہ رسالۂ غیر منقوط کہ بعضی از قواعد منوط است، تالیف دادہ بود و موشح
بہ اسم سامی بندگان حضرت ظل الٰہی لازالت شموس جلالہ شرقۃ عن وسط النہار
مقرون ایں طومار ارسال داشت، فی الحقیقت بازیچۂ اطفال عرب است نہ کارنامۂ
صنادید ادب، شاید ابجد خوانان دبستان تعلیم و حرف شناسان مکتب تفہیم کہ
در حواشی و زوایای مدرسۂ عالیۂ آن مخدوم اعظم می باشند، بواسطۂ تشحیذ خاطر
میل فرمایند[۵۶]

فیضی کو اپنی تفسیر قرآن سواطع الالہام پر بجا طور پر ناز تھا۔ وہ اسے اپنا کارنامہ سمجھتے تھے اور فخر کے ساتھ علمائے وقت کی خدمت میں ارسال کر رہے تھے۔ فیضی نے اپنی اس تفسیر پر ایک ہزار ابیات (جملے) پر مشتمل ایک مقدمہ لکھا۔ اس میں اپنے، اپنے والد کے احوال لکھے۔ علوم قرآنی

پر اظہار خیال کیا۔ بادشاہ کی مدح لکھی۔ اس میں ایک قصیدہ بھی ہے جس کا مطلع فیضی نے پٹن میں مولانا غوثی مندوی کو سنایا تھا[۲۲]

شیخ عبدالحق محدث دہلی میں قیام پذیر رہے جو بقول فیضی مرکز ہندوستان و مطلب جمیع دوستان" اور" تخت گاہ بادشاہان صوری و معنوی"[۲۳] ہے۔ فیضی کی مستقل سکونت آگرے میں تھی۔ اس لیے شیخ صاحب سے ملاقات مشکل ہی سے ہوتی ہو گی۔ فیضی نے محدث دہلوی کے نام اپنا ایک خط اس بیت سے شروع کیا ہے :

نوای کبوتر بام حرم چہ میدانی   طپیدن دل مرغان رشتہ بر پا[۲۴]

یہ بیت اس حقیقت کا ترجمان ہے کہ فیضی شیخ صاحب کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتا تھا لیکن اس کے فرائض منصبی آڑے آتے تھے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی اپنے دور کے معروف محدث اور عارف تھے۔ فیضی کو ان سے گہرا تعلق خاطر تھا۔ فیضی نے اپنے ایک دوسرے خط میں شیخ صاحب کو لکھا کہ اگر میرے پر لگ جاتے تو میں ہر روز آپ کے حجرہ کی چھت پر آ کر بیٹھتا، محبت کے دانے چگتا اور شوق و اشتیاق کے ترانے گاتا[۲۵] یہ جملہ بھی محدث دہلوی سے فیضی کے گہرے تعلق اور فیضی کی نگاہ میں شیخ صاحب کے عظیم علمی و عرفانی مرتبے کا شاہد ہے۔ فیضی نے شیخ صاحب کو سواطع الالہام کے مکمل ہونے کی اطلاع دی اور عرض کیا کہ جب وہ یہ تفسیر تالیف کر رہا تھا تو خود حیران تھا کہ جو کچھ لکھ رہا ہے وہ کہاں سے الہام ہو رہا ہے اور کس طرح ہو رہا ہے :

، وقتی کہ تفسیر می نوشت، حیران بود کہ از کجا می آید و چون می آید[۲۶]

فیضی نے اپنی اس تفسیر سے بڑی امیدیں وابستہ کی تھیں۔ وہ اسے اپنی نجات کا ذریعہ سمجھتا تھا۔ شیخ صاحب ہی کو ایک خط میں اس نے اطلاع دی کہ تفسیر کا کام چھ ماہ معطل رہا اور چونکہ کام بالکل نرالا تھا، اس لیے بہر صورت اسے مکمل کر لیا ہے۔ یہی بات فیضی نے شیخ صاحب کو اپنے ایک دوسرے خط میں بھی لکھی ہے[۲۷]

فیضی سواطع الالہام کے مکمل ہونے کی اطلاع مولانا غوثی منڈوی کو بھی دیتے ہیں کہ "عاشر (۱۰) ربیع الآخر میں مکمل ہوئی اور اسی ماہ میں بے نقط خاتمہ بھی لکھ دیا گیا جس میں

(۹۹) ننیانوے فقرے ہیں اور ہر فقرے سے تاریخ تکمیل برآمد ہوتی ہے۔ میر حیدر کاشانی نے سورۂ قل ہو اللہ سے اس تفسیر کی تاریخ تکمیل نکالی ہے جو فیضی کی نظر میں عجائبات میں سے ہے۔ اسی طرح تفسیر کے شروع ہونے کی یہ تاریخ بھی عزائب روزگار میں سے ہے؛

لا رطب ولا یابس الا فی کتاب مبین

شیخ جمال الدین ابن شیخ جلال واصل ساکن کالپی شیخ محمد غوث گوالیاری کے خلیفہ تھے۔ فیضی نے اپنی تفسیر کے مکمل ہونے اور اس کے بارے میں درج ذیل اطلاعات انھیں ایک خط میں فراہم کیں۔ فیضی نے لکھا ہے کہ یہ تفسیر عاشر ربیع الثانی سنہ اثنین والف (۱۰۰۲) میں مکمل ہوئی۔ یہ ایک عطیۂ غیبی تھا جو اس کے لیے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ یہ نہایت عجیب و غریب نوعیت کا کام ہے جو اہل تفسیر کے لیے باعث حیرت ہوگا۔

فیضی نے اس قدیم علمی و ادبی روایت کا ذکر بھی کیا ہے کہ جب کوئی نادر تالیف مکمل ہوتی ہے تو افاضل وقت اس پر توقیعات لکھتے ہیں۔ اس روایت کے مطابق احمد نگر سے ایک بزرگ سید محمد شامی نے تقریظ لکھی اور فیضی کو ارسال کی۔ ملا ظہوری نے تفسیر کی تعریف و توصیف میں ایک قصیدہ لکھا اور مولانا قمی نے رباعیات کہیں۔

ابوالفضل نے فیضی کو اطلاع دی کہ وہ ظہور الانوار نامی کتاب کی تالیف میں مصروف ہے۔ فیضی کو خوشی ہوئی۔ فیضی نے بھی اپنے چھوٹے بھائی کو لکھا کہ وہ فتح پور میں ایک رسالے کی تدوین میں مصروف تھا جو ایک ہزار ایک رباعیوں پر مشتمل تھا۔ اسے بارہ ابواب میں تقسیم کیا گیا تھا اور ہر باب کی تفصیل بیان کی گئی تھی۔ اس کتاب کے بعض حصّوں کو آخری صورت دیدی گئی تھی اور بعض صرف ابتدائی مراحل میں مسودہ کی صورت میں تھے۔ یہ سب حوادث زمانہ کی نذر ہو گئے۔

انشائے فیضی کے مشمولات سے پتا چلتا ہے کہ فیضی نے متعدد شعرا کی پیروی کی اور ان کی غزلوں پر غزلیں کہیں۔ فیضی کی ایک غزل کا مطلع ہے؛

ما سادہ لوح دیر خط سرنوشت ما   عکسی است از کتابۂ طاق کنشت ما

فیضی نے یہ غزل آقا محمد بن جمال الدین سبزواری متخلص بہ شاہی کی پیروی میں کہی تھی جو موسیقی دان اور

معتوبھی تھا یہ ۸۰ ۱۳ ء میں سبزوار میں پیدا ہوا اور ۱۴۵۳ء میں استر آباد میں فوت ہوا ہے۔
فیضی سفر کے دوران بھی مطالعے سے غافل نہیں رہتا تھا۔ وہ ایک بار دکن گیا۔ وہاں اسے حسن سجزی دہلوی (۱۲۵۳ - ۱۳۲۷ء) کا خیال آیا حسن دہلوی دولت آباد میں دفن ہیں اور فیضی کے بقول غالباً سلطان علاالدین (عہد حکومت ۱۲۹۶ - ۱۳۱۹ء) کے ہمراہ دولت آباد آئے اور اس کے بعد اپنی مستعار زندگی اسی علاقے میں گذاردی ہے حسن دہلوی کا خیال ذہن میں آنا تھا کہ فیضی نے ان کی کسی ایک غزل پر غزل کہنے کا ارادہ کرلیا۔ فیضی نے حسن کا دیوان کھولا، جو غزل سامنے آئی، اس کا مطلع ہے؛

بازنوای بلبلان عشق تو یادی دہد ہرکہ بہ عشق نیست خوش عمر بہ بادی دہد

فیضی نے اس کے تتبع میں "شکستہ بستہ" غزل کہی۔ شاہزادہ کا نام اس غزل کے قافیے میں شامل ہو سکتا تھا، اس لیے فیضی نے اپنی یہ غزل اسی شہزادے کی خاطر لکھی اور ارسال کردی۔ فیضی کی اس غزل کا مطلع ہے۔

صبح کرترک مست من شیشہ کشادمی دہد عقل بہ خاک می زند، صبر بہ باد می دہد [۴۳]

فیضی کے خطوط میں کثرت سے فارسی کے علاوہ اور شعرا کا اجمالی ذکر ملتا ہے۔ بعض شعراو ادبا کا چند جملوں میں فیضی نے تعارف بھی کرایا ہے۔ یہ تعارف مختصر ہے، لیکن متعلقہ شاعر یا ادیب کی زندگی اور اس کے فن پر فیضی جیسے صاحب نظر اور مطلع شخص کے دو جملے بھی اس شاعر یا ادیب کے حقیقی تعارف کے لیے بنیادی حیثیت اور اہمیت رکھتے ہیں۔

احمد نگر میں مقیم خاکی نہاد اور صافی مشرب" ملا قمی اور ملا ظہوری کی فیضی نے تعریف کی ہے۔ ملک قمی کے تعارف میں فیضی صرف اس ایک جملے پر اکتفا کرتا ہے؛

ملک قمی کہ بکس کمتر اختلاط می کند وہمیشہ مژہ تر دارد؛ فیضی نے ملک قمی کا ایک رباعی اور یہ شعر بھی نقل کیا ہے جو آج بھی اہل ذوق کی نوک زبان پر ہے؛

رفتم کہ خار از پا کشم محمل نہاں گشت از نظر یک لحظہ غافل گشتم وصد سالہ راہم دور شد

ملا ظہوری ترشیزی فارسی کے معروف شاعر و ادیب تھے۔ دکن میں مقیم رہے۔ غزل گوئی میں بلند مقام پایا اور رنگین و مصنوعی نثر میں ان کی سہ نثر اپنے طرز کی غالباً واحد کتاب سمجھی جاتی

ہے۔ فیضی سے ان کے خاص اور قریبی تعلقات تھے۔ اکبر بھی انھیں یاد کرتا تھا[45] فیضی بھی ظہوری سے ملاقات کی اپنی آرزو کا اکبر کے سامنے برملا اظہار کرتا تھا[46] فیضی نے ظہوری کے اخلاق اور فن شاعری کو ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا ہے؛

بغایت رنگین کلام است و در مکارم اخلاق تمام[47]

ایک بار فیضی کو ظہوری کا خط تاخیر سے ملا۔ فیضی بے چین ہو گئے اور ظہوری کو لکھا؛

خط شما چرا دیر می رسد، ازین دیر رسیدن دل ما خون است۔ خط فرستادن بہ غایت آسان است۔ چرا بجل می ورزید و بیداد می کنید کہ طاقت ندارم[48]

فیضی ہمیشہ متمنی رہتے کہ ظہوری اپنی ادبی کاوشیں انھیں ارسال کریں۔ ۴ محرم ۹۹۳ھ کو فیضی نے ظہوری کو جو خط لکھا اس میں اپنی اس آرزو کا اظہار کیا کہ؛

از نوادر طبع لطیف آنچہ رو دادہ باشد، فرستند و بر نثر تنہا اکتفا ننمایند، ہرچند نثر را بہ پایۂ نظم رسانیدہ باشند۔ مدتی است کہ بہ لطائف منظومہ یاد نکردہ اند۔ چند بیتی کہ دران صحیفہ بود، از غرائب بود، احسنت احسنت[49]

شیخ حسن کالپی کو ایک خط میں غزالی مشہدی کی وفات کی اطلاع دیتے ہیں؛

مولانا غزالی نیم شب بست و ہفتم رجب در احمد آباد وفات یافت و در سرکیچ مدفون شدند[50]

غزالی مشہدی اکبر کے دربار کا پہلا ملک الشعرا تھا۔ اس کا انتقال ۹۸۰/۱۵۷۲ میں ہوا۔ اسی کے انتقال کے بعد فیضی کو دربار اکبری کا ملک الشعرا بنایا گیا تھا۔ فیضی نے اس کی وفات پر ایک قطعۂ تاریخ بھی کہا ہے[51] جو اس لیے بھی اہم ہے کہ اس میں فیضی نے غزالی کو ایک "عام فریب شاعر" کہا اور غزالی کی اسی خصوصیت کی بنا پر " شاعر عوام فریب" سے اس کی تاریخ وفات نکالی ہے۔

میر فتح اللہ شیرازی اکبری دور کے نہایت معروف عالم اور دانشمند تھے[52] علی عادل شاہ والی برہان پور کے دربار میں منصب وکالت پر فائز رہے۔ ۹۹۰/۱۵۸۲ میں اکبر کی ملازمت

اختیار کی۔ صدارت کے عہدے پر رہے۔ عضدالدولہ اورامین الملک کے خطابات سے نوازے گئے۔ صدارت کل بھی ان کے سپرد کی گئی بعض چیزیں ان کی ایجاد ہیں۔ فیضی نے ان کے بارے میں انتہائی تحسین آمیز انداز میں لکھا ہے کہ:

میر فتح اللہ شیرازی کہ با بستن سی صد سال ماد بر ایام اور ازادہ بود و ہدیۂ الٰہی بود کہ بہ حضرت کرامت فرمودہ بود۔[۵۳]

میر فتح اللہ شیرازی کو کھنے کے حاکم مرزا جانی نے چالیس تومان بھیج کر شیراز سے بلایا تھا۔ خان خانان نے مرزا جانی کو اطاعت تسلیم کرنے پر مجبور کیا تو فیضی نے اکبر کو لکھا کہ وہ خان خانان کو حکم دے کہ وہ میر فتح اللہ کو اس کے دربار روانہ کر دے۔[۵۴]

حکیم عین الملک کو میر فتح اللہ شیرازی کے ارتحال کی مفصل خبر دیتا ہے اور بادشاہ پر ان کے انتقال سے جو گریہ و بکا طاری ہوا، اسے بیان کرتا ہے کہ:

روز سہ شنبہ سیوم شوال نواب وحید الزمانی علامۃ العلما شاہ فتح اللہ در زمین کشمیر سفر آخرت فرمودند۔ بندگان حضرت قریب بہ بیت کردہ ایں طرف آمدہ بودند۔ تا سفہا خوردند و گریہ ہا کردند۔[۵۵]

اس عبارت میں فیضی کا آخری جملہ اس حقیقت کا پتا دیتا ہے کہ اکبر کو میر فتح اللہ شیرازی بہت عزیز تھے اور اس کی وجہ ان کا علم اور جدت پسند ذہن تھا۔

حکیم ابوالفتح گیلانی جمعرات کی رات انیس شوال کو راہی ملک عدم ہوئے۔ بادشاہ کی آنکھیں اس حادثے سے چھلک اٹھیں اور حکیم ابوالفتح کو بادشاہ کے حکم سے باباحسن ابدال میں دفن کر دیا گیا۔ بہر حال چند روز سب نے ماتم کیا اور پھر یہ حادثے بھلا دیے گئے۔[۵۶]

عرفی شیرازی (۹۹۹ / ۱۵۹۱) سے فیضی کے نزدیکی تعلقات رہے ہیں۔ فیضی نے عرفی کے فن شاعری کو نہایت زبردست خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ اس نے طبقات اکبری کے مصنف نظام الدین احمد کو عرفی کے ہندستان آنے اور فن شاعری کے بارے میں بنیادی امور سے مطلع کیا ہے۔ فیضی نے لکھا ہے کہ عرفی اس کے یاران و ساز او رغم خواران ہمراز میں شامل ہے۔ اس کی صحبت سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ اس نے

اس ملک کے خاک نشینوں پر احسان کیا ہے کہ نوروز کے موقع پر ہندستان آیا ہے۔
فیضی کی نظر میں دوستی سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں، وہ اسی دوستی کی قسم کھا کر کہتا ہے کہ اس نے بلندی طبع، معنی آفرینی میں نہایت قدرت، الفاظ کی چاشنی، فکر کی سرعت اور دقت نظر میں عرفی کی مانند نہ کسی دوسرے کو دیکھا ہے اور نہ سنا ہے۔ تہذیب اخلاق کے بارے میں وہ کیا کہے، یہ تو عطیہ ہے خاک پاک شیراز کا جو عرفی میں موجود ہے۔ عرفی کے چھے شعر بھی فیضی نے نقل کیے ہیں جو اسے بوقت تحریر یاد تھے۔

فیضی وسیع تعلقات کا شخص تھا۔ بعض سیاسی اور ادبی حضرات سے اس کے گہرے تعلقات تھے۔ انشاے فیضی میں شامل فیضی کے متعدد خطوط اس کے احباب اور اقارب کی کثیر تعداد کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ان تعلقات میں، ظاہر ہے، اس کے درباری مقام نے بھی ایک بڑا کردار ادا کیا ہے، لیکن ادبی لوگوں سے اس کے تعلقات بالکل دوسری نوعیت کے تھے اور وہ صرف اس کی اپنی اور دوسروں کی ادبی و علمی حیثیت پر مبنی تھے وہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا ارادت مند، ابوالفتح شیرازی کا آشنا اور دیگر شعرا و ادبا کا گہرا دوست تھا۔ ملا عبدالقادر بدایونی صاحب منتخب التواریخ، فیضی اور اس کے بھائی ابوالفضل کے بعض نظریات سے شدید اختلاف رکھتا تھا، لیکن فیضی نے بدایونی سے اپنے تعلقات میں یہ نظریاتی اختلاف حائل نہیں ہونے دیا۔ اس نے بدایونی کی ضرورت کے وقت حتی المقدور مدد کی۔ اس کے پاس ایک بار بدایونی کے دو داماد آئے۔ بدایونی کی زبوں حالی کا ذکر کیا۔ فیضی جیسے تڑپ اٹھا۔ فوراً بادشاہ کی خدمت میں ایک عرضداشت لکھی۔ جو انداز فیضی نے بدایونی کی سفارش کے لیے اختیار کیا ہے، وہ فیضی کی علم دوستی کا ناقابل انکار ثبوت بھی ہے اور دوست نوازی اور آشنا پرستی کا عجیب و غریب نمونہ بھی۔ فیضی بادشاہ کی خدمت میں پہلے اظہار حقیقت کرتا ہے کہ:

عالم پناہا! در این ولا دو خویش ملا عبدالقادر از بداؤن مضطرب حال،
گریان و بریان رسیدند و اظہار نمودند کہ ملا عبدالقادر چند گاہ بیمار بود و از
وعدہ ای کہ بہ درگاہ داشتہ تخلف شدہ، و احسان بادشاہی بشدت تمام

بردہ اند تا ما قبتش بہ کجا انجامد...[58]

اب فیضی کے سفارشی کلمات ملاحظہ فرمائیے۔ وہ بدایونی کے تعارف میں اس کی علمی فضیلت کو بنیاد بنا کر اس کے حق میں چند خیر کے کلمات لکھتا ہے اور بادشاہ سے عرض کرتا ہے کہ بادشاہ یہ سمجھے کر وہ خود خدمت میں حاضر ہے اور بدایونی کے بارے میں اس طرح گویا ہے کہ :

> شکستہ نوازا! ملا عبدالقادر اہلیت تمام دارد و علوم رسمی آنچہ ملایان ہندوستان می خوانند، خوانده و پیش خدمت ابوی نیز کسب فضیلت کرده. قریب سی وہفت سال می شود کہ بندہ او را می دانم و با فضیلت علمی، طبع نظم و سلیقہ انشای عربی و فارسی و چیزی از نجوم ہندوی، حساب و یادداشت در ہر وادی وقوف وا ز نغمہ، ولایت ہندی و جزی از شطرنج صغیر و کبیر دارد و مشق بین وجتتر نیز بقدری کرده با وجود بہره مند بودن از ین ہمہ فضائل بہ بی طمعی و قناعت و کم تردد نمودن و راستی و درستی آداب و نامرادی و شکستگی و گذشتگی و بی تعینی وترک اکثر رسوم و درستی اخلاص و عقیدت بہ درگاه پادشاہی موصوف است[59]

اس کے بعد فیضی نے بدایونی کی فوجی خدمات کا ذکر بھی بادشاہ کی خدمت میں کیا ہے کہ وہ خود اپنی مرضی سے کوہ ملمیر[60] کی مہم پر گیا اور دوران مہم زخمی بھی ہوا اور بادشاہ سے اپنی خدمات کے صلے میں اس نے انعام بھی حاصل کیا۔ فیضی نے یہ اہم اطلاع بھی فراہم کی ہے کہ بدایونی کو سب سے پہلے جلال خان قورچی نے بادشاہ کی خدمت میں ان الفاظ میں متعارف کرایا تھا کہ :

"من امامی برای حضرت پیدا کرده ام کہ حضرت را خوش خواہد آمد"

اس کے علاوہ وہ بادشاہ کو یہ بھی یاد دلاتا ہے کہ بادشاہ کے دربار کا ایک اہم رکن شاہ فتح اللہ شیرازی بھی بدایونی کے بارے میں بادشاہ سے گفتگو کر چکا ہے۔ اب فیضی بادشاہ سے عرض کرتا ہے کہ :

> درین وقت کہ بی طالعی برو زور آورده، بنده خود را حاضر پایہ سریر والا دانستہ احوال او بہ عرض می رساند، اگر درین وقت بہ عرض نمی رساند، نوعی از

نا راستی و بی حقیقتی بود حق سبحانہ بندگان درگاہ را در سایۂ حضرت بر شاہراہ راستی و حق گزاری و حقیقت شناسی قدم ثابت کرامت فرماید

فیضی صاحب علم تھا۔ مطالعے کا اسے شوق تھا۔ خود اس کی ایک لائبریری تھی جس کا ذکر معاصر اور بعد کی کتابوں میں کیا گیا ہے۔ اس کتاب خانے کی عمارت آج بھی فتح پور سیکری میں جامع مسجد کے پہلو میں موجود ہے۔ حالانکہ اس کتاب خانے میں کتابوں کی ایک کثیر تعداد موجود تھی، لیکن فیضی وہ تمام کتابیں فراہم نہیں کر سکا تھا جن کی اسے وقتاً فوقتاً ضرورت پڑتی تھی اور جو ہندوستان کے گوشے گوشے میں بکھری ہوئی تھیں۔ اسے اگر کسی ایسی کتاب کی ضرورت ہوتی جو اس کے کتاب خانے میں موجود نہ ہوتی، تو وہ اپنے کسی معاصر عالم یا دانشور دوست سے مطلوبہ کتاب کی فراہمی کی خواہش کرتا اور اس طرح اپنے ذوق مطالعے کو تسکین پہنچاتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس ضمن میں فیضی کی تحریریں اس کی علم دوستی اور پیہم دانشورانہ کوششوں کا پتا دیتی ہیں۔

ایک بار فیضی کو طبّی کتابوں کے مطالعے کا شوق پیدا ہوا۔ اس نے طبی اور دیگر فنون پر کتابیں حاصل کرنے کے لیے حکام دکن کے منشی مولانا عبداللطیف دبیر کو لکھا:

"بندہ را در این ایام القیام خاطر بہ مطالعۂ کتب طبیّہ واقع است و فراوان بہم رسیدہ، لطف نمودہ از کتب طب مثل قانون و شروح آن و دیگر مبسوطات این فن و دیگر فنون حکمت از کتاب خانۂ معلیٰ جناب مرزی خطاب ادام اللہ افضالہ چندی فرستند و آنچہ در آن بلاد کہ موطن ناز و نعم و مقر فضلای ہفت اقلیم است، بہم رسد، بہ جمع و ارسال آن مخلص را ممنون سازند"

یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ فیضی کتاب عاریتاً حاصل کرنا اور مطالعہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ مطلوبہ کتاب خرید کر پڑھنا بہتر سمجھتا تھا، چونکہ اس طرح وہ اپنے کتاب خانے کی تکمیل بھی کر سکتا تھا۔ اس کے علاوہ فیضی صاحب حیثیت شخص تھا۔ اسے کتاب کی قیمت کی پروا نہیں تھی۔ وہ ہر قیمت پر مطلوبہ کتاب خریدنا اور اسے حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اسے یہ علم تھا کہ احمد نگر میں جتنی معمولی کتابیں بھی گراں قیمت پر دستیاب ہوتی ہیں، اسی وجہ سے اس نے مولانا عبداللطیف دبیر کو لکھا تھا کہ:

از کتب حکمیہ باقی ماندہ آنچہ بہم رسد، بوجہت فقیر بگیرند و بہر بہائی کہ باشد از دست ندہند و بی تکلفانہ این طریق الیق راسلوک دارند[۱۶]

شیخ حسن کالپی بھی فیضی کے دوست تھے۔ فیضی نے انھیں بھی اپنی ضرورت کی کتابیں ارسال کرنے کے لیے لکھا کہ :

" چوں تشریف آرند، در ذکر احوال مشائخ ہند آنچہ داشتہ باشند، از ملفوظات وغیرہا ہمراہ آرند، البتہ البتہ بدست عزیزی کتابی در احوال مشائخ ہند بود، موسوم بہ تذکرۃ الاصفیا، اگر در آن شہر بہم رسد، بہم رسانند کہ بسیار مطلوب است[۱۷]

انہی شیخ حسن کالپی نے فیضی کو میر ہزارہ کے ہاتھ سعید ہروی کا دیوان ارسال کیا۔ فیضی کو اس کی اطلاع ہوئی۔ فیضی کے لیے کتاب کسی نعمت سے کم نہیں تھی۔ اس نے اطلاع پاتے ہی ایک شخص کو خواجہ حیدر علی کے گھر جہاں میر ہزار مقیم تھے، بھیجا کہ وہ کتاب حاصل کرے اور فیضی کو پہنچا دے :

" دراجمیر از جناب سیّد یعقوب شنیدم کہ مصحوب میر ہزارہ دیوان سعید ہروی فرستادہ اند، ہمان لحظہ بہ منزل خواجہ حیدر علی رفتہ استفسار کردہ شد[۱۸]

شیخ حسن ہی کو مقاصد الشعرا اور دیگر کتابوں کی فراہمی کے لیے مزید لکھا کہ :

" دیگر آن کہ کتاب مقاصد الشعرا را البتہ البتہ چون تشریف آرند ہمراہ آرند کہ اختتام تذکرہ موقوف بہ آن ماندہ و از کتب دیگر ہم آنچہ توانند استنباط فرمایند ..[۱۹]

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیخ حسن کالپی سے فیضی کے تعلقات نہایت بے تکلفانہ تھے۔ وہ انھیں باربار اپنی مطلوبہ کتابیں حاصل کرنے کے لیے لکھنے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتا تھا۔ شیخ حسن کالپی کا اپنا کتاب خانہ بھی رہا ہوگا جہاں سے ایک بار فیضی نے طبقات ناصری عاریتاً حاصل کی تھی۔ فیضی یہ کتاب واپس کرنا بھول گیا۔ شیخ حسن نے تقاضا کیا تو تلاش شروع ہوئی۔ فیضی کے ایک دوست نے جو ان کے ساتھ ہی رہائش پذیر تھے، یاد دلایا کہ ابوالفضل ایک بار فیضی

کے گھر رہ گئے تھے اور طبقات ناصری اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ ابوالفضل نے وہ کتاب واپس نہیں کی۔ ابوالفضل کی کتابیں دو تین جگہ منتشر تھیں۔ فیضی نے ایک صاحب ابوالخیر کو ابوالفضل کے گھر بھیجا کہ وہ کتاب تلاش کریں، لیکن وہ ناکام رہے۔ فیضی کو تشویش ہوئی۔ بہرحال اس نے حسن کابلی سے وعدہ کیا کہ وہ خود کتاب تلاش کرے گا اور انھیں ارسال کرے گا۔ اسی کے ساتھ فیضی نے یہ اعتراف کیا کہ وہ کتاب حالانکہ ضائع نہیں ہوگی، لیکن ضرورت کے وقت کتاب کا دستیاب نہ ہونا ایسا ہی ہے جیسے وہ کتاب ضائع ہوگئی ہو۔[68] کسی صاحب سے فیضی نے کتابیں ارسال کرنے کو کہا ہوگا۔ انھوں نے چند ناقص کتابیں بھیج دیں۔ فیضی کو ناگواری ہوئی۔ اس نے کتابیں واپس کردیں اور مکمل کتابیں جو فاتحہ اور خاتمہ سے آراستہ ہوں، ارسال کرنے کی خواہش کی اور یہ دلچسپ جملہ لکھا کہ:

"چہ این مجلدات مصاحبان قدیم آن افاضت مآب خواہند بود و مارا در کار نہ، پس اگر بمسکن مالوف باشند، بہتر است۔"[69]

فیضی کے کتب خانے میں خسرو کے "تغلق نامہ" کا ایک ناقص الطرفین نسخہ رہا ہوگا۔ خاندیش کے والی راجی علی خاں فاروقی کے کتاب خانے میں اس کا مکمل نسخہ موجود تھا۔ فیضی نے اپنے نسخے کو مکمل کرنے کے لیے والی خاندیش کو لکھا:

"بہ موجب ضرورت استدعا می نماید کہ از کتاب تغلق نامہ کہ از انفاس مقدسۂ امیر خسرو است، چند ورق از اوّل و چندی از آخر رفتہ، التفات نمودہ دو جز از اول و ہمیں قدر از آخر بہ یکی از خدمتگاران امر فرمایند کہ بہ خطی مستوہ نموہ بہ جہت بندہ مصحوب حاملان عریضہ فرستند۔"

فیضی کتاب کا مطالعہ کرتا اور قابل مطالعہ کتاب کے مطالعے کے لیے اپنے احباب سے سفارش کرتا تھا۔ ایک بار فیضی نے شیخ فریدالدین عطار کے "مصیبت نامہ"[70] کا مطالعہ کیا۔ عطار کی یہ کتاب فیضی کو پسند آئی چونکہ اس میں متعدد "اذواق و مواجید" مندرج ہیں۔ اس لیے اس نے یہ کتاب اپنے چھوٹے بھائی ابوالفضل کو بھیجی کہ وہ اس کا مطالعہ کرے۔[71] اسی ضمن میں اس نے عطار کے مصیبت نامے سے یہ بیت بھی نقل کیا ہے:

گر دلی لی بایدت بسیار دان   رو معیت نامۂ عطار خوان ۳۳؎

علما اور علم دوست اچھی کتابیں خود خریدتے اور پھر صاحبانِ ذوق اور کتابوں کے شائقین کے پاس بھیج دیتے کہ وہ کتاب خرید لیں۔ ایک بار فیضی نے میاں ہیبت خان کے پاس ایک سیوڑے ۳۴؎ کو بھیجا جو ہندی کی ایک کتاب فروخت کرنا چاہتا تھا۔ ہیبت خاں نے کتب خرید لی۔ اس کا مطالعہ کیا اور فیضی کو کتاب کے مفید اور مناسب ہونے کی اطلاع دی ۳۵؎

انشائے فیضی کے مشمولات سے اس دلچسپ حقیقت کا احساس بھی ہوتا ہے کہ مغلوں اور صفوی بادشاہوں کے درمیان دوستانہ تعلقات کے باوجود یہ دونوں حکومتیں ایک دوسرے پر مکمل اعتماد نہیں کرتی تھیں بلکہ ایک دوسرے کے حالات کی ٹوہ میں لگی رہتی تھیں۔ فیضی ایران سے آنے والے ہرکس وناکس سے ملاقات کرتا اور ایران اور صفوی بادشاہوں کے کوائف دریافت کرتا۔ فیضی یہ اطلاعات عرضداشت کی شکل میں بادشاہ کو ارسال کر دیتا جس کی بنیاد پر مغل حکومت ایران کے بارے میں اپنی پالیسی مرتب کرتی ہوگی۔ یہ اطلاعات سیاسی اور سماجی اعتبار سے نہایت اہمیت کی حامل ہیں، لیکن ہمارے مضمون کے دائرے سے خارج۔ اس لیے صرف ان علما اور دانشمندوں کا ذکر کیا جا رہا ہے جو ایران میں فیضی کے معاصر ہیں اور جن کے بارے میں فیضی نے ایران سے ہندستان آنے والوں سے سنا اور ان میں سے بعض کے احوال کی تصدیق خود ان سے وابستہ ایسے حضرات سے ہوئی جو پہلے ہی سے ہندستان منتقل ہو چکے تھے۔

یہ عرض کر دینا بھی ضروری ہے کہ فیضی صرف ہندستان میں صاحبانِ علم وادب کے احوال و کوائف سے مطلع رہنے کا خواہش مند نہیں تھا، بلکہ وہ ایران میں علمی وادبی فضا سے بھی مکمل واقفیت کا خواہش مند تھا۔ فیضی نے ایران سے ہندستان آنے والے حضرات کے بارے میں اطلاعات فراہم کیں۔ یہ اطلاعات انشائے فیضی میں مختصر ہیں، لیکن چونکہ مطلع حضرات سے فراہم کی ہیں اور انھیں فیضی نے قلم بند کیا ہے، اس لیے قابلِ توجہ ہیں۔

میر تقی الدین محمد مشہور بہ تقیا نسابہ کا شمار عراق و فارس کے معروف ترین دانشوروں

میں ہوتا ہے۔ ان کے استاد میر فتح اللہ شیرازی جو اپنے دور کے معروف دانشمند، عالم اور مختلف فنون کے ماہر تھے، پہلے ہی ہندستان آچکے تھے۔ میر فتح اللہ نے بھی میر تقی الدین محمد کے صاحب علم و فضل ہونے کی شہادت دی تھی۔ فیضی نے تقیا نسابہ کے بارے میں لکھا ہے:

سرآمد دانش مندان عراق و فارس میر تقی الدین محمد است کہ مشہور بہ تقیا نسابہ است و بہ دانش مندی او امروز در ولایت کسی نیست۔ از شاگردان میر فتح اللہ است۔ وقتی کہ میر فتح اللہ و مولانا مرزا جان در شیراز کوس دانشمندی می زدند، او نیز یکی از مدرسان مشہور شیراز بود، بندہ مدتی است کہ صیت کمالات اومی شنود

فیضی کے سامنے ہی ملا محمد رضائی ہمدانی شیراز سے ہندستان آئے اور فیضی سے ملاقات کی۔ فیضی نے ان کے بارے میں اپنے تأثرات کا ان الفاظ میں اظہار کیا ہے:

ملا محمد رضائی ہمدانی از شیراز می رسد و از دماغ سوختہ ہای مدرسہ است وجوہر فضیلت و اہلیت از وظاہر

انہی ملا محمد رضائی نے فیضی کو مطلع کیا کہ مذکورہ بالا میر تقی الدین محمد تقیا نسابہ اکبر بادشاہ کے دربار میں حاضر ہونے کا آرزو مند تھا، لیکن زادراہ میسر نہ ہونے کی وجہ سے وہ ہندستان کا سفر کرنے سے قاصر رہا ورنہ وہ اسی قافلے کے ہمراہ ہندستان جو فیضی کے بقول مغناطیس قلوب ارباب فطرت عالیہ ہے، آتا جس سے محمد رضائی پہنچے تھے۔ جب فیضی کو اس صورت حال کا علم ہوا تو وہ بے چین ہو گیا۔ وہ صاحب علم شخص تھا۔ اس کی آرزو تھی کہ اس کے دور میں ہندستان علم و فضل کا ایک عظیم مرکز بن کر ابھرے۔ اکبر میر فتح اللہ شیرازی کا مداح تھا۔ اس لیے فیضی نے میر تقی الدین محمد کے بارے میں میر فتح اللہ کے حوالے سے اکبر کو لکھا اور سفارش کی کہ:

اگر فرمان عالیشان بہ انعامی بہ طلب او برود، سرفرازی است، یادگار میر فتح اللہ و فرزند معنوی ایشان است

فیضی کو قاضی زادۂ ہمدان کے بلند علمی مرتبے کے بارے میں غالباً محمد رضائی ہمدانی نے جو قاضی زادہ کے قرابت دار تھے، اطلاع دی کہ:

دیگر قاضی زادۂ ہمدان است کہ ابراہیم نام دارد و بہ پایۂ دانشمندی است کہ
شفا درس می گوید و بہ شرح اشارات حاشیہ نوشتہ و ترقیات عظیمش رو دادہ
و دربار دوی شاہ است [۳۲]

فیضی نے شیخ بہاء الدین اصفہانی کے بارے میں بادشاہ کو لکھا کہ:

در بعلبک متولد شدہ و ہفت سالہ ہمراہ پدر بہ ہرات آمدہ و پیش پدر
خود و ملا عبداللہ یزدی تحصیل نمودہ ، در جمیع علوم تبحری تمام دارد و ممتاز
است۔ در اصفہان می باشد [۳۳]

فیضی نے چلپی بیگ کے بارے میں بادشاہ کو مطلع کیا کہ یہ صاحب علم شخص بادشاہ کی مجلس سے وابستہ ہونے کے قابل ہے اور اگر بادشاہ اس پر نظر التفات ڈالیں تو بجا ہے۔ فیضی کی اصل عبارت یہ ہے:

دیگر از مستعدان صاحب فطرت عالی و مشرب والا کہ لائق مجلس اشرف
تواند بود، چلپی بیگ است۔ در شیراز و قزوین تحصیل کردہ و در این دوازدہ
سال اورا ترقیات عظیم رو نمودہ واز وہمہ جائی گویند و حالا در شیراز است
اگر ذرّہ ای توجہ عالی بہ جانب او ہم شود، بجای خود است [۳۴]

دوسرے ممالک اور خاص طور پر ایرانی علما و فضلا کے احوال کی جستجو میں رہنا اور انھیں اکبر کی خدمت میں متعارف کرانا، اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ خود اکبر بھی آرزومند تھا کہ اسے علما و فضلا کے بارے میں اطلاعات فراہم کی جائیں تاکہ وہ اگر مناسب سمجھے تو ان اہل علم کو اپنے دربار سے وابستہ ہونے کی دعوت دے اور ان کی سرپرستی کرے۔

فیضی نے ہندستان کے مختلف علاقوں کا سفر کیا تھا۔ وہ اپنے سماج سے متعارف تھا۔ اسے سماج میں رائج اچھی اور بری روایات کا احساس تھا۔ اس نے سماج سے متعلق ایک عمومی دلچسپ اور تاریخی نوعیت کا اپنا مشاہدہ بیان کیا ہے جس کی تائید و تصدیق کی چنداں ضرورت نہیں چونکہ یہ صورت حال آج بھی دیکھنے میں آتی ہے۔ وہ کہتا ہے:

دنیا میں ہر جگہ لوگوں نے اپنا اپنا معبود بنا لیا ہے۔ خدا سے غافل ہیں اور اسی

خود ساختہ معبود کی طرف متوجہ ہیں۔
دکن میں دلاور الملک کی پوجا ہوتی ہے۔ یہ دلاور الملک کے لقب سے مشہور ہے۔ دلاور الملک گجرات میں ایک سپاہی تھا اور وہیں کسی جنگ میں مارا گیا بیس تیس جگہ اس کی قبریں بنی ہوئی ہیں اور لوگ جوق درجوق وہاں جاتے ہیں۔

فیضی نے اپنے دور میں رائج اسی نوعیت کی ایک اور بے راہ روی کی مثال پیش کی ہے۔ فیضی کی یہ اطلاع اس لیے بھی اہم ہے کہ اس سے علم ہوتا ہے کہ بعض نام نہاد اور کاروباری قسم کے صوفیوں نے اپنی دوکانداری چمکانے کے لیے کیسی کیسی بے بنیاد اور مضحکہ خیز باتیں کہیں اور عوام کو اپنے فریب کے جال میں پھنسانے کی کوشش کی۔ فیضی کو راجی علی خاں والی خاندیش کے عرایض نویس ملا عبداللطیف بربری نے سنایا کہ:

میر سید محمد گیسو دراز کی اولاد میں ایک شخص حضرت اللہ تھا۔ یہ ایک سال پہلے برہان پور آیا۔ برہان پور پہنچنے کے بعد اس کا خادم میرے پاس آیا اور اطلاع دی کہ حضرت اللہ تشریف لائے ہیں۔ آپ کو دعا کہی ہے اور دریافت فرمایا ہے کہ وہ کہاں قیام کریں۔ میں نے جواب دیا کہ بہت خوشی کی بات ہے کہ وہ تشریف لائے ہیں اور ہم سب کے لیے صفا و پاکی کا پیغام لائے ہیں وہ اپنے گھر ہی میں قیام کریں۔ ملا عبداللطیف ان سے ملنے گئے تو حضرت اللہ نے پوچھا کہ کیا آپ جانتے ہیں کہ میں کون ہوں؟ پھر خود ہی اپنا تعارف اس طرح کرایا کہ حضرت مریم کو عرش پر لے جایا گیا۔ وہاں حضرت سید محمد گیسو دراز کو لایا اور ان سے ان کا نکاح کرایا گیا۔ میں اسی شادی کا نتیجہ ہوں۔

ملا عبداللطیف نے ظاہرہے شوخی سے کام لیا اور پوچھا:

تعجب کی بات ہے کہ آپ یورپ کیوں تشریف نہیں لے گئے؟ حضرت اللہ نے جواب دیا:

وہ علاقہ ہمارے بھائی یعنی حضرت عیسیٰ کی قلمرو ہے۔ ہمیں معلوم نہیں کہ وہاں کے لوگ ہمارے ساتھ مناسب برتاؤ کریں گے یا نہیں۔

طبقات اکبری کے مصنف خواجہ نظام الدین احمد نے بھی فیضی سے "عیسیٰ کے اس بھائی" کا نام بار بار سنا تھا۔ غالباً یہ گجرات بھی گئے تھے۔

فیضی کے مکتوبات اپنے انداز بیان اور اسلوب نگارش کے لحاظ سے بھی فارسی ادب کی تاریخ میں ایک ممتاز مقام کے حامل ہیں۔ ان کی زبان شگفتہ، بیان سادہ اور انداز دلکش ہے۔ ان کے ایک ایک جملے سے مکتوب الیہ سے فیضی کے پرخلوص تعلقات کا احساس ہوتا ہے۔ فیضی کے بعض خطوط سے جن میں مکالمے کا انداز اختیار کیا گیا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مکتوب الیہ ان کے روبرو ہے اور وہ اس سے بے تکلفانہ گفتگو کر رہا ہے۔ انداز بیان کی بے ساختگی نے فیضی کے مکتوبات کو پرکشش بنا دیا ہے۔ اسی طرح فارسی کے مختلف شعرا اور خود فیضی کے اپنے اشعار کی پیوندکاری نے مکتوبات فیضی کی نثر میں جاذبیت پیدا کر دی ہے۔

آخر میں فیضی کا ایک خط ملاحظہ کیجئے جو ایک عالم (نام درج نہیں) کے نام ہے۔ فیضی سے اس کی خیریت معلوم کی گئی ہوگی۔ فیضی نے اپنی خیریت لکھی ہے۔ یہ خط چھے سطروں پر مشتمل ہے۔ دو سطروں میں مکتوب الیہ کے لیے تعظیمی کلمات ہیں اور پھر فیضی نے اپنی خیریت ان الفاظ میں لکھی ہے کہ :

سخن ہمان است کہ از یکی پرسید ند کہ چونی؟ گفت: چنانچہ میدارند۔
گفت: چون میدارند؟ گفت: چنانچہ می خواہند گفت چون می خواہند؟
گفت: چنانچہ می باید۔ احوال خود زیادہ برین چہ نویسد و از حالات
ایشان چہ پرسد؟

حواشی

۱۔ فیضی نے اپنے ایک خط میں لکھا ہے کہ اس نے ایک غیبی اشارے پر فیاضی تخلص بھی اختیار کیا ہے اور وہ اب دونوں فیضی اور فیاضی تخلص سے کام لے گا۔ انشائے فیضی، ۱۹۔ اس کے برخلاف رحمان علی کا خیال ہے کہ، ابوالفضل کہ وی را علامی می نوشتند، بہ غرض تعلی از ان وزن تخلص فیاضی اختیار نمودہ۔ تذکرۂ علمائے ہند، نولکشور، ص ۳۔ رحمان علی

یہ بات بدایونی سے نقل کی ہے، منتخب التواریخ، ج ۳: ۲۹۹

۱۔ مآثرالامرا، شاہنوازخان، ج ۲، کلکتہ ۱۸۸۸ء-۱۹۰۳ء، ص ۵۸۴

۔ معارف، ستمبر، ۱۹۳۰ء

۔ انشائے فیضی، مرتبہ اے۔ ڈی۔ ارشد، مجلس ترقی ادب، لاہور، اکتوبر ۱۹۷۲ء، ص ۴۹

۔ آئین اکبری، انگریزی ترجمہ بلاخ مین، ج ۱، کلکتہ ۱۹۲۷ء، دیباچہ، ص ۳۴ ۔ یہی بات تقی الدین محمد کاشانی نے اپنے تذکرے "خلاصۃ الاشعار" میں لکھی ہے۔ اک: مقدمۂ انشائے فیضی، ص ۱۰

۔ منتخب التواریخ، ج ۳، کلکتہ ۱۸۶۹ء، ۲۹۹ بہ بعد، بدایونی نے فیضی کی شاعری کو نہایت غیر موثر قرار دیا ہے۔

۔ ایضاً، ج ۳، ص ۲۹۹ ۸۔ انشائے فیضی: ۷۰

۔ ایضاً: ۷۱ ۱۰۔ ایضاً: ۷۱

۔ ۱۸۶ ۱۲۔ ایضاً: ۱۷۷، فیضی کے دیوان کے تین مختلف نسخے دستیاب ہیں۔ دیوان کا پہلا نسخہ فیضی کی زندگی میں ۹۹۵ میں مرتب ہوا۔ اس میں چھ ہزار سے زیادہ اشعار ہیں۔ دوسرا نسخہ فیضی کی زندگی ہی میں تیار ہوا جس میں نو ہزار سے زائد اشعار جمع کیے گئے ہیں۔ تیسرا نسخہ فیضی کی وفات کے بعد مرتب ہوا۔ اس میں دس ہزار اشعار ہیں۔ تفصیل کے لیے اک: مقدمۂ انشائے فیضی ص ۳۴-۳۶

۔ انشائے فیضی: ۲۴۷۔ جب فیضی کے دیوان کا دوسرا نسخہ تیار کیا گیا اور اس میں زیادہ اشعار تھے تو اس قطعے کے آخری مصرعے میں اسی کے مطابق تبدیلی کر دی گئی، یعنی، کوسی بہ نہ فلک زدہ این نہ ہزار بیت۔

۔ انشائے فیضی: ۲۴۷، یہی بات فیضی نے ایک دوسری جگہ بھی لکھی ہے کہ: وقتی کہ نصاب می خواندم، آن قدر از گنج الہٰی نصیب بردہ بودم کہ ہر گرسنہ چشمان سخن زکوۃ می دادم۔

ایضاً: ۲۴۸ ۱۶۔ ایضاً: ۱۰۹ ۱۷۔ ایضاً: ۲۹۲

ایضاً: ۳۱۹ ۱۹۔ ایضاً: ۱۹۷

۲۰۔ نظامی کے خمسے کی یہ تیسری مثنوی ہے جو ۵۹۴ھ میں مکمل ہوئی۔ ۲۱۔ انشائے فیضی: ۱۹۷

۲۲۔ نظامی کے خمسے کی چوتھی مثنوی جو ۵۹۳ھ میں پایۂ تکمیل کو پہنچی ۲۳۔ انشائے فیضی: ۱۹۷

۲۴۔ ایضاً ۲۰۸ ۲۵۔ ایضاً: ۱۸۱ ۲۶۔ ایضاً: ۲۱۹

۲۷۔ منتخب التواریخ، ج ۳، ۱۱۹ ۲۸۔ انشائے فیضی: ۱۸۸ ۲۹۔ ایضاً: ۱۹۵۔
اس کے برخلاف بدایونی نے اس تفسیر کے بارے میں لکھا ہے کہ، تفسیر بی نقط برای شستن بدنامی کہ تا روز جزا بہ صد آب دریا شستہ نگردد، درعین حالت مستی وجنابت می نوشت۔ وسگان راز ہر طرف پائمال می ساختند تا برہمان انکار واصرار واستکبار والولد بمستقر اصلی شتافت و بہ حالتی رفت کہ کس مبیناد وشنواد۔ منتخب التواریخ، ج ۳، ۳۰۰

۳۰۔ انشائے فیضی: ۲۱۳ ۳۱۔ ایضاً: ۲۷۵ ۳۲۔ ایضاً: ۲۷۸

۳۳۔ ایضاً: ۲۰۲ ۳۴۔ ایضاً ۲۰۷ ۳۵۔ ایضاً: ۲۰۲

۳۶۔ ایضاً، ۲۰۳ ۳۷۔ ایضاً ۲۱۲ ۳۸۔ منتخب التواریخ، ج ۲: ۱۳۹

۳۹۔ انشائے فیضی، ۲۱۲ ۴۰۔ ایضاً، ۲۱۹ ۴۱۔ ایضاً، ۱۱۲

۴۲۔ انشائے فیضی: ص ۱۱۲، حاشیہ ۴۳۔ ایضاً، ۱۱۵ ۴۴۔ ایضاً، ۱۱۶،
فیضی اکبر کے لڑکے مراد کا اتالیق بھی تھا، اکبر نامہ: ابوالفضل، ج ۲، ببلیوتھیکا، ۳۱۱

۴۵۔ ایضاً: ۱۳۵ ۴۶۔ ایضاً: ۱۸۳ ۴۷۔ ایضاً: ۱۳۶۔

۴۸۔ ایضاً: ۱۸۲ ۴۹۔ ایضاً: ۱۸۶ ۵۰۔ ایضاً: ۲۲۹

۵۱۔ ایضاً: ۲۲۹ ۵۲۔ ایضاً: ۱۳۹ ۵۳۔ ایضاً: ۸۵

۵۴۔ ایضاً ۱۴۲ ۵۵ ایضاً: ۲۷۴، فیضی نے میر فتح اللہ شیرازی اور حکیم ابوالفتح گیلانی کی وفات پر جو ایک ساتھ ہی ہوئی تھی، ایک دردناک مرثیہ لکھا تھا جس کا مطلع ہے،

دگر ہنگام آن آمد کہ عالم از نظام افتد جہان عقل را در نیم روزی ظلم شام افتد

منتخب التواریخ، ج ۲: ۳۶۹

۵۷۔ انشائے فیضی: ۲۹۱ ۵۸۔ ایضاً: ۱۵۱ ۵۹۔ ایضاً: ۱۵۷، ۱۵۸۔

۶۰۔ ایضاً: ۱۸۵، اروَلی پہاڑوں میں جانب شمال، اودے پور سے ۴۰ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ اکبر کے عہد میں راناکیکاؤس اس پر حکومت کرتا تھا۔

۶۱۔ ایضاً: ۱۵۹، یہ خط بدایونی نے بھی اپنی منتخب التواریخ، ج ۲، ص ۴۰۲ پر نقل ہے۔

۶۲۔ فیضی کا کتب خانہ ایک خاص حیثیت واہمیت کا حامل تھا۔ بدایونی کے بقول فیضی کی وفات پر اس میں ۴۶۰۰ کتابیں موجود تھیں، منتخب التواریخ، ج ۳، ۳۰۵؛ بلاخ مین نے اطلاع دی ہے کہ ۴۳۰۰ قلمی نسخے تھے، آئین اکبری، انگریزی ترجمہ، ج ۱؛ ۵۸۴؛ ان میں سے بیشتر خود مصنفین کے اپنے ہاتھ سے یا ان کے اہتمام میں کتابت کیے گئے تھے۔ اکبر نے فیضی کی وفات کے بعد اس کا کتب خانہ، شاہی کتب خانے میں داخل کر لیا تھا۔

۶۳۔ انشائے فیضی: ۱۹۰ ۶۴۔ ایضاً: ۱۹۰ ۶۵۔ ایضاً: ۲۱۸۔ فیضی نے شیخ حسن کالپی کی وفات پر ایک دردناک مرثیے میں اپنے دلی افسوس اور دکھ کا اظہار کیا ہے۔ مرثیے کا مطلع ہے:

بیا تاکنیم از فلک داد خواہی نویسیم بر خون انجم گواہی

۶۶۔ انشائے فیضی: ۲۲۹ ۶۷۔ ایضاً: ۲۳۱ ۶۸۔ ایضاً: ۲۳۵

۶۹۔ ایضاً: ۱۸۸ ۷۰۔ ایضاً: ۲۹۷ ۷۱۔ عطار سے تقریباً ایک سو نوے (۱۹۰) آثار منسوب ہیں، لیکن اسرار نامہ، بلبل نامہ، پند نامہ، خسرو نامہ، مختار نامہ، شتر نامہ، مصیبت نامہ، منطق الطیر، نزہت الاحباب، دیوان، تذکرۃ الاولیا بہرحال عطار کی تصانیف شمار کی جاتی ہیں جن کا ذکر خود عطار کی کتابوں میں ملتا ہے۔ مصیبت نامہ بحر رمل مسدس مقصور میں عطار کی ایک شاہکار مثنوی ہے جو تقریباً ۷۰۰۰ ابیات پر مشتمل ہے۔ عطار نے اپنی اس گہری عارفانہ مثنوی میں ایک سالک کی منزل مقصود تک رسائی کے لیے سعی و تلاش کی روئداد بیان کی ہے اور اس سلسلے میں ہر قدم پر

اس کی راہنمائی کی ہے۔ یہ مثنوی شائع ہو چکی ہے۔ ڈاکٹر نورانی وصال نے اسے مقدمہ، تراجم اعلام، بعض لغات و اصطلاحات کے معنی کے ساتھ انتشارات زوّار سے ۴۷-۱۳۴۶ش میں شائع کیا ہے۔

۷۲۔ انشائے فیضی: ۲۱۷ ۷۳۔ مصیبت نامۂ عطار مرتبہ نورانی وصال، ص ۳۶۲ پر اس بیت کا دوسرا مصرع اس طرح نقل ہوا ہے، پس مصیبت نامۂ عطار خوان ۷۴۔ ہندو فقرا کا ایک فرقہ یہ لوگ منہ پر کپڑا باندھے رہتے اور ہاتھ میں جھاڑو پکڑے رہتے ہیں۔ انشائے فیضی: ۲۱۷، حاشیہ

۷۵۔ انشائے فیضی: ۲۱۷ ۷۶۔ ایضاً: ۱۲۳، ۷۷۔ ایضاً: ۱۲۳

۷۸۔ ایضاً: ۱۲۳ ۷۹۔ ایضاً: ۳۰۸ ۸۰۔ ایضاً: ۱۲۴

۸۱۔ ایضاً: ۱۲۴ ۸۲۔ ایضاً: ۱۲۴ ۸۳۔ ایضاً: ۱۲۴

۸۵۔ ایضاً: ۱۲۴ ۸۶۔ ایضاً: ۱۲۸۔ دکن میں داورالملک کو جو درحقیقت دلاورالملک ہے، داول پیر کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ متعدد مقامات پر ان کے نام کے چبوترے اور قبریں بنائی گئی ہیں۔ داورالملک نصیرالدین چراغ دہلی کے مرید تھے۔ علوم دینی و دنیوی میں مہارت رکھتے تھے۔ مرشد کے حکم سے دکن آئے اور مقبولیت حاصل کی۔ ۸۲۵/۲۲-۱۴۲۱ میں فوت اور گلبرگہ میں دفن ہوئے۔ انشائے فیضی: ۱۲۸، حاشیہ، شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے بھی ایک داورالملک کا ذکر کیا ہے جو اس بیان سے مختلف ہے۔ اک، اخبارالاخیار، کتب خانۂ رحیمیہ، دیوبند، ص ۱۶۸

۸۷۔ انشائے فیضی: ۱۳۱ ۸۸۔ ایضاً: ۱۳۹

۸۹۔ ایضاً: ۱۸۲

پروفیسر نذیر احمد

ہندوستان میں کتبہ شناسی اور ہریانہ اسٹیٹ کے کچھ قدیم کتبے

اسلامی تہذیب کا ایک مخصوص شعبہ کتبہ شناسی ہے جو Epigraphy کہلاتا ہے، ہندوستان میں اسلامی دور کے ہزاروں لاکھوں کتبے محلوں، عام عمارتوں، مسجدوں، عبادتگاہوں، مقبروں، کنووں، پلوں دروازوں وغیرہ پر پائے جاتے ہیں، ان کتبوں کا خاص مقصد یادگار باقی رکھنا ہوتا ہے، اپنی نوعیت اور کثرت کی وجہ سے کتبہ شناسی ایک فن بن چکا ہے جو علم باستان شناسی یعنی آرکیالوجی کی ایک شاخ ہے یہ کتبے تاریخی، تہذیبی، فنی اور ادبی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں، لیکن عام لوگوں کو ان سے دلچسپی نہیں ہوتی، البتہ وہ حضرات جن کا تعلق تاریخ یا تہذیب سے ہوتا ہے وہ اس فن کے دل دادہ ہوتے ہیں، اردو میں اگرچہ سرسید احمد خاں کی آثار الصنادید اس فن کی بنیادی کتابوں میں شمار ہوتی ہے، لیکن اس زبان میں کتبہ شناسی سے متعلق مواد کی کمی ہے، ضرورت ہے کہ اردو ادب کے دامن کو اسلامی تہذیب کے اس اہم شعبے کے بیان سے مالا مال کیا جائے۔

ہندوستان کے طول و عرض میں اتنے سارے کتبات پھیلے پڑے ہیں کہ ان کا احاطہ کرنا نہایت مشکل کام ہے، اور باوجود اس کے حکومت ہند Epigraphy

کے شعبے کے بیسیوں دانشور اس کام میں مشغول ہیں لیکن یہ کام ابھی اتمام کو نہیں پہنچا ہے، سر سید احمد کی آثار الصنادید کے علاوہ ہندوستانی کتبہ شناسی پر علی اصغر حکمت کی فارسی کتاب "نقش پارسی بر احجار ہند" بڑی اہم کتاب ہے، محکمہ باستان شناسی کا رسالہ
Epigraphia Indica اور Epigraphia Indo moslemica
عربک اینڈ پرشین سپلیمنٹ میں اس فن کے تعلق سے برابر مقالے شایع ہوتے رہتے ہیں اور اگر کوئی صاحب اس فن کی وسعت و گیرائی کا اندازہ لگانا چاہتے ہوں تو وہ Pearson کی کتاب Indexe Moslemica کی جلدوں پر نظر ڈالیں جہاں کئی ہزار کتبات پر لکھے گئے مقالات کے عنوان درج ہوئے ہیں۔ یہ کتبے تاریخ و تہذیب کے بنیادی منابع ہیں جن کو نظر انداز کرکے کسی ملک کی تاریخ و تہذیب کا مطالعہ ناقص رہتا ہے۔

ہندوستان میں ابتدائی دور کے سارے کتبے عربی زبان میں ملتے ہیں، لیکن چھٹی صدی سے فارسی میں کتبے لکھنے کا رواج شروع ہوا، اور نویں صدی تک نوبت یہاں تک پہنچی کہ سارے تاریخی کتبے کی زبان فارسی ہوگئی، فارسی کتبوں کی ایک قابل وصف خصوصیت منظوم کتبے ہیں جن میں بعض ادبی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔

ہندوستان میں فارسی کا سب سے قدیم کتبہ قطب مینار پر ہے جس کی تاریخ ۵۸۷ھ ہے، قطب الدین ایبک (۶۰۲-۶۰۷) نے یہ مینار اور مسجد اپنے آقا معز الدین محمد بن سام (م ۶۰۲) کے نام پر تیار کرائی، کتبہ اس طرح شروع ہوتا ہے:

این حصار را فتح کرد و این مسجد جامع را ساخت بتاریخ فی شہور سنہ سبع وثمانین وخمسمائۃ امیر اسفہسالار اجل کبیر قطب الدولہ والدین امیر الامراء ایبک سلطانی اعزہ اللہ انصارہ۔ خدای عز وجل بر آن بندہ رحمت کناد و ہر کہ بر نیت بانی خیر دعای ایمان گوید۔۔

آپ ملاحظہ کریں گے کہ دعائیہ کلمات اور تاریخ عربی میں ہے۔ اور یہ سلسلہ تقریباً ایک صدی تک جاری رہا۔

فارسی کا قدیم ترین منظوم کتبہ قصبہ کھنبایت (گجرات) کے ضلع کیرا میں پروازشاہ نام کے ایک شخص کی قبر پر ہے، اس قبر کی دیوار میں[1] دوسری قبروں کے پتھر نصب کردئے گئے ہیں، ان میں ایک پتھر پر زین الدین علی بن سالار بن علی یزدی کا لوح مزار ہے جن کی وفات ۶۸۵ھ میں ہوئی، اس لوح پر پہلے حسب ذیل[2] نظم درج ہے،

مقصد جان رو نمود جان بمیان گو مباش
دل چو ہمہ "حال" گشت "قال" لسان گو مباش

بی مدد صوت و حرف کشف شد اسرار غیب
کام و زبان گو بریز شرح و بیان گو مباش

از صدف تن چو یافت جان گہر سر عشق
در ہمہ جا از صدف نام و نشان گو مباش

چون لب جان نوش کرد جرعۂ جام بقا
منزل دار فنا در رہ آن گو مباش

از سفر و جنت است خوف و امان ہمہ
ما چو ازان فارغیم خوف و امان گو مباش

مایۂ سود و زیان دنیا و عقبار تست
ہر دو چو در باختی سود و زیان گو مباش

روح چو از باغ عشق نو بر وحدت گرفت
ابر یقین گو مبار کشت گمان گو مباش

چونکہ فرود آمدیم در حرم کبریا
شہپر روح الامین جلوہ کنان گو مباش

---

۱ قدیم عمارتوں، قبروں وغیرہ کے پتھر بعد کی عمارتوں میں اکثر استعمال کرلیے جاتے تھے، اور بعض اوقات ان پتھروں پر کتبے کندہ ہوتے تھے۔

۲ یہ کتبہ محقق شہیر ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی کی دریافت ہے اور کئی بار چھپ چکا ہے، آخری بار امریکہ کے مطبوعہ رسالہ؛

جملۂ صحرا و کوہ نور تجلی گرفت
ماز تجلی خوشیم نور و جنان گو مباش

زبدۂ ہر دو جہان نقد حیات ہمہ
تنگ در آغوش ماست ہر دو جہاں گو مباش

ذات تو سالار یا روح مکانست و کون
دور و زمان گو مگرد کون و مکان گو مباش

اس نظم کے ساتھ دو رباعیاں ہیں، پہلی واضح نہیں رہ گئی، البتہ دوسری رباعی یہ ہے:

ما بہر نظام کاینات آمدہ ایم | با ذات قدیم در صفات آمدہ ایم
نور ہمہ نور سایہ سایۂ ماست | تو سایہ مبین کہ ما بذات آمدہ ایم

پہلے منظومہ کے بعد عربی کی یہ عبارت ہے۔

" ھذا قبر الصدر الکبیر المرحوم سلطان المحققین زین الملۃ والحق والدین علی بن سالار بن علی الیزدی متوفی یوم الاحد الثالث عشرین ذی الحجہ سنہ خمسین وثمانین وستمائۃ

" ۶۸۵

اس سلسلے میں ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ ایٹہ ضلع کے قصبہ کاسگنج کے نزدیک ایک گاؤں بلرام ہے جو کبھی ایک تاریخی قصبہ تھا۔ وہاں متعدد قبروں پر کتبے ہیں جو موسم کی سختی و گرمی کی وجہ سے دھندلے ہو چکے ہیں، ان میں دو منظوم کتبے ہیں۔ پہلا کتبہ ۷۷۲ھ اور کسی شاہزادہ کی شہادت سے متعلق ہے، شہزادے کا نام نصیر الدین محمد بن محمود غزنوی ہے جو قنوج کے قریب کاکوں نام کے ایک گاؤں میں شہید ہوا تھا، وہاں سے لاش بلرام میں لائی گئی اور یہیں دفن ہوئی، کتبہ اس طرح شروع ہوتا ہے:

۱۔ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

۲۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ٥ کل نفس ذائقۃ الموت ٥

كلّ من عليها فان ٭ له الحكم واليه ترجعون ٭

۳. شہادت آن عزیز غریب شہید سعید نصیرالدین محمد بن محمود غزنوی روز پنج شنبہ بیست و یکم ماہ ذوالقعدہ سنہ سبع و اربعین و ستمایۃ در حد قنوج بدیہ کاکوں

اس کے بعد سنگ مزار پر یہ چار رباعیاں اس طرح درج ہیں:

یک چند دلم بارخ تو خوش می بود   وازدیدن روی تو دمی می آسود
آرید حسدی کہ ہست این چرخ کبود   از پیش من شہا بناگہت بربود

ای کردہ تنت ناگہان برای لحد   جان یافت از تنت سروپای لحد
سبحان اللہ چگونہ گنجانیدی   صد گنج ہنر در دو گز جای لحد

گفتم کہ مگر تو دلفروزی باشی   با تیرہ شبی مرا تو روزی باشی
کی دانستم شہا کہ در ہر نفسی   دردی و جراحتی و سوزی باشی

دنیا ندیدہ سیر عقبی بگزید   از عمر نہ برخوردہ اجل زود رسید
در دوستی اہل نبی صادق بود   زان ہمچو حسین محرم گشت شہید

ایک کتبہ ۶۹۰ھ کا ہے، جس کی صرف تین سطر کی حسب ذیل عبارت پڑھی جاسکتی ہے۔

۱۔ فرحین بما اتٰھم اللہ من فضلہ و یستبشرون

۲۔ ... خدا گرفت   در خلد بریں چو بہر حق گشت شہید

۳۔ . رابع عشر من جمادی الاولیٰ سنہ تسعین و ستمائۃ

---

[1] یہ کتبے ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی کے ایک غیر مطبوعہ مقالے سے لئے گئے ہیں جو Epigraphia India - Arabic & Persian (۱۹۰۷) میں شائع ہوا ہے میں چھپا، کتبے کا عکس ص ۲۸ پر، اور اس کی نقل ص ۱۳۵ - ۱۳۶ پر ہے۔

دوسری سطر کے جو الفاظ پڑھے جا سکتے ہیں، ان سے واضح ہے کہ اس کتبے کا کچھ حصہ منظوم تھا، جس کی ایک بیت کا آخری مصرعہ واضح طور پر "خوانا" ہے۔

ہریانہ صوبے میں پائے جانے والے قدیم کتبات کی تفصیلات حسب ذیل کتاب میں درج ہوئی ہے۔ Corpus Inscriptionum Iranicarum: Persian

Inscriptions down to the early Safavid Period, Vol. XLVII

State of Haryana by Mehrdad Shokohi 1988

Published by School of Oriental & African Studies.

یہ کتاب کئی سال کے فیلڈ ورک کا نتیجہ ہے۔ اس میں ہریانہ کے چار قصبوں ـــــ فتح آباد، برتوالہ، ہانسی اور حصار ـ کے کچھ قدیم کتبات کی تفصیلات درج ہوئی ہیں۔ فتح آباد میں فیروز شاہ کی لاٹ کے کتبے کی تحقیق پر زیادہ وقت صرف ہوا۔ لاٹ کا کتبہ اسلامی دور کے ہندوستان کے کتبوں میں سب سے زیادہ طویل ہے چنانچہ اس کے تعلق سے اس کتاب میں ۔۔ عکسی پلیٹ ملتی ہیں۔ اس کے علاوہ ہریانہ کے ۱۹ اور کتبوں کی تشریح اس کتاب میں درج ہوئی ہے۔ سب سے قدیم کتبہ ہانسی میں ہے جو معزالدین محمد بن سام کے زمانے

ل ہریانہ لفظ سونی پت کے والی دیپال کے نام کے ساتھ زین الاخبار (طبع تہران) ص ۲۰۱ پر تین بار اس طرح آیا ہے "دیپال ہریانہ" اور ایک بار اس کا نام صرف دیپال ملتا ہے۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ ہریانہ اس خطے کا نام رہا ہوگا۔

میں ۶۸۸ میں مکمل ہوا، ہانسی کے ۵ اور کتبے دورِ سلطنت کے ہیں، بروالہ کا کتبہ ۶۸۸ھ کا ہے اور اس کا تعلق سلطان کیقباد (۶۸۶ - ۶۸۹ھ) کے عہد سے ہے، ایک کتبہ علاء الدین خلجی کے زمانے کا ہے، ایک کتبہ ابراہیم لودی کے عہد سے متعلق ہے جو ہانسی میں برسی گیٹ پر ہے، سکندر لودی کے دور کا ایک کتبہ ہانسی میں "چار قطب" میں ملتا ہے، تین مغل کتبے اور ہیں، دو ہمایوں کے عہد کے ہیں، ایک حصار میں، دوسرا فتح آباد میں تیسرا اکبر کے عہد کا حصار میں ہے

ہریانہ کا یہ علاقہ تاریخی اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتا ہے، لیکن تقسیم ہند کے بعد یہاں کی تاریخی عمارتیں بربادی کا شکار ہوئیں، علاقے کی مسلمان آبادی پاکستان منتقل ہو گئی، چنانچہ یہاں کی مسجدوں، درگاہوں، مقبروں وغیرہ پر دوسروں کا قبضہ ہو گیا، صرف وہ جو محکمہ آثار قدیمہ کی نگرانی میں انہیں محفوظ رہیں، ان میں اشوک کی لاٹ فتح آباد، حصار کی لاٹ کی مسجد، ہانسی کا برسی دروازہ اور متعلقہ عمارتیں شامل ہیں، حصار میں ایک اہم کتبہ محمود بن التمش کے عہد کا تھا، جو عید گاہ کی دیوار میں لگا ہوا تھا، وہ ۱۹۴۷ء میں کچھ برباد ہوا، آخر میں ۱۹۸۱ء میں وہ لاپتہ ہو گیا، حصار کے تین معلوم کتبے ختم ہو چکے ہیں، پہلا ایک چشتی بزرگ شیخ محمد بن محمود کی وفات (۹ شعبان ۸۹۳ھ) سے تعلق رکھتا تھا، دو ایک روضے کی تعمیر کے تھے، حصار کی جامع مسجد ایک مندر میں تبدیل ہو چکی ہے نہ اس کا کتبہ باقی ہے اور نہ مسجد الغ بیگ کا کتبہ، یہی حشر مغلیہ دور کے کتبات کا ہوا، حصار کی مسجد آدینہ اب ایک گردوارہ میں بدل چکی ہے۔ نہ اس کے کتبے کا پتہ نشان ہے، اور نہ منبر وغیرہ کا، مشکل سے کوئی ایسی قوم دنیا میں ہو گی جو اپنے تہذیبی ورثے کی بربادی پر فخر کرتی ہو جیسی کہ ہندوستان کی ہے۔

حصار کے ایک کتاب خانے کا ذکر پروفیسر محمد شفیع مرحوم سابق پرنسپل اورینٹل کالج لاہور کے ایک مقالے میں ہے، ان کے بیان کے مطابق حصار کے

لہ یہ مقالہ "کتاب خانہ حصار" کے عنوان سے لکھا گیا تھا، اور مجموعہ مقالات پروفیسر شفیع جلد ۳ ص ۲۲۵ - ۲۳۰ میں شامل ہے۔

طلاقی دروازے کے اندر علاء کا ایک پرانا گھرانا رہتا تھا ان کے پاس عربی فارسی کتابوں کا ایک قیمتی ذخیرہ تھا۔ اس میں پانچ چھ ہزار کتابیں تھیں، مارچ ۱۹۴۴ کو پروفیسر شفیع کو اس کتاب خانے کو دیکھنے کا موقع ملا، اس وقت اس میں تین سو سے زاید کتابیں نہیں رہ گئی تھیں، یہ بزرگ اپنی کتابوں کو کسی کو دکھانے پر رضامند نہیں ہوتے تھے، پروفیسر صاحب کے بقول: امید نہیں کہ ۱۹۴۷ کے انقلاب کے بعد یہ ذخیرہ بچا ہوگا، شفیع صاحب نے اپنے مقالے میں اس کتاب خانے کی ۴۷ قلمی نسخوں اور ۴ مطبوعہ کتابوں کا مختصر سا تعارف کرایا ہے۔ ان میں کچھ نادر مخطوطے ہیں، ان میں ایک فرہنگ زفان گویا کا ناقص نسخہ تھا جس کی تاریخ کتابت ۱۲۴۹ ہجری تھی۔ پروفیسر شفیع کو زفان گویا کے کسی اور نسخے کا علم نہ تھا۔

راقم حروف کو فرہنگ زفان گویا کے تین نسخے ملے، ان میں زیادہ معتبر خدا بخش لائبریری پٹنہ کا نسخہ ہے جس میں مقدمہ بھی ہے، ایک ناقص الاول نسخہ تاشقند کا ہے، ایک تیسرا نسخہ کراچی میوزیم کے ایک مجموعے میں شامل ہے جو ناقص الاخر ہے، اس میں دیباچہ بھی نہیں، راقم نے پہلے دونوں نسخوں کی مدد سے پہلی جلد کا ایک انتقادی متن تیار کیا جو ۱۹۸۹ میں خدا بخش اورینٹل لائبریری پٹنہ کی طرف سے شایع ہوا، دوسری جلد جو تینوں نسخوں کی مدد سے تیار ہو چکی ہے۔ زیر اشاعت ہے۔

راقم الحروف کو حصار کے نسخے کا بہت بعد میں علم ہوا تو اس کی جستجو کی فکر دیر میں ہوئی، اس وقت سید مظفر حسین برنی صاحب ہریانہ کے گورنر تھے۔ راقم نے انھیں خط لکھا کہ پروفیسر شفیع کے ذکر کردہ کتاب خانے کے وجود کے بارے میں مجھے اطلاع بہم پہنچائیں کچھ دنوں بعد موصوف نے مطلع فرمایا کہ حصار کے اس خاندان کا اب کوئی پتہ نشان باقی نہیں ہے۔ بہر حال یہ صرف ایک سانحہ ہے، اس طرح کے ہزاروں لاکھوں سانحوں سے اسلامی تہذیب کو دوچار ہونا پڑا ہے۔

اب ہریانہ کے چاروں قصبات کے کتبات کی تفصیلات پیش کی جاتی ہیں۔

(۱) فتح آباد ایک قصبہ ہے جو حصار سے ۴۵ کلو میٹر جنوب مغرب میں واقع ہے،

فیروز شاہ[1] تغلق (۵۲ ۷ ۔ ۷۹۰) نے اسکو اپنی حکومت کے استحکام اور اپنے بیٹے فتح خاں کی پیدائش کی مناسبت سے ۷۵۲ھ میں یعنی اپنی تخت نشینی کے پہلے مہینوں میں تعمیر کرایا تھا، یہ اس وقت کی بات ہے جب بادشاہ سرستی (سرسا) سے دہلی کی طرف جانے والا تھا، بہر حال شہر آباد ہوا اور پانی کی فراہمی کے لیے ایک نہر پٹیالہ سے فتح آباد تک نکالی گئی جو آج بھی باقی ہے۔

اپنی ابتدا ہی سے فتح آباد کو بڑے بڑے انقلابات کا سامنا کرنا پڑا ۸۰۱ھ میں تیمور نے اس پر قبضہ کر لیا اور لوگوں کا قتل عام کر ڈالا، کچھ دنوں بعد آخری تغلق فرمانروا سلطان محمود شاہ اور وہاں کے حاکم خضر خاں کے درمیان اس قصبے کی حاکمیت کے لیے جنگ شروع ہوئی کچھ دنوں تو یہ قصبہ خضر خاں کی ماتحتی میں رہا، رجب ۸۱۱ھ میں سلطان محمود نے اس پر اپنا قبضہ بحال کر لیا۔ لیکن چند ماہ بعد خضر خاں نے اس پر اپنا قبضہ کر لیا، بابر نے ابراہیم لودی کو شکست دے کر اپنی مہم جاری رکھی، اس کی فوج کا ایک دستہ ہمایوں کی کمان میں تھا اس نے حصار فیروزہ کو فتح کر کے ان اطراف میں اپنی قوت مستحکم کر لی، اس پر بابر نے اپنے بیٹے کو حصار اور اس سے متعلقہ علاقے کا حاکم مقرر کر دیا۔ فتح آباد اسی علاقے کا ایک حصہ تھا، وہاں ہمایوں کے عہد کا ایک کتبہ ہے جو فیروز شاہ کی لاٹ کے نزدیک ہے۔

فتح آباد کی تاریخی اہمیت کا موجب فیروز شاہ کی لاٹ کا کتبہ ہے جو اسلامی دور کے سارے کتبات میں سب سے زیادہ[2] طویل ہے، فیروز شاہ نے اس کتبے میں اپنے دو پیشرو تغلق سلاطین یعنی غیاث الدین تغلق اور محمد بن تغلق کے عہد کے موٹے موٹے واقعات کندہ کرائے تھے، اور اس لحاظ سے وہ اس دور کی تاریخ کا سب سے زیادہ مستند ماخذ ہے، اس کتبے کی تفصیل اس طرح پر ہے۔

---

[1] دیکھئے انگریزی کتاب Meherdad Shokhi, Persian Inscription down to the early Safavid Period - Haryana1, pp.11-23

[2] دیکھئے ایضاً

(۱) سطور ۱-۶، کا تعلق، تغلق خاندان کے بانی ابوالمظفر غیاث الدین (۷۲۰-۲۵ھ) کے واقعات سے ہے، خواجہ مبارک شاہ کے قتل کے بعد کے واقعات، تغلق شاہ کی کوشش سے قاتلوں کی شناخت اور خود غیاث الدین تغلق کی تخت نشینی کا اجمالی ذکر۔

(۲) سطور ۶-۹، اس میں لکھنوتی کی مہم سے واپسی پر غیاث الدین تغلق کی وفات نئے محل کی چھت سے گرنے کا ذکر ہے، اس حادثے کی تاریخ رجب ۷۲۵ھ کی آخری تاریخ ہے، اس تاریخ کی اہمیت اس وجہ سے اور ہے کہ برنی کے یہاں تاریخ درج نہیں اور عفیف نے اس واقعے کا ذکر ہی نہیں کیا، البتہ تاریخ مبارک شاہی میں تاریخ: ربیع الاول ۷۲۵ درج ہوئی ہے، یہی تاریخ بعد کی تاریخوں میں بھی پائی جاتی ہے، لیکن کتبے میں درج تاریخ ہی کو صحیح قرار دینا چاہیے۔

یہاں ایک واقعہ کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا، غیاث الدین نے لکھنوتی سے واپس ہوتے ہوئے ترہت پر بھی حملہ کر دیا تھا، اس واقعے کا سب سے اہم ماخذ بساتین الانس ہے۔ اس کا مولف محمد بن صدر علا معروف باختسان دہلوی اس مہم میں شریک تھا چنانچہ اس نے اس واقعے کی تفصیل بساتین الانس میں درج کر دی ہے، اس لحاظ سے اس سلسلے کے واقعات کا سب سے اہم ماخذ بساتین الانس ہے، بساتین کو متعارف کرانے کا سہرہ پروفیسر حسن عسکری صاحب کے سر ہے، انھوں نے اس سلسلے سے دو مضمون شائع کئے تھے، ان کے پاس بساتین کے برٹش میوزیم کے نسخے کا عکس تھا، راقم نے موصوف کے کام کو آگے بڑھانے کی غرض سے ایک اور نسخہ ٹیگور لائبریری (لکھنؤ یونیورسٹی) میں موجود پایا، پروفیسر ولی الحق صاحب سابق صدر شعبۂ فارسی لکھنؤ یونیورسٹی کے توسط سے چند دنوں کے لیے اصل نسخے کے مطالعے کا موقع ملا، پھر ان دونوں نسخوں کی مدد سے اس کتاب کا ایک انتقادی متن تیار کر تو لیا لیکن اس کی طباعت کا خیال ملتوی کر دیا اس لیے اس کے دو اور نسخوں کا علم ہو گیا تھا، ایک تو ماسکو میں جو نویں صدی کا تھا اور دوسرا مدینۂ منورہ میں مکتبہ شیخ عارف حکمت کے کتاب خانے میں،

بساتین کے تین نسخے ترتیب زمانی کے ساتھ یہ ہیں (۱) مکتبہ شیخ عارف حکمت مدینہ

(حاشیہ آگے صفحہ پر)

(۳) سطور ۱۰ ـ ۱۸ میں سلطان محمد بن تغلق کی تخت نشینی کا بیان ہے کتبے میں تخت نشینی کی تاریخ یکم شعبان ۷۲۵ھ ہے جب کہ تاریخوں میں شعبان کے بجائے ربیع الاول ہے، مگر اس تفاوت کی توجیہ فی الحال مشکل نظر آتی ہے۔ اس کے ساتھ اس میں محمد بن تغلق کے عہد کے اندرو اقعات کا ذکر ہے، اس میں یہ بھی واقعہ ہے کہ سلطان محمد بن تغلق نے فیروز شاہ کو اپنا جانشیں نامزد کر دیا تھا، لیکن خواجہ جہاں احمد ایاز نے اس کی مخالفت کی تھی جس کے نتیجے میں اسے اپنی زندگی سے ہاتھ دھونا پڑا تھا۔

(۴) سطور ۱۹ ـ ۲۰ میں سلطان محمد بن تغلق کی مہم ٹھٹھہ کا ذکر ہے، اس میں یہ بھی ہے کہ سلطان کی مدد کے لیے خراسان کے حاکم نے منگول فوج کا ایک دستہ بھی بھیجا تھا، اسی درمیان محمد بن تغلق کی وفات ہو گئی تو منگول فوج لوٹ مار میں لگ گئی امرائے دلی نے مشورہ کر کے فیروز شاہ کو بادشاہ منتخب کر لیا، اس طرح فتنہ دب گیا۔

(۵) سطور ۲۰ ـ ۲۹ میں محمد بن تغلق کے آخری ایام کے واقعات کا خلاصہ درج ہوا ہے، اسی ضمن میں خواجہ جہان احمد ایاز کا بھی ذکر آیا ہے۔

فتح آباد کا دوسرا قابل ذکر کتبہ پرانے قلعے میں ہے جو ہمایوں کے عہد سے تعلق رکھتا ہے یہ دس سطری کتبہ خط نسخ میں ہے، پہلی تین سطریں عربی میں اور آخری سات سطریں فارسی میں ہیں، اس میں ایک مسجد کی تعمیر کا ذکر ہے، اس کا تعمیر کنندہ رستم بیگ بن امیر تھا، اور کتبے کی تاریخ ۲۔ رمضان ۹۴۵ھ اور دور ہمایوں بادشاہ لکھا ہے۔ پورا کتبہ اس طرح پر ہے،

بسم اللہ الرحمن الرحیم وان المساجد (للہ) فلا یدعوا ( )
لہ ( )مع اللہ احدا وانہ لما قام عبد اللہ یدعوہ کادو یکونون
علیہ لبدا، قال علیہ السلام نبی اللہ ( ) مسجدا یبتغی بہ
وجہ اللہ بنی لہ فی الجنۃ مثلہ،

ا؎ بقیہ حاشیہ پچھلے صفحے سے آگے۔

منورہ، مورخہ ۱۸ محرم ۴۷، ۸ / ۹۰۲ شمارہ ۹ (۲) ٹیگور لائبریری لکھنؤ یونیورسٹی مورخہ یکم رمضان ۱۰۳۶ھ شمارہ ۱۵/۲۹۷۔ ایم ۷۰ ب (۳) برٹش میوزیم لندن، ریو ۱ ، ۵۲ / ب مورخہ صفر ۱۰۴۷

تمام شد این مسجد در ایام دولت شاہ اعظم و الخاقان المعظم مالک المرقاب
طوایف الامم من الهند و الترک و العجم رافع رایات المجاہدات و المغازی
محمد ہمایون پادشاہ غازی خلد اللہ تعالیٰ ملکہ فی بحار اللطف ارکانکہ بسعی
جناب سعادۃ فرجام زبدۃ فضلاء الانام عمدۃ الامراء العظام امیر رستم بیگ
بن جناب المغفور المبرور المحتص امیر محمد عفی اللہ تعالیٰ جانب مسجد و۔ الثانین
ماہ رمضان سنہ خمس واربعین و تسعمائۃ کار فرما فقیر عبدالکریم دو جیتل روغن
چراغ بر مردم تعیین کردہ شد
طلاق است اورا ہر کہ منع کند تم

قابل ذکر بات یہ ہے کہ جن دنوں یہ مسجد تعمیر ہو رہی تھی ہمایوں بادشاہ پر ہر طرف سے بڑی یورش تھی، سلطنت کے مشرقی حصے پر شیر شاہ سوری کا دباو بڑھتا جا رہا تھا، اور خود دارالخلافہ میں ہندال میرزا، اور میرزا کامران کی بغاوت نے ہمایوں کی قوت پر ضرب کاری لگا رکھی تھی، البتہ جیسا کہ کتبۂ بالا سے مترشح ہے کہ حصار کے علاقے پر بادشاہ کی گرفت مضبوط تھی۔ یہ جزئی تفصیل تاریخ کی کتابوں میں نہیں ملتی۔

(۲) بروالہ اور اس کا کتبہ

بروالہ جو قدیم زمانے میں ایک تاریخی قصبہ تھا اب ایک چھوٹا سا قریہ رہ گیا ہے، یہ قریہ حصار کے شمال مشرق میں ۳۲ کلومیٹر کی دوری پر ایک ریلوے لائن پر واقع ہے جو حصار سے براہ جاکھل لدھیانہ جاتی ہے۔ قدیم زمانے میں اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ طبقات ناصری میں دو بار اس قصبے کا ذکر اس طرح آیا ہے۔

در عہدے کہ نویسندۂ ایں سطور منہاج سراج بحضرت اعلیٰ شمسی[1] پیوست

---

[1] منہاج سراج در ماہ رمضان ۶۲۵ھ بدہلی رسید (طبقات ج ۲ ص ۲۲۹)

نصرة الدین[1] تایسی مقطع جند[2] و بروالہ بود (ج ۲ ص ۱۰)

ملک الغ خان[3] معظم و خاقان اعظم اعلی خلدت دولتہ از مقام تلپت بطرف ہانسی نہضت فرمود، روز یکشنبہ ہفدہم ذی القعدہ سنہ ثلاث و خمسین و ستمائہ چون بخطۂ ہانسی رسید بر سبیل تعجیل ہر چہ تمام تر فرمان داد تا جملۂ لشکر ہای سوالک[4] بر ہانسی[5] و سرستی[6] و جند و بروالہ و اطراف آن بلاد در مدت چہار روز جمع شدہ با استعداد و آلت و عدة و اہبت تمام، گوئی کوہ آہن در سکون و دریای پر جوش بہ ہنگام حرکت، سوم ذی الحجہ بحضرت دہلی وصول بود (ج ۲ ص ۷۱)

---

۱ اس کے حالات کے لیے دیکھیے طبقات ج ۲ ص ۱۰-۱۲، تایسی بندۂ معز الدین محمد بن سام بود،

۲ دلی سے جند ۱۲۵ کلو میٹر شمال مغرب میں اس ریلوے لائن پر ایک اسٹیشن ہے جو روہتک سے بھٹنڈا جاتی ہے۔ پانی پت کو ایک لائن جند سے ملاتی ہے، بروالہ جند کے مغرب میں تقریباً بیس پچیس کلو میٹر پر ہوگا۔

۳ قتلغ خان نے بہرائچ میں سرکشی کر رکھی تھی، اس فتنہ کو فرو کرنے کے لیے رایات اعلی دہلی سے شوال ۵۳ھ کی آخری تاریخ کو اودھ کی طرف روانہ ہوا، تلپت جو دلی کے جنوب مشرق میں ۳۰ کلو میٹر ہے پہلی منزل قرار پایا۔ تلپت سے الغ خاں ہانسی چلا آیا اور یہاں لشکر کی فراہمی کی طرف متوجہ ہوا، ۱۴ روز میں لشکر جرار اکٹھا ہوا، یہ لشکر ۳ ذی الحجہ کو دلی پہنچا، ۱۸ روز دہلی میں قیام رہا، وہاں میوات کی فوج اور شامل ہوئی، ۱۹ ذی الحجہ کو الغ خاں بھی لشکر میں شامل ہونے کے لیے روانہ ہوا، اور ماہ محرم ۶۵۴ میں اودھ پہنچ گئے۔

۴ ایک خطے کا نام تھا جس میں ہریانہ اور راجپوتانہ کے حصے شامل تھے، ہانسی، سرستی، ناگور وغیرہ اسی خطے میں شامل تھے۔ (دیکھیے طبقات ناصری ذیل سوالک)

۵ دلی سے ہانسی کا فاصلہ بذریعہ ریل ۲۰۲ کلو میٹر لیکن روڈ کے ذریعے اس سے کافی کم فاصلہ ہے براہ ریواڑی ہانسی کا راستہ ہے دلی سے ریواڑی ۸۳ کلو میٹر اور ریواڑی سے ہانسی ۱۲۰ کلو میٹر

۶ سرستی جدید سرسا ہے جو ہانسی سے ۱۰۵ کلو میٹر شمال مغرب میں ہے۔

بروالہ میں ایک تاریخی کتبہ ملتا ہے وہ بابا مقدم پیر کی درگاہ میں ہے۔ یہ مسجد کا ایک کتبہ ہے جو ابو المظفر کیقباد (۶۸۶ - ۶۸۹) کے عہد میں ۶۸۸ ہجری میں مرتب ہوا تھا۔ بروالہ میں اور بہت سے کتبے تھے جو برباد ہو چکے ہیں، یہاں بلبن کے دور کا ایک کتبہ رمضان ۶۸۰ ھ کا ۱۸۹۳ء تک موجود تھا، لیکن اب وہ لا پتہ ہو چکا ہے، اکبری عہد میں اس کو حصار فیروزہ کا ایک قصبہ قرار دیا گیا ہے جس میں شہر فصیل نہیں، یہاں کی قدیم یادگاروں میں ایک کنواں اور کچھ پرانی عمارتیں اور مقبرے باقی رہ گئے ہیں۔

کیقباد کے عہد کا کتبہ مقدم پیر کی درگاہ میں ہے، اس کے اندر کچھ اور قبریں اور عمارتوں کے کھنڈرات ہیں، کچھ عمارتیں لودی اور مغل دور کی تھیں، وہ بھی کھنڈر ہو چکی ہیں۔ مسجد کے کتبے کی عبارت یہ ہے:

امر ببنار ہذہ المسجد فی عہد السلطان المعظم معز الدنیا والدین (خلد ملکہ) ابو المظفر کیقباد السلطان محب الاولیاء والفقرا تاج الدولہ والدین محمود بن خلج ارسلان السلطانی دام اقبالہ فی الغرہ من ربیع الاول سنۃ ثمان و ثمانین وستمائۃ۔

سلطان کیقباد تین سال تک (۶۸۶ تا ۶۸۹) حکمراں رہا، اس کے عہد کی ایک اور مسجد امروہہ میں ہے جو صدر مسجد یا مسجد صدر الدین کے نام سے جانی جاتی ہے، اس کا کتبہ بروالہ والے کتبے سے دو سال قدیم ہے۔ امروہہ کی جامع مسجد کے کتبے کی تاریخ ۶۸۶ اور بروالہ کی ۶۸۸ ھ۔

تاج الدولہ جس نے مسجد بنوائی تھی وہ کوئی افسر رہا ہوگا لیکن اس کا نام تاریخ کی موجودہ کتابوں میں نہیں ملتا، البتہ "السلطانی" سے اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ وہ بادشاہ کا غلام تھا۔

(۳) ہانسی اور اس کے کتبات

دلی سے شمال مغرب میں یہ قصبہ ریلوے لائن کے حساب سے ۲۰۳ کلومیٹر

دوری پر واقع ہے یہ فاصلہ براہ ریواڑی لگایا گیا ہے، لیکن روڈ کے ذریعہ یہ فاصلہ ۱۷۵ کلو میٹر کے قریب ہوگا۔ ریواڑی سے حصار جانے والی ریلوے لائن پر، ریواڑی سے ۱۲۰ کلو میٹر کی دوری پر (حصار سے ۲۳ کلو میٹر پہلے) واقع ہے، قدیم زمانہ میں یہ نہایت مشہور مقام تھا، اس کی شہرت ایسی ہی تھی جیسی دلی کی تھی، البیرونی کی کتاب الہند میں اس کو اُسی لکھا ہے، کہتے ہیں سنسکرت زبان میں پرتھوی راج کا کتبہ جو ۱۲۲۴ سمبت مطابق ۱۱۶۸ء کا ہے، وہ اسی اُسی سے تعلق رکھتا ہے، یہاں ایک بات کا ذکر شاید دلچسپی کا باعث ہو سنسکرت زبان میں قدیم کتبے بہت ہی کم ملتے ہیں، لیکن مجھے اس کا علم نہ تھا، ۱۹۷۰ء میں مجھے مشہور ایرانی مورخ ابوالفضل بیہقی کے سمینار میں شرکت کا دعوت نامہ ملا، بیہقی کی تاریخ مسعودی فارسی کی مشہور تاریخ ہے، دراصل یہ تاریخ خاندان غزنوی کی اہم تاریخ تھی جو ناصرالدین سبکتگین سے لے کر ابراہیم بن مسعود غزنوی کے حالات کو حاوی تھی، لیکن یہ کتاب مفقود ہو چکی ہے اور اس کا وہ حصہ جو محمود کے بیٹے مسعود کے حالات پر مشتمل ہے، باقی رہ گیا ہے جو فی الحال تاریخ بیہقی اور تاریخ مسعودی کے نام سے تین چار بار زیور طبع سے آراستہ ہو چکی ہے، اس باقی ماندہ حصے میں درمیان سے چند ماہ کے واقعات پر مشتمل[1] حصہ غائب ہے۔

غرض سمینار کے دعوت نامے سے خوشی تو ہوئی لیکن اس موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھنے کی صلاحیت نہ ہونے سے مجھے بڑا تردد تھا، بہرحال کچھ عرصے کی سوچ بچار کے بعد مقالہ کا موضوع ذہن میں آگیا، اور مجھے کسی قدر اطمینان ہو گیا کہ سمینار میں شرکت کر سکوں گا۔ موضوع یہ تھا:

A Critical Examination of Baihaqi's Narration of the Indian Expeditions during the reign of Masud of Ghazna

---

[1] اس کی تفصیل میرے مقالے میں درج ہے جو بیہقی کے سمینار (مشہد) میں ۱۹۷۰ء میں پیش کیا گیا تھا۔

میرے ذہن میں یہ بات بھی کہ مسعود کے ہندوستانی حملے کی جزئیات کا تنقیدی مطالعہ ہندوستان میں پائے جانے والے مواد کی روشنی میں کرسکوں گا۔

مسعود غزنوی کا حملہ بنارس پر ہوا تھا تو میں نے بنارس کی تاریخ پر چند کتابیں پڑھیں، ان میں سے کسی میں میرے مطلب کی بات نہ ملی بیشتر کتابوں میں تو بنارس کی تاریخ کا سب سے قدیم ماخذ تاریخ بیہقی بتائی گئی ہے۔ مجھے بڑی فکر دامن گیر ہونے لگی، انھیں دنوں میں مجھے پٹنہ جانے کا اتفاق ہوا، اور پروفیسر سید حسن مرحوم کے توسط سے پروفیسر شرما سے ملاقات ہوئی، ان سے میں غزنوی دور کے ہندوستان کے تاریخی مواد کے بارے میں استفسار کیا، انھوں نے کہا کہ اس دور کے عام ہندوستان میں تاریخی مواد کی بے پناہ کمی ہے، بہر حال انھوں نے مجھے قدیم ہند کے کلاچوری عہد کے ایک قدیم کتبے کا پتہ دیا جو اس عنوان سے طبع ہوا تھا؛

Corpus Inscriptionum Indicarum Vol IV

Inscription of the Kalachuri Chediera,

Ootacammund,1995, Editor: Mirashi

اس کے ساتھ مجھے ایشیاٹک ریسرچز کی جلد نہم ص ۱۰۸ پر ایک کتبے کا عکس درج ملا، اس سے معلوم ہوا کہ اس خطے کے حکمراں گنگ دیو کی وفات کی پہلی برسی پر اس کے بیٹے کرن دیو نے مرزا پور ضلع کا ایک گاؤں اس پنڈت کو دیا تھا جس نے برسی کے موقع کے رسوم ادا کئے تھے۔

بہر حال مواد تو بہت قلیل تھا پھر بھی بیہقی کی بنارس کے سلسلے کی حسب ذیل عبارت کا مفہوم سمجھ میں آگیا؛

[بنال تگین] ناگاہ بر شہری زد کہ آنرا بنارس گویند از ولایت گنگ بود حاشیے میں "گنگ بود" کے بجائے گنگ یا گنگہ دیو یا دیو لکھا ہے اور یہی صحیح ہے، اس کے وجوہ یہ ہیں؛

ا۔ گنگ دیو کلاچوری راجا گنگہ دیو ہی ہے، جو ۱۰۱۹ سے ۱۰۴۲ تک اس علاقے

کا فرمانروا تھا، اور تاریخ بیہقی سے معلوم ہوا کہ مسعود کے سپہ سالار احمد ینال تگین کا حملہ ۴۲۴ھ میں ہوا۔

۲۔ گنگ دیو پسر کوکلا دیوا بڑا طاقتور بادشاہ تھا، وہ دھارا کا فرمانروا تھا، اس کا ایک مرکز "تری پوری" دوسرا "پریاگا" تھا البیرونی نے بھی لکھا ہے کہ گنگ دیوا ۱۰۳۰ء میں زندہ تھا۔

۳۔ کرن دیوا کے کتبے سے بھی ظاہر ہوا کہ جن تاریخوں میں مسعود کے سپہ سالار ینال تگین نے بنارس پر حملہ کیا تھا، اس وقت وہاں کا حکمران گانگیہ ہی تھا۔

میری اس ضمنی گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ بنارس جیسے اہم اور متبرک مقام کے تعلق سے ہندوستان میں اتنا کم مواد ہو، یہ بڑے افسوس کا مقام ہے، اور جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں کہ صرف دو سند کے علاوہ ایک گنگ دیو کا کتبہ جو کلاچوری سنہ کے ۷۸۹ مطابق ۱۰۳۷ء کا ہے، دوسرا ایشیاٹک ریسرچز جرنل ج ۹ میں طبع شدہ کے (مورخ کلاچوری سنہ ۷۹۳ / ۱۰۴۲ء) کتبے کے جس کی رو سے برہمن کو ایک گاؤں دیا گیا ہے۔۔ اور کوئی سند نہیں۔ ان دونوں سندوں کے ساتھ پرتھوی راج کے ہانسی کے ۱۱۸۶ء والے کتبے شامل کر لیں تو صرف تین قدیم سند کا ہمیں علم ہوگا۔

مجھے آپ حضرات معاف کریں گے کہ میں اپنی گفتگو سے کچھ دور ہو گیا لیکن چونکہ ہندوستان کے قدیم کتبات کی بات آگئی تھی تو اتنی باتوں کا یہاں اضافہ کر دیا۔

ہانسی کی قدیم تاریخ کے سلسلے میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ یہ قصبہ اپنی سیاسی و تہذیبی برتری کی وجہ سے بیرونی حملہ آوروں کے لیے جاذب نظر بن چکا تھا، مسعود غزنوی (۴۲۲ ۔ ۴۳۱) نے اس پر دو بار حملہ کیا، پہلی بار اسے فتح نہ کر سکا، اس کا قلعہ بکر بکر ہی رہا عورت نہ ہو سکا، دوسری بار ۴۲۹ھ میں حملہ کیا، اس بار قلعہ بکر عورت ہو گیا۔

لے تاریخ بیہقی ص ۵۳۲ (چاپ دانشگاہ تہران) سے معلوم ہوا کہ ہانسی کے قلعے (باقی آگے صفحہ پر)

ظاہر ہے ہانسی فتح تو ہو گیا لیکن اس پر مسلمانوں کی گرفت مضبوط نہ ہو سکی، وہ بطور سابق ہندوستانی حکمرانوں کے قبضے میں رہا، ۵۸۸ھ[1] میں معزالدین محمد بن سام نے فتح دہلی سے کچھ پہلے ۵۸۸ھ میں اس پر اپنا قبضہ جما لیا پھر یہ اسلامی دور کا بہت بڑا سیاسی و تمدنی مرکز کی شکل میں ابھرا، شیخ جمال الدین ہانسوی ساتویں صدی ہجری کے جلیل القدر عارف کا مرکز یہی شہر رہا، پھر ان کے بیٹے برہان الدین اور پوتے شیخ قطب الدین کا بھی مستقر یہی قصبہ رہا ہے، شیخ نورالدین بن شیخ قطب الدین منورؒ کا تعلق بھی اسی قصبہ سے رہا تھا۔ ان حضرات کی خانقاہ اور مقبرے "چہار قطب" کے نام سے بڑی شہرت رکھتے ہیں اور لوگوں کو اس سے بڑی عقیدت ہے۔

سلطان فیروز شاہ تغلق نے حصار فیروزہ کی تعمیر کی تو ہانسی کی سیاسی اہمیت گھٹ گئی، یہ قصبہ حصار فیروزہ میں شامل ہو گیا، ہانسی کا قلعہ عرصہ تک سیاسی قیدیوں کے لیے جیل خانے کے کام میں آتا رہا، ابراہیم لودی نے اپنے چار بھائیوں کو اسی قلعے میں محبوس کر رکھا تھا۔

ہانسی میں بڑی تاریخی عمارتیں تھیں، ان سے اکثر اب کھنڈر ہو چکی ہیں، شہر کی فصیل بھی ختم ہو گئی ہے، البتہ اس کا جنوبی دروازہ برسی دروازے کے نام سے باقی ہے، قلعے کے اندر شاہ نعمت اللہ کا روضہ ہے، اس کے ساتھ "چہار قطب" کی درگاہ ہے، اس کے اندر کسی خاتون کی پرانی قبر ہے جس میں ایک کتبہ ۲۱۔ ذی قعدہ ۶۲۲ھ کا لگا ہوا ہے کتبے کی عبارت یہ[2] ہے؛

تحت القبر المستورة الجلیلة نوّر اللہ قبرھا و غفر اللہ لھا فی جنة
ماوی یا ارحم الراحمین و ذلک بالتاریخ الحادی عشرین ذی القعدة
سنة اثنی و عشرین و ستمائة

(بقیہ پچھلے صفحہ کا) کا محاصرہ دس یا گیارہ دن رہا، ۹ ربیع الاول سے ۲۰ ربیع الاول (۴۲۹ھ) اور خود سلطان مسعود کی سرکردگی میں یہ مہم سرانجام پائی۔ مہرداد شکوہی نے بھی قلعے کے فتح ہونے کی تاریخ ۲۰ ربیع الاول ۴۲۹ھ درج کی (دیکھئے ہریانہ مقدمہ ص ۲۶)

[1] طبقات ناصری ج ۱ ص ۱۲۰

[2] دیکھئے مہرداد شکوہی: ہریانہ (۱) ص ۳۷

اس سلسلے میں چند قابل ذکر امور یہ ہیں ؛

۱۔ یہ دورِ شمسی (۶۰۷ — ۶۳۲ھ) کا کتبہ ہے، اس عہد کے مختصر کتبات میں یہ اہم اضافہ ہے۔

۲۔ ۶۲۲ میں التتمش کا بڑا بیٹا سلطان محمود ہانسی کا حاکم تھا، اسی کے زمانے میں یہ کتبہ تیار ہوا ہوگا، سلطان محمود ۶۲۳ میں اودھ کا حاکم اور پھر بنگال کا، وہیں وہ ۶۲۶ھ میں فوت ہوا، اس کی قبر دلّی (مہرولی) میں ہے، اور کتبے کی تاریخ ۶۲۹ ہجری ہے۔

یہاں ایک امر کا ذکر فائدہ سے خالی نہ ہوگا، چند سال قبل مہرولی کے نواح میں ایک قبر پر ایک کتبہ مکشوف ہوا، تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ یہ کتبہ التتمش کے عہد کے ایک نامور امیر و سپہ سالار عزالدین بختیار کا ہے۔

التتمش کی تخت نشینی کے موقع پر سرجاندار تتار نے بغاوت کر دی تھی، اس فتنے کو فرو کرنے میں عزالدین بختیار نے بڑا کام کیا تھا، یہ واقعہ ۶۰۷ھ کا ہے، دوسرے سال جالور کی مہم شروع ہوئی، اس مہم میں عزالدین بختیار شریک تھا، ان دونوں واقعات کی تفصیل حسن نظامی نے اپنی تاریخ "تاج المآثر" میں پیش کی ہے۔

اس اہم کتبے کے متن کی تصحیح اور صاحبِ قبر کی شخصیت کا تعین ہمارے عہد کے عظیم محقق ڈاکٹر ضیاء الدین کی محنت اور قابلیت کا نتیجہ ہے، موصوف کا تحقیقی مقالہ Epigraphia India - Arabic & Persian Supplement. کے ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا، کتبہ اس طرح پر ہے؛

---

[1] دیکھئے طبقات ناصری طبع تہران، ج ۱ ص ۴۵۳

[2] ایضاً۔ اودھ میں اس نے وہاں کے راجا "برتوہ" جس نے ۱۲۰ ہزار سے زیادہ مسلمانوں کو شہید کر دیا تھا، خاتمہ کیا۔ اس کا صحیح نام ہرزودل تھا جیسا کہ سراجی کے قصیدے میں (دیکھئے دیوان سراجی طبع دانشگاہ علی گڑھ ۱۹۷۲ء) ہے۔

[3] راقم حروف نے اس پر ایک مقالہ اردو میں لکھا جو اسلام آباد کے رسالہ میں شائع ہو چکا ہے۔

وفات سپہا [لار] مرحوم
مغفور عزّالدین بختیار روز دوشنبہ
نوزدہم ماہ جماد[ی] الآخر لود سنہ ست عشر وستمائہ

اسی دور کا ایک شاعر سراجی خراسانی ہے، جو صاحب دیوان ہے، اور خلفان ملوک کا سب سے قدیم صاحب دیوان شاعر ہے، اس کا دیوان راقم کی تصحیح کے بعد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی جانب سے ۱۹۶۲ میں شائع ہوچکا ہے، اس نے امیر عزالدین بختیار کی مدح میں ایک[1] قصیدہ لکھا ہے، چونکہ صاحب قبر عزالدین بختیار اور ممدوح سراجی ہم عصر ہیں، ایک ہی بادشاہ التتمش کے دربار سے منسلک ہیں اور دونوں کا ایک ہی نام ہے، اور دونوں امیر اور سپہ سالار تھے، اس بنا پر میں نے یہی نتیجہ نکالا کہ سراجی خراسانی کا ممدوح عزالدین بختیار بن احمد، صاحب قبر سپہ سالار عزالدین بختیار دونوں ایک ہی شخصیت ہے، سراجی کا قصیدہ السّرائی ہے، قصیدہ مردف ہے، ردیف "دست" ہے اور ہر بیت میں سرو پا کی تکرار ہے۔ مطلع یہ ہے:

تا زدم اندر سر زلف بت دلدار دست ۔۔۔ پای صبر من برفت از جای وشد از کار دست

مدح کے چند شعر ملاحظہ کریں:

از رہ خون ریز در پای اجل دارد یکی ۔۔۔ یا سر تیغ ملک از غمزۂ خون خوار دست
آفتاب قدر عزالدین کہ از پای شرف ۔۔۔ بر سر گردون زند در کوکب سیّار دست
بختیار احمد آن سر دفتر کل ملوک ۔۔۔ کو بپای قدر بر داز گنبد دوّار دست
سرفراز لشکر خسرو کہ با شمشیر او ۔۔۔ فیل نشناسد ز پا اندر صف پیکار دست

اس قصیدہ سے ایک بات یہ معلوم ہوئی کہ عزالدین بختیار کے باپ کا نام احمد تھا۔

---

[1] دیکھیے دیوان سراجی ۔ ص ۲۱۶ ۔ ۲۱۹

تفصیلات بالا سے اس حقیقت کا ثبوت فراہم ہوتا ہے کہ تاریخی کتابوں کے علاوہ ادبی آثار، کتبے اور سکے وغیرہ تاریخ و تہذیب کے ماخذ ہیں، اور کسی قوم کی صحیح تاریخ اسی وقت معتبر قرار پاتی ہے جب تاریخ نگاری میں اس کے سارے ماخذ کا صحیح طور پر استعمال ہوتا ہے، اس گزارش سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ تاریخ و تحقیق کا قدم آہستہ آہستہ اٹھتا ہے، امیر عزالدین بختیار ہی کو لیجیے، ۱۹۷۰ء سے پہلے اس کے نام کے سوا کچھ نہ معلوم تھا، دیوان سراجی انکشاف ہوا تو معلوم ہوا کہ سلطان التتمش کے عہد کا یہ امیر سراجی کا ممدوح تھا، اور اس کا پورا نام عزالدین بختیار اور اس کے باپ کا احمد تھا، وہ بڑے درجے کا امیر سپہ سالار اور جنگ آزمودہ جنرل تھا، ایک ہی سال کے اندر اس کا کتبہ برآمد ہوا تو اس کی سپہ سالاری کا ایک اور اہم ثبوت مل گیا، ساتھ ہی اس کی وفات کی تاریخ ۶۱۴ھ معلوم ہو گئی، اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ سراجی اس تاریخ سے کافی پہلے[1] دلی پہنچا ہوگا، ہیروں کے اطراف میں اس کی تدفین سے یہ قیاس ہوتا ہے کہ اس کا مستقر وہی علاقہ تھا، پھر اسی علاقے میں اس کی بنوائی ہوئی مسجد اور گرمابے سے اس قیاس کی ایک گونہ تائید ہو جاتی ہے، عزالدین بختیار کے بارے میں رفتہ رفتہ جو اطلاعات ملتی گئیں ان سے اس امر کا ثبوت فراہم ہوتا ہے کہ تحقیق جامد چیز نہیں، اس کا عمل دوامی ہوتا ہے، محقق کو اپنے فیصلے پر اٹل نہیں ہونا چاہیے، نئے مواد اور نئے ثبوت کے پیش نظر اسے اپنے فیصلے پر نظر ثانی کے لیے ہر وقت تیار رہنا چاہیے۔

اب میں ہانسی کے چند اور کتبات کا ذکر کرنا چاہوں گا۔

شاہ نعمت اللہ کا مزار اور وہاں کے کتبے

شاہ نعمت اللہ کا مزار غالباً لودی دور میں تعمیر ہوا ہوگا۔ البتہ اس کی دیوار کے پتھر

---

[1] اس سلسلے کی تفصیل میرے مقالے میں ملے گی۔

[2] مہرداد شکوہی، ص ۲۷-۲۹، نیز عکس پلیٹ نمبر ۷۵۔

پرانی عمارتوں کے ہیں جو قرب و جوار کے کھنڈروں سے حاصل کر لیے گئے ہوں گے۔ ان پتھروں میں کچھ ایسے بھی ہیں جن پر تاریخی کتبے ملتے ہیں، چنانچہ ایک پتھر پر معز الدین محمد بن سام (متوفی ۶۰۲ھ) کا نام کندہ ہے، وہ کسی مسجد کا پتھر ہے، اس پتھر میں دائیں جانب یہ عبارت کندہ ہے:

• بسم اللہ الرحمن الرحیم مَن بنی للہ مسجداً ولو مثل مفحص قطاۃ بنی اللہ لہ بیتاً فی الجنۃ۔

بائیں طرف یہ عبارت ملتی ہے:

"..... معز الدنیا والدین ابی مظفر محمد بن سام ناصر امیر المومنین غفر اللہ لہ - فی سنۃ ثمانیۃ وثمانین وخمسائۃ"

معز الدین محمد بن سام کے عہد کا کتبہ جو قطب مینار میں ہے، وہ ایک سال قبل کا ہے اور وہ عربی فارسی کا ملا جلا کتبہ ہے۔

لے یہ بہت مشہور حدیث ہے جو مسلم، کتاب المساجد، ترمذی، کتاب الصلوٰۃ، کتاب الصلوٰۃ، نسائی، کتاب المساجد باب قیام اللیل، ابن ماجہ، کتاب الاقامۃ، کتاب المساجد، کتاب التجارات، دارمی، کتاب الصلوٰۃ میں پائی جاتی ہے، اور مسند احمد بن حنبل ج ۱، میں نمبر ۲۰، ۴۷، ۵۳، ۵۹، ۶۱، ۷۰، ۲۴۱، ۱۲۴۱، اور ج ۲ نمبر ۲۲۱ کے ذیل میں نقل ہے۔

ﷺ زیر نظر حدیث کی کئی روایتیں ہیں، ابن ماجہ، ابواب المساجد کی روایت یہ ہے:

حدثنا یونس بن عبد الاعلی ثنا عبد اللہ بن وھب عن ابراھیم بن نشیط بن عبد اللہ بن عبد الرحمن بن ابی الحسین النوفلی عن عطاء بن ابی رباح عن جابر عبد اللہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: من بنی مسجداً للہ کمفحص قطاۃ او اصغر بنی اللہ لہ بیتاً فی الجنۃ

ﷺ مہرواد شکوہی نے اس کو "کمفص" لکھا ہے (ولو مثل کمفص)، حالانکہ اصل کتبے میں مفحص ہے، اور "مثل" کے بعد "ک" کے اضافے کی ضرورت نہیں ہے۔ مفحص کے معنی وہ گڑھا جو سنگخوار (یعنی قطاۃ) انڈے دینے کے لیے بناتی ہے، مفاحص جمع؛ مثل الیس لہ

شاہ نعمت کے مزار کا ایک اور پتھر پر کتبہ تھا جس کے صرف کچھ حصے پڑھے جا سکے ہیں؛

دائیں طرف : السلطان

بائیں طرف ... ناصر امیر المومنین

اگر اس عبارت کو اس سے پہلے والے کتبے کی روشنی میں دیکھا جائے تو یہ قیاس بیجا نہ ہوگا کہ اس کتبے کا بھی تعلق السلطان معز الدین محمد بن سام سے ہوگا اس لیے کہ وہ بھی "ناصر امیر المومنین" کہلاتا تھا۔

ایک اور قدیم کتبہ کسی جامع مسجد کا ہے جس میں یہ الفاظ پڑھے جاتے ہیں؛

امر ببناء ھذا المسجد الجامع الامیر الاعظم سپہسالار الاجل

مخصوص قطاۃ،

[٤] لغت نامۂ دہخدا شمارۂ مسلسل ۱۰۹ ص ۲۴۵ میں قطاۃ کی تشریح اس طرح ہے؛ قطاۃ مرغی است کہ سنگخوار نامند (منتہی الارب)، پرندہ ایست بشکل کبوتر کہ آواز آن قطا قطا است ... فرہنگ معین ۲، ۲۶۸۹ قطات ، قطاۃ ع.بی سنگخوار، سنگخوارک، جمع قطا قطوات ۔ ایضاً ۲ ، ۱۹۳۹ سنگخوارک پرندہ ایست از راستۂ ماکیان کہ درصحاری لای بوتہ ہای گون وخار بالانہ میسازد و دارای پرواز مقطع و کوتاہ ولی سریعی می باشد، پرہایش خاکستری تیرہ وقدش کوچکتر از کبک است۔

[٥] طبقات ناصری ج ۱ ص ۳۹۵ پر معز الدین محمد کا لقب قسیم امیر المومنین اور ص ۴۰۵ پر ناصر امیر المومنین ہے، سلطان التتمش کا یہی لقب تھا، جو اسے ۶۲۵ میں خلیفۂ بغداد کی طرف سے ملا تھا جس کی تفصیل طبقات ج ۱ ص ۴۴۷ پر درج ہے۔

[٦] طبقات ناصری ج ۱ ص ۳۹۹ سے معلوم ہوا کہ ۵۸۷ میں رائے پتھورا پر حملہ ہوا مگر وہ نتیجہ خیز نہ ثابت ہوا، دوسرے سال پھر حملہ کیا گیا چنانچہ تراین کی جنگ میں رائے کو شکست ہوئی اور اس طرح دلی، اجمیر، خطۂ سوالک (ہانسی، سرستی) وغیرہ پر معز الدین محمد بن سام کا قبضہ ہوا۔

الکبیر تاج الدولہ والدین امیر تمرانی [۱] السلطانی۔
ان کے علاوہ اور بھی کتبات ہیں، ان میں بعض مذہبی رنگ کے ہیں جن پر کوئی تاریخ باقی نہیں ہے، مثلاً ایک کتبے کے یہ الفاظ ہیں:

لاالٰہ الا اللہ وحدہٗ لاشریک لہ واشھد انّ محمداً عبدہٗ ورسولہ

وباللہ التوفیق والعون۔

برسی دروازے کا کتبہ: قلعے کے برسی دروازہ پر جو کتبہ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دروازہ ۷۰۲ھ میں سلطان علاء الدین خلجی (۶۹۵-۷۱۶ھ) کے عہد میں تعمیر ہوا تھا، اس کی چند قابل ذکر خصوصیات ہیں:

۱۔ یہ کتبہ منظوم ہے، اور اس کی اہمیت اس بنا پر اور ہے کہ منظوم کتبے قدیم زمانے کے نہیں ملتے۔

۲۔ اس میں تاریخ فارسی زبان میں ہے، اور مہرداد شکوہی کے بقول اس[۱] سے قبل کی کوئی تاریخ فارسی میں نہیں ملتی۔ کتبہ ملاحظہ فرمائیں:

بعہد مملکت پادشاہ روی زمین — خدایگان سلاطین علاء دنیا دین
ابوالمظفر شاہ جہان محمد شاہ — کی باد مملکتش جاودان بروی زمین
یگانہ خسرو گیہان سکندر ثانی — رسیدہ صیت معالیش تا بعلیین
بنا نہادہ شد این بی نظیر دروازہ — کزار تفاع بکیوان ہمی کند تمکین
بسمت حضرت دہلی کہ ہست دار الملک — ایام حکم .. العز درین حصار حصین
پنجشنبہ و روز دہم ربیع آخر — بسال ہفصد و سہ آمدہ عمارت این

برسی دروازے کے حسب ذیل کتبے سے معلوم ہوتا ہے کہ جو دروازہ علاء الدین

---

[۱] مہرداد شکوہی نے اپنی کتاب (ص ۲۲) میں بعد کے دو حسب ذیل کتبے کی نشاندہی کی ہے: مبارک شاہ خلجی کا بیانہ میں جو ۷۱۸ھ کا ہے، اور محمد بن تغلق کا جو ناگور میں ہے اور جس کی تاریخ ۷۳۳ھ ہے۔ ان دونوں میں تاریخ فارسی میں ہے۔

خلجی کے عہد میں بنا تھا، ابراہیم لودی کے عہد میں ۹۲۸ھ میں اس کی مرمت ہوئی، کتبہ[1] یہ ہے۔

بنا رعمارت این دروازہ متین غلوی با مرمت حصن حصین علائی کہ مورخہ است

سنہ اثنی وسبعمائہ در عہد سلطان السلاطین ابوالمظفر ابراہیم شاہ سلطان

خلداللہ ملکہ وسلطانہ و در عمل مسند عالی حمید خان بن ہیبت خاں کمال و در شقداری

خواجہ شرف ؟ محمد بفرمایش آصف ؟ بن کمال بختیار فی الخامس من شہر

ذی القعدہ سنہ ثمان وعشرین تسعمائہ کاتب حکما بالنصر مفتی ہانسوی (ص ۴۴)

اس کتبے میں کئی نام آئے ہیں، عامل خطہ مسند عالی حمید خاں وہی ہے جو جمادی الاول ۹۳۲ھ میں بابر کی فوج سے شکست کھا چکا تھا، شقدار خواجہ شرف اور آصف بن کمال بختیار جس کی فرمائش سے یہ کام انجام پذیر ہوا تھا، دونوں کی شخصیتیں مجہول ہیں کاتب جس کا نام صحیح نہیں پڑھا جا سکا مگر جس کی نسبت ہانسوی واضح ہے، ابھی کوئی معروف شخص نہ تھا کتبے میں دروازہ کی تعمیر کا سنہ ۷۰۲ درج ہے جب کہ دروازہ کی تعمیر کا سال اصل کتبے میں سنہ ۷۰۳ ہے، ممکن ہے کہ دروازہ کی تعمیر کی ابتدائی تاریخ ۷۰۲ تکمیل کی ۷۰۳ ہو،

"چہار قطب" کے اندر ابوبکر جلوانی کی مسجد ہے جس کی تعمیر کی تاریخ ۲۱ رجب ۸۹۶ھ ہے۔ یہ ۸ سطری کتبہ فارسی میں اور خط نسخ میں ہے لیکن ابھی ٹھیک طور پر پڑھا نہیں جا سکا ہے، بہر حال بہرداد شکوہی نے اس کو اس طرح پڑھا ہے۔

الملک للہ، در عہد پادشاہ مملکت سکندر شاہ بن بہلول شاہ

السلطان خلداللہ ملکہ وسلطانہ

بتوفیق اللہ تعالی بندہ درگاہ سبحانی ابابکر جلوانی کہ یکی

از مریدان پیر دستگیر سلطان المشائخ شیخ ابوالفتح قدس اللہ سرہ العزیز

است در پایان قطب اقطاب عالم شیخ جمال الحق والشرع والدین

طاب ثراہ وجعل الجنۃ مثواہ ونوراللہ مرقدہ در وقت جلوس سجادہ بندگی

---

[1] دیکھئے پلیٹ ۸۱، کتبہ کی عبارت پڑھی گئی ہے وہ جگہ جگہ مشتبہ ہے۔

سلطان المشائخ شیخ مزید مداللہ عمرہ این مسجد راست کنانید تاہر کہ
درین مسجد نماز گزارد بدعاء و بیان یاد کند کاتب حروف رضی قطب نایب
قاضی ہانسی... مرید شیخ و شحنۂ دھرون عبید لملک ابدی
الحادی والعشرین من ماہ رجب رجب قدرہ سنہ ست و تسعین وثمانمائۂ
سنگتراش لدہ بن جلال ناگوری (ص ۴۶-۴۷)

اس سے اتنی بات معلوم ہوئی کہ سلطان سکندر لودی کے عہد میں ابابکر جلوانی نے سلطان المشائخ شیخ ابوالفتح کے مسند سجادگی بر جلوہ آرا ہونے کے وقت اس مسجد کو ٹھیک کرایا تھا۔ جلوانی سلطان المشائخ کا مرید تھا اور مسجد شیخ جمال الحق ہانسوی کی درگاہ کے اندر میں تھی۔ کتبے کا کاتب کا نام رضی قطب نایب قاضی ہانسی تھا۔ سنگتراش کا نام لدہ ناگوری تھا۔

چونکہ کتبہ ٹھیک طور پر پڑھا نہیں جاسکا، اس لیے جو اور نام اس میں آئے ہیں، ان کا صحیح تعین نہیں ہو سکا ہے۔

چہار قطب درگاہ کے داخلے کے دروازہ پر ایک دوسطری کتبہ فارسی میں ہے جس میں یہ الفاظ پڑھے جاسکے ہیں۔

... گیلانی و فردوس مکانی

... بندہ مسعود محمد صفاہانی بود (ص ۳۸)

ہانسی شہر میں ایک مسجد بوعلی بخش کہلاتی ہے جو ایک رہائشی مکان میں تبدیل ہو چکی ہے، اس میں ایک قدیم کتبہ ہے جس کی تاریخ منتصف ربیع الآخر ۶۲۳ھ ہے، کتبے کی عبارت یہ ہے:

هذا عمارة المسجد العبد الضعيف احمد بن محمد اسعندی
فی المنتصف ربیع الآخر سنة ثلث والعشرين وستمائة: ۶۲۳
(ص ۳۸)

التمش کے عہد کا یہ کتبہ خاصا اہم ہے، لیکن اس کے تعمیر کرنے والے کی شخصیت

کا صحیح تعین نہیں ہو سکا ہے۔ اس کا نام احمد بن محمد السمندی معلوم ہوتا ہے اس سے چند ماہ قبل
کا کتبہ ایک خاتون کا ہے جس کی تاریخ ۲۱ ذی قعدہ ۸۲۲ھ ہے

(۴) حصار کے دو کتبے

حصار شہر فیروز شاہ تغلق کا بسایا ہوا ہے، جو حصار فیروزہ کے نام سے مشہور تھا، وہ اس خطے کا سب سے بڑا سیاسی مرکز ہوا، چنانچہ اسی کی وجہ سے ہانسی جیسے تاریخی شہر کی اہمیت ختم ہو گئی، حصار کی عظمت عرصہ تک باقی رہی، ابراہیم لودی کے عہد میں اس کا حاکم حمید خاں تھا، بابر کے حملے کے وقت حصار کی قیادت اسی کے ہاتھ میں تھی چنانچہ وہ بابری فوج کے اس دستے سے ہارا جس کی کمان ہمایوں بادشاہ کے ہاتھ میں تھی، جب ہمایوں نے یہ علاقہ فتح کر لیا تو بابر نے خوش ہو کر ہمایوں کو اسی سے خطے کا حاکم بنا دیا۔ حصار میں کچھ کتبے ہیں، لیکن وہ مغل دور سے قبل کے نہیں، مہرداد شکوہی کی کتاب میں جو ہمارے مقالے کا تنہا ماخذ ہے، دو کتبے درج ہیں، ایک "پرانے گوشالے" میں ہے جو بایزید کے حکم سے ۹۷۵ ہجری میں تیار ہوا اور دوسرا میر عاشق کے مقبرے پر ہے جس کی تاریخ ۹۴۴ھ ہے۔

پرانے گوشالے کے مقبرے کا منظوم فارسی کتبہ یہ ہے:[1]

خوشا گنبد روضۂ چوں بہشت — گل و خشت او مشک و عنبر سرشت
زانفاس با غش معطر دماغ — روان سلسبیلی زا شجار و کشت
دبیر فلک گشتہ برگرد او — کہ تاریخ بر گنبد آمد نوشت

(سنہ ۹۷۵)

ہزار آفرین بر ابای یزید — کہ حکمش بہ بنیاد بنہاد خشت

(کتبہ کبیر)

دوسرا مقبرہ میر عاشق کا ہے،[2] یہ گجرات میں مغل سپاہی کی حیثیت سے دشمن

---

[1] مہرداد شکوہی، ص ۴۰
[2] ایضاً ص ۴۱

سے نبرد آزمائی میں مارا گیا، اس کی لاش حصار لائی گئی اور وہیں رمضان ۹۴۴ھ میں دفن ہوا گجرات کی فوج کا ذکر کتبے میں ہے، اس فوج سے مراد وہ فوج ہے جو ہمایوں کی سرکردگی میں ۹۴۱ھ میں بہادر شاہ گجراتی سے لڑنے گئی تھی۔ اس فوج میں حصار کے اطراف کے سپاہی بھی شامل ہوں گے، ان کے مارے جانے کے بعد ان کی لاشیں حصار لائی گئی ہوں گی، انھیں میں ایک شخص میر عاشق بھی تھا، جس کے کتبے کے تعلق سے یہ چند سطریں تحریر ہو رہی ہیں۔

میر عاشق کے قبر کی عمارت کے کتبے کی یہ عبارت ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم در عہد میمون دولت ہمایوں۔
سلطان الھند والخراسان رافع رایات المجاھدات والمغازی
ظھیر الدین محمد ھمایوں بادشاہ غازی خلد خلافتہ
بتاریخ ماہ رمضان سنہ اربع و اربعین و تسعمائہ این عمارت
ازبھر ؟
میر عاشق محمد بن میر شاہ علی شد و این جوان در لشکر گجرات شہادت
یافت و مبلغ دوازدہ ہزار تنکہ سیاہ خرج شدہ

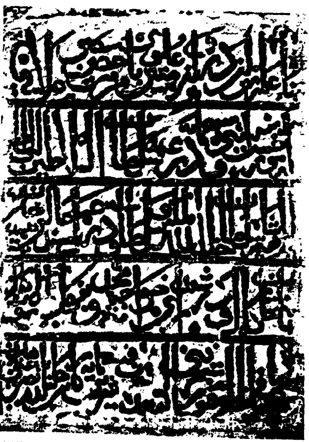


PLATE 82 HANSI Barsi Gate An old ink rubbing of the inscription of the time of Ibrāhīm Shāh (Pl



PLATE 81 HANSI Barsī Gate Historical inscription from the time of the Lodi Sultan Ibrāhīm Shāh recording a restoration of the gate and dated Zu 'l-Qa'da 928 H

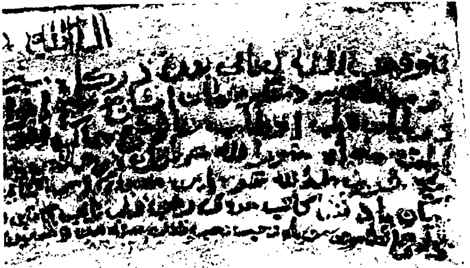


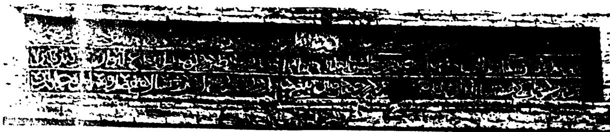
PLATE 84a HANSI Mosque of Abābakr Jalwānī at the shrine of Chahār Quṭb Detail of Plate 83, right-hand side



PLATE 88b The same photograph of [illegible] rubbing



PLATE 90 HISAR. Tomb of Mir 'Ashiq Muhammad. Inscription above the western entrance recording in Persian the construction of the building in 944 H.



PL. VII 9b. HANSI. Barsi Gate. Historical inscription of the Khalji Sultan 'Ala'd-Din Muhammad recording in Persian the construction of the gate and dated 10 Rabi II 703 H.



PLATE 76a HANSI Rauza of Shāh Ni'matu llah general view

ڈاکٹر آصفہ زمانی

سید انشاء[1] کی فارسی نثر

اردو ادب میں سید انشاء اللہ خاں انشاء دو حیثیتوں سے ممتاز ہیں، اول شاعر دوم نثر نگار شاعر کی حیثیت سے ان کا شمار لکھنؤ کے رنگ سخن کے بانیوں میں ہوتا ہے چنانچہ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ لکھنؤ کے دبستان شاعری کا تصور مصحفی و انشاء، رنگین و جرأت کے ناموں کی شمولیت کے بغیر غلط ہوگا، نیز مصحفی و انشاء کی ادبی چشمکیں اردو ادب کی ناقابل فراموش حقیقت اگرچہ انشاء کی شہرت کا باعث ان کی شاعری ہے لیکن نثر میں بھی ان کے کارنامے ناقابل فراموش ہیں۔ ان کی نثری کاوشوں میں "رانی کیتکی کی کہانی" اور "سلک[2] گہر" اردو نثر سے متعلق ہیں اور دریائے لطافت" اور لطائف السعادت" فارسی

---

۱ پیدائش صفر ۱۱۶۶ھ مطابق دسمبر ۱۷۵۲ء بمقام مرشدآباد (بنگال) وفات دوشنبہ ۳۰ جمادی الثانی ۱۲۳۳ھ مطابق ۱۹ مئی ۱۸۱۷ء بمقام لکھنؤ مصحفی نے انشاء کی تاریخ وفات کہی ؎

انشاء اللہ خان کہ بود از فصحا ۔۔۔ زیں دار چون رفت جانب ملک بقا

تاریخش گفت مصحفی بی کم و کاست ۔۔۔ ای وائی کہ مردہ قدردان شعرا ۱۲۳۳ھ

باقی آگے صفحہ پہ

نثر سے تعلق رکھتی ہیں، ایک ترکی روز نامچہ[۱] بھی ہے۔ چونکہ ہمارا موضوع سید انشار کی فارسی نثر سے متعلق ہے لہذا ان کی دیگر نثری تصانیف سے صرف نظر کرتے ہوئے ذیل میں ہم اسی پر تفصیلی گفتگو کریں گے۔

سید انشار خداداد ذہانت وطباعی، شوخی وظرافت کے مالک تھے۔ انھیں کئی زبانوں پر بیک وقت قدرت حاصل تھی۔ مشہور ہے کہ سعادت علی خاں کی مسند نشینی کے موقع پر انھوں نے چونتیس زبانوں میں ایک قصیدہ کہا تھا[۲]۔ اس کی اصل کچھ بھی ہو لیکن عربی و فارسی نیز اردو میں ان کی علمیت اور زباں دانی میں دو رائیں نہیں۔

بقیہ پچھلے صفحہ کا[۲] رانی کیتکی کی کہانی انیسویں صدی کے آغاز میں لکھنوی نثر کے اولین نمونوں میں سے ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ خالص ہندوی اردو زبان میں لکھی گئی یہ طبع زاد نثری داستان ہے۔ اس کا سال تصنیف ۱۸۰۳ء خیال کیا جاتا ہے لیکن مولانا عرشی کی تحقیق کے مطابق یہ ۱۲۲۳ھ کی تصنیف ہے۔ یہ متعدد بار اردو اور دیوناگری میں چھپ چکی ہے۔ اردو میں اسے مسٹر شفٹ (پرنسپل لامارٹینر کالج لکھنؤ) اور ریونڈ سٹیلر (پروفیسر بشپ کالج کلکتہ) نے ۱۸۵۲۔۱۸۵۵ء کے درمیان رسالہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں چھپوایا اس کے بعد ڈاکٹر عبدالحق نے اسے رسالہ اردو (ماہ اپریل سنہ ۱۹۲۶ء) میں شائع کیا۔ کتابی صورت میں یہ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد سے سنہ ۱۹۳۳ء میں شائع ہوئی۔ تیسرا اڈیشن سنہ ۱۹۵۵ء میں ڈاکٹر عبدالحق کے نام سے انجمن ترقی اردو کراچی سے شائع ہوا اسے عرشی صاحب نے مرتب کیا تھا۔

[۳] سلک گہر باعتبار زبان انتہائی مغلق اور ناقابل فہم ہے۔ چالیس صفحہ کی یہ داستان صنعت غیر منقوط میں لکھی گئی ہے۔ عبارت مقفیٰ ہے۔ سلک گہر کا ایک مخطوطہ جو کتب خانہ رام پور کی امانت ہے مولانا عرشی کی دریافت کا نتیجہ ہے۔ اسے انھوں نے سنہ ۱۹۴۸ء میں اسٹیٹ پریس سے شائع کر دیا ہے۔

[۱] یہ روز نامچہ ترکی زبان میں ہے۔ اور کل چھتیس دن کی روداد پر منحصر ہے (۱۸ جمادی الاول سنہ ۱۲۲۲ھ مطابق ۱۲ جولائی سنہ ۱۸۰۸ء تا ۲۵ جمادی الثانی سنہ ۱۲۲۳ھ مطابق ۱۸ اگست ۱۸۰۸ء) اس کو ڈاکٹر سید نعیم الدین نے مرتب کیا اور یہ روز نامچہ ترقی اردو بورڈ نے شائع کیا۔

[۲] بحوالہ تاریخ فرخ آباد از مفتی میر ولی اللہ

انشار کی " دریائے لطافت " کا شمار ان کی معرکۃ آلآرا تصانیف میں ہوتا ہے ۔
دریائے لطافت اردو کے اصولِ زبان سے تعلق رکھتی ہے ۔ اس موضوع پر کسی ہندوستانی کے قلم سے لکھی ہوئی یہ پہلی تصنیف ہے ۔[1]

اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے دوران یورپ میں زبانوں کے تاریخی و تقابلی مطالع کی طرف توجہ دی گئی ۔ ایک انگریز قانون داں سر ولیم جانس نے ۱۷۸۶ء میں باقاعدہ اس کی بنیاد ڈالی[2] اردو زبان و قواعد اور لغت کی جانب پہلی بار اہل یورپ نے دلچسپی کا اظہار کیا ۔ اس سلسلہ میں شلز ، ہنٹرے ، جان گلکرسٹ ، جان شیکسپیر ، گارساں دتاسی ، ڈنکن فاربس ، رچرڈسن اور ایس ڈبلیو فیلن قابلِ ذکر ہیں ان علمار نے انگریزی یا یورپ کی دوسری زبانوں کو اظہارِ خیال کا ذریعہ بنایا ۔

عین اسی زمانے میں ہندوستان میں سراج الدین علی خاں آرزو (۱۶۸۸ء / ۱۷۵۶ء)

---

[1] دریائے لطافت پہلی بار مولوی مسیح اللہ خاں بہادر کاکوروی کے مطبع آفتاب عالم تاب مرشد آباد میں غالباً ۱۸۵۳ء میں شائع ہوئی ۔ بعد کو یہ کتاب مولوی عبدالحق کے مقدمہ کے ساتھ ۱۹۱۶ء میں الناظر پریس میں چھپ کر انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن) سے شائع ہوئی ۱۹۳۵ء میں پنڈت برج موہن دتاتریا کیفی نے اس کا ترجمہ اردو میں کیا جو مولوی عبدالحق کے مقدمہ کے ساتھ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد سے شائع ہوا ۔

[2] سر ولیم جانس نے ۲ ستمبر ۱۷۸۶ کو ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کے ایک سیمینار میں ایک مقالہ پڑھا جس میں اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ سنسکرت یونانی اور لیٹن زبانوں میں غیر معمولی حد تک مماثلت پائی جاتی ہے ۔ اس کے اس مقالے کے بعد اذہان اس طرف متوجہ ہوئے اور زبانوں کے تقابلی مطالعہ کی طرف توجہ دی جانے لگی ۔

[3] دریائے لطافت کے اختتام پر انشار کے کہے ہوئے اس قطعہ سے ۱۲۲۲ھ کا استخراج ہوتا ہے

چوں حسب حکم ناظمِ ملک و جہانیان ۔۔۔ نواب مستطاب وزیر فلک جناب
شد منتظم قواعد اردو بہ سلک سلک ۔۔۔ اردوئے ناظمی شدہ تاریخ ایں کتاب

(۱۲۲۳ھ = ۲۲۲ + ۱۰۰۱)

"نوادرالالفاظ" (۱۷۵۱-۲ء) میں لغت نویسی کو اور انشاء اللہ خاں انشاء (۱۷۵۲ء - ۱۸۱۷ء) دریائے لطافت (۱۸۰۷ء / ۱۲۲۲ھ) میں زبان اردو اور اس کی طبقاتی بولیوں کے فرق کو زیر بحث لائے انھوں نے اظہار بیان کے لیے فارسی کا انتخاب کیا۔

اگرچہ انیسویں صدی کی ابتداء سے اردو نثر کی طرف توجہ دی جانے لگی تھی جس کی جیتی جاگتی مثال فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے وہ نثری تراجم تھے جو فارسی سے اردو میں منتقل ہو رہے تھے لیکن اس کے باوجود فارسی میں اظہار خیال کرنا بہر حال علمیت کی دلیل سمجھا جاتا تھا اور یہ رجحان انیسویں صدی کے نصف آخر تک نظر آتا ہے، جس کی سب سے بڑی نظیر غالب کی فارسی نثر ہے۔ حتیٰ کہ شعراء بھی اردو کی جانب متوجہ ہونے کے باوجود فارسی میں شعر کہنا باعث فخر سمجھتے تھے چنانچہ انشاء نے بھی، جو اردو کے مسلم الثبوت استاد مانے جاتے ہیں فارسی میں قصائد و مثنویات کے علاوہ دیوان غزلیات یادگار چھوڑا۔ اور نثر میں "دریائے لطافت" اور "لطائف السعادت" جیسی کتابیں یادگار چھوڑیں۔

"دریائے لطافت" نواب سعادت علی خاں کی فرمائش پر لکھی گئی مقدمہ میں انشاء نے اس کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے؛

... خلاصۂ کلام ایں کہ امتثال امر عالی کہ بشر را چون قضا از آن گریز نیست و نباشد، ذخیرۂ خیر جاودانی دانستہ، دستِ ہمت بدامنِ توفیق آویختم[1]

اس کتاب کے چار نام تجویز ہوئے تھے جس میں دو انشاء کے تجویز کردہ تھے اور دو مرزا قتیل کے انشاء نے اس کی تفصیل یوں بیان کی ہے:

"... تسمیۂ کتاب کہ ہم صاحب چار نام پاکیزہ است مشارکِ یکدیگر، ہم دو نام از زبانِ راقم چکیدہ، یکی "ارشاد ناظمی" ازین جہت کہ بارشاد ناظم الملک بہادر تالیف پذیرفتہ، و دیگر "بحر السعادت"

---

[1] دریای لطافت مقدمہ۔ صفحہ ۴-۵

و دو نام دیگر دو گوہر است کہ از نیسان زبانش بار یدیکی دریائے
لطافت" دیگر "حقیقت اردو یلہ

قرعۂ فال دریائے لطافت، کے نام نکلا اور یہ کتاب اسی نام سے مشہور ہوئی۔
مولانا عرشی کی تحقیق تک یہ کتاب اردو قواعد کی پہلی تصنیف سمجھی جاتی رہی، لیکن
جس وقت مولانا امتیاز علی عرشی نے اُحد علی خاں یکتا کی دستورالفصاحت" کا پتہ لگایا تو
انھوں نے بعض شواہد کی روشنی میں اس کے زمانۂ تصنیف کو ۱۲۱۳ھ قرار دیتے ہوئے
بہ لحاظ قدامت انشار کی 'دریائے لطافت (۱۲۲۲ھ) پر اس کو ترجیح دی۔ کچھ مدت بعد
عابد پشاوری صاحب نے مولانا عرشی کی تحقیق پر گرفت کی اور بعض داخلی و خارجی
شواہد کی روشنی میں دلائل و براہین کے ساتھ بڑی تفصیل سے بحث کرتے ہوئے مولانا
عرشی کی تحقیق سے انحراف کیا اور یہ ثابت کیا کہ "دریائے لطافت" دستورالفصاحت سے
قبل ہی کی تصنیف ہے۔ نیز یہ کہ دستورالفصاحت کا آغاز ۳۲-۱۲۳۱ھ کے دوران ہوا اور
یہ ۱۲۴۳ھ تک پایۂ تکمیل کو نہیں پہونچی تھی ۳

دریائے لطافت میں ابواب کی تقسیم میں انشار نے لفظ "دردانہ" اور جزیرہ" کا
انتخاب کیا ہے۔ چنانچہ اس میں پانچ دردانے ہیں جو ایک صدف کے تحت بیان کئے گئے
ہیں، اور سات جزیرے ہیں۔ ہر جزیرہ ضمنی سرخی کے طور پر چار شہر پر منقسم ہے۔ علاوہ
جزیرۂ ہفتم کے جس میں صرف دو شہر ہیں۔ آخری بات کا عنوان بارغ رکھا ہے۔ اس باب میں
اقسام نظم کا ذکر ہے یہ حصہ بھی انشار کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ ابواب کی تقسیم کے بارے میں خود

لہ دریای لطافت مقدمہ مرشد آبادی ایڈیشن صفحہ ۵

ٹہ مولانا امتیاز علی خاں عرشی ناظم رضا لائبریری رامپور نے سید احمد علی یکتا کی دستورالفصاحت
کو اپنے مقدمے اور خاتمے کے ساتھ ۱۹۴۳ء میں شائع کیا۔

ٹہ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ انشاء اللہ خاں انشاؔ از عابد پشاوری، اتر پردیش اردو اکادمی
لکھنؤ ۱۹۸۹ء صفحہ ۵۵۹ تا ۵۰۵

انشار کا بیان ملاحظہ ہو:

"... پوشیدہ نماند کہ این "دریائے لطافت" مشتمل است بر یک صدف پر از گوہر سلطان پسند و ہفت جزیرۂ وسیع، تفصیلش اینکہ صدف پنج دردانۂ یتیم دارد ..."

انشار کے پیش رو اس قسم کی اردو قواعد کا کوئی نمونہ نہ تھا۔ ان کی یہ قواعد غیر تقلیدی ہے انھوں نے زبان کے سلسلہ میں جو بھی مسائل اٹھائے ہیں انھیں انتہائی سائنٹفک اصولوں پر برتا ہے۔ آج اردو ہندی کا مسئلہ کس قدر الجھا ہوا ہے۔ بڑے بڑے لسانیات کے ماہر اس گتھی کو سلجھانے میں مصروف ہیں کس لفظ کو اردو کہیں اور کسے ہندی؟ ذرا انشار کی طرف نظر اٹھا کر دیکھئے انھوں نے آج سے تقریباً پونے دو سو برس پہلے کس قدر آسانی اور کتنی سادگی سے صرف ایک جملے میں یہ مسئلہ حل کر دیا تھا کہ:

"... ہر لفظ جو اردو میں مشہور ہوگیا عربی ہو یا فارسی ترکی ہو یا سریانی، پنجابی ہو یا پوربی از روئے اصل غلط ہو یا صحیح وہ لفظ اردو کا لفظ ہے۔"

یہاں ہمیں انشار کی وسعت نظر اور اصابتِ رائے کا قائل ہونا پڑتا ہے۔

علم اللسان کی بنیاد حروف تہجی (اصوات) پر ہے۔ اس موضوع پر بیسیوں کتابیں لکھی گئی ہوں گی لیکن جو انداز تفکر انشار نے اختیار کیا اور ان کی نظر جس جس زاویے سے پہونچی ان سے پہلے تو خیر اس طریقۂ کار کو برتا ہی نہیں گیا بعد کو بھی اسے اس طرح پرکھا نہیں گیا۔ انشار نے اس کتاب کے دردانۂ اول ہی میں یہ بحث اٹھائی ہے اس میں شک نہیں کہ یہ اس کتاب کا سب سے اہم بات ہے۔ انشار نے اس باب میں اردو حروف تہجی کی تعداد پچاسی قرار دی ہے اس سلسلہ میں انھوں نے بڑی بڑی جدت طرازیاں کی ہیں۔ مثلاً انھوں نے اُن حروف کی بھی پہچان کرائی ہے جو کسی خاص حرف سے مل کر آواز پیدا کرتے ہیں مثلاً سترہ حروف ایسے ہیں جو "ن" کے ساتھ مل کر آواز پیدا کرتے ہیں۔ یا سترہ حروف ایسے ہیں جو "ہ" کے ساتھ مل کر آواز پیدا کرتے ہیں یا بعض ایسے ہیں جو "ی" کے ساتھ مل کر بنتے ہیں: ملاحظہ ہو انھیں کے الفاظ میں اس کی تشریح:

"۔۔۔ چون زبان اردو عطر زبان ہای دیگراست حرو فیکہ درین زبان بتلفظ درمی آید ہشتاد و پنج حروف است نزد فصیحان اہل تحقیق و نزد عوام تحقیق ناآشنایان نود و پنج حرف است ۔۔۔ مثلاً ہفدہ حرف با نون یکی شدہ انگرکھا" نام لباس، "ننگڑی" باتای ہندی، بمعنی "ساق"

۔۔۔ ہفدہ حرفیکہ با ہا یکی ہستند، "بھاگنا" بمعنی "گریختن" "پھٹ گیا" بمعنی پارہ شد، "تھوڑا" بمعنی اندک "ٹھنڈا" بمعنی "سرد" مثال ہشت حرف دیگر کہ با یا رو نون اتحاد دارند "گھنگرو" انچہ مہوشاں وقت رقص در پاکنند، "پھندنا" آنچہ چتر پالکی بآن آرایند، "چھنگلیا" انگشتِ کوچک، بعربی خنصر نامند ۔۔۔ مثال یازدہ حروف دیگر کہ با "یار" متحد شدہ اند "پیوسی" انچہ از شیر گاؤ مادہ یا ہرچہ مثل آن بعد زائیدن درست نمایند "کیا" بمعنی "چہ" حرف استفہام "گیارہ" بمعنی یازدہ[1]

زبان وادب کے سلسلہ میں دلی کو مرکزیت حاصل رہی ہے۔

باب دوم میں انتہائی دلچسپ ومعلوماتی انداز میں فصیح وغیر فصیح زبان کی بحث دلی کے محلوں کی مناسبت سے کرتے ہوئے تلفظ و لہجوں کے فرق کی نشاندہی کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ عام طور پر ہندوؤں میں تعظیم وتکریم کے الفاظ "آپ جناب" رائج نہیں، انھوں نے یہ انداز مسلمانوں کی معاشرت سے اخذ کیا اس کی تقسیم ہندی وہ دو طرح سے کرتے ہیں اور دلہ سوم میں لکھتے ہیں:

"۔۔۔ بر صاحب تمیزان پوشیدہ نیست کہ ہندوان سلیقہ و رفتار و گفتار و خوراک و پوشاک از مسلمانان یاد گرفتہ اند ۔۔۔ بالجملہ جمعیکہ در شاہجہاں آبادی باشند دو فرقہ اند بعضی بصحبت مسلمانان رسیدہ و بعضی محروم ماندہ فرقۂ اول از گفتن "دیا" و "کرپا" بمعنی مہربانی"۔۔۔ وچاچا بمعنی برادر خورد

---

[1] دریائے لطافت از انشاء داراناظر پریس واقع بلدہ لکھنؤ طبع گردید، صفحہ ۸۰

پدر، و "تایا" بمعنی برادر بزرگ پدر علیٰ ہذاالقیاس چارہ ندارند، و فرقۂ دوم "باڑا" را "بڑا" و بادزن را "پنکھا" و پدر را "لالا" گویند و معمول اینہا نیست کہ پسر وقتِ صبح سلام بر پدر کند یا وقتِ خطاب، تعظیم او ملحوظ دارد بلکہ وقتِ حرف زدن، پسر با پدر چنان بر بیگانگان ظاہر می شود کہ مخاطب از نوکران کم رتبہ ایں کس است ... [1]

جہاں تک یا شین قاف کی درستگی کا معاملہ ہے، اس کے متعلق انشار کا مشاہدہ ہے کہ:

"... بر ہر کس کہ دوکان فصاحت در شاہجہان آباد گرم کردہ است پوشیدہ نیست کہ ساکنانِ مغل پورہ کہ محلۂ بزرگ شاہ جہان آباد است روزمرۂ اردو با روزمرۂ پنجاب ممزوج ساختہ حرف میزنند ... بعضی مانند ہندوانِ پنجاب در جمیع الفاظ کہ جزو آں "قاف" است بجای آں "کاف" ہر زبان می آرند "قبلہ" را "کبلہ" و "قطعہ" را "کطعہ" استعمال کنند ..." [2]

اور اب ذرا نواحِ دہلی کے متعلق انشار کا مشاہدہ دیکھئے، لکھتے ہیں:

"... از باشندگان ما بینِ ملک گنگا و جمنا یعنی فیروزآباد و شکوہ آباد و اٹاوہ وغیرہ آں بعضی اردو را از زبان دانان یاد گرفتہ اند لیکن لہجۂ خاص شان ایں است کہ ضمیر متکلم شان بعینہٖ آواز بُز است یعنی "ہَہ" با میم مکسور و یاء مجہول و نونِ غنہ، بمعنی "من" ..." [3]

دریائے سوم میں انشار نے ایک بہت اہم بحث اٹھائی ہے اور وہ ہے پیش رو شعرار کے کلام کو مستند ماننا انشار اس خیال کی تردید کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ شعر میں اکثر الفاظ

---

[1] دریائے لطافت۔ صفحہ ۹

[2] " " " ۱۵

[3] " " " ۲۸

ضرورت شعری کی بنا پر بھی استعمال کئے جاتے ہیں، اس لئے ضروری نہیں کہ انھیں فصیح مانا جائے یا سند کے طور پر پیش کیا جائے :

"... بعضی برآنند کہ کلام شعرا در ہر شہر، فصیح تر از کلام دیگران باشد و بعضی محققان برآن کہ در شعر اکثر اوقات ضرورتِ حفظِ وزن و رعایتِ قافیہ مانع فصاحت میگردد .... بعضی الفاظ را خلاف زبان شہر ایشان است برای ضرورت عمداً می آرند نہ از راہ بی خبری دلیل برضعف جواب اینکہ شاعران البتہ زبان شہر خود را خوب میدانند و لفظ بیگانہ نیز عمداً می آرند. لیکن مقلد ایشان کہ از جای دیگر باشد چہ می داند کہ شاعر اردو دانِ دہلوی این لفظ را کہ وعمداً از روی ضرورت، در کلام خود جائز دانستہ یا بی ضرورت اجتہاد نمودہ بلکہ بی چارہ ہر چہ در شعر شش خواہد دید ہمہ را اردوی پاکیزہ خواہد فہمید و با یاران مباحثہ بیجا خواہد کرد و آخر کار پشیمان و خجل خواہد شد، مثل ما مردم کہ ہر چہ در کلام مغل می بینیم، اُن را فارسی می دانیم، گو بعض الفاظ از زبان سریانی ایجاد نمودہ باشد یا از زبان دیگر ..." [1]

دریائے سوم میں دہلی اور لکھنؤ کی فصاحت کا موازنہ کیا ہے، اگرچہ وہ اس معاملہ میں دہلی کو افضل تر قرار دیتے ہیں لیکن چونکہ نواب سعادت علی خاں کے ملازم میں لہذا انھوں نے یہاں بہت پھونک پھونک کر قدم رکھا ہے۔

دریائے پنجم میں انشا نے دہلی کی خواتین کی زبان اور محاوروں کا ذکر کیا ہے، اس بات میں انھوں نے سعادت علی خاں رنگین کی ریختی سے بھی استفادہ کیا ہے، یہ بات بھی لغت کے اعتبار سے خاصا اہم ہے۔

جہاں انشا نے صرف و نحو سے بحث کی ہے وہ بھی غیر تقلیدی اور خاص انشا

---

[1] دریائے لطافت صفحہ ۳۲-۳۳

کے ذہن کی پیداوار ہے۔

کتاب کا دوسرا حصہ جو منطق و عروض و قوافی و معانی و بیان کے ذکر پر مشتمل ہے مرزا قتیل کی کوشش کا نتیجہ ہے۔ اس حصے کے متعلق ناقدین ادب کی رائے یہ ہے کہ انشاء کی بنسبت یہ حصہ کافی کمزور ہے۔

بحیثیت مجموعی دریائے لطافت نہ صرف اردو کی پہلی گرامر کی حیثیت سے قدرو قیمت کی حامل ہے بلکہ ہندوستان کی مختلف بولیوں لہجوں، تلفظ و فقرات و بیگماتی مصطلحات کی اس طرح نشاندہی کرتی ہے کہ قاری کو بالواسطہ طور پر بہت حد تک ہندوستانی تہذیب و معاشرت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ فارسی زبان میں ہونے کی وجہ سے اس کی اہمیت اس وقت سے زیادہ آج ہے، اس لیے کہ وہ فارسی داں حضرات جو اردو سیکھنا چاہتے ہیں ان کے لیے یہ کتاب انتہائی کارآمد اور مفید ہے ایرانی سفارت خانے اور ایران کلچر ہاؤس جیسی جگہوں میں اس کی افادیت بہت زیادہ ہے۔ اور میرا تو مشورہ ہے کہ اس کتاب کے کیسٹ تیار ہونے چاہئیں اس سے لہجے، تلفظ اور مخرج کے سمجھنے میں زیادہ آسانی ہوگی۔ آج کے میڈیا کو دیکھتے ہوئے یہ کام کوئی مشکل کام نہیں۔

'دریائے لطافت' پر اپنی بحث کا اختتام کرتے ہوئے اتنا اور کہنا چاہوں گی کہ جن سوانح نگروں نے انشاء کو محض ایک پھکڑ اور مسخرہ باز کہہ کر پیش کیا ہے "دریائے لطافت" اُن کے اس ایراد پر خطِ بطلان کھینچتا ہے۔

فارسی نثر کے حوالے سے انشاء کی دوسری کتاب " لطائف السعادت" ہے۔ یہ تصنیف نہیں تالیف ہے۔ اس میں نواب سعادت علی خاں اور دیگر متوسلین و حاضرین دربار کے دلچسپ لطیفے ہیں ان کی نجی صحبتوں میں جو لطائف پیش آتے رہے انشاء انھیں از خود جمع کرتے رہے۔ اس تالیف کی اطلاع ہمیں پہلی بار " دریائے لطافت" سے ہی ملتی ہے لطائف السعادت کا ذکر اس میں دو بار آیا ہے اول خطبۂ کتاب" میں دوم دروازۂ سوم میں "خطبۂ کتاب" کی عبارت اس طرح ہے:

"... لطائف حضور اقدس کہ ہر روز بلا فصل دو سہ چار از زبان معجز

بیان ترشح می نمود و می نماید و اس را خود بخود در صفحات "لطائف السعادت"
کہ تا قیام قیامت بہ تمامی مرساد، می نوشتم و می نویسم و خواہم نوشت ۔
حسن خدمت بجای آوردم، می آرم و این ہمہ فرصت بدست نیامدکہ تنہا
رنگ بر چہرۂ این نقش بدیع کشم، مرزا محمد حسین قتیل را نیز شریک ایں
دولت (اہد مدت) ساختم . . . "

لطائف السعادت کی تالیف کا سنہ معلوم نہیں ہو سکا ۔ اس عبارت سے اتنا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس کی تالیف کا زمانہ ۱۲۲۲ھ رہا ہوگا اس لیے کہ یہ عبارت "دریائے لطافت" کے دیباچے کی ہے اور دیباچہ عموماً کتاب کے اختتام پر لکھا جاتا ہے "دریائے لطافت" ۱۲۲۲ھ کی تصنیف ہے اس لیے ہمیں یہ باور کرنے میں تامل نہیں کہ "لطائف السعادت" کا زمانہ تالیف بھی وہی رہا ہوگا ۔ اس کے قلمی نسخے کے لطیفہ نمبر ۲۸ پر ایک جگہ ۱۶ شوال ۱۲۱۸ھ یوم پنج شنبہ مرقوم ہے اس لیے گمان غالب یہ ہے کہ اس کی ابتدا ۱۲۱۸ھ میں ہوئی ہوگی اس طرح یہ کم و بیش پانچ سال کے عرصہ میں پایۂ تکمیل کو پہونچی ہوگی ۔

لطائف السعادت کی ابتدا میں اس کی وجہ تالیف پر روشنی ڈالتے ہوئے انشار نے لکھا ہے کہ :

. . . حضرت پیر و مرشد یعنی . . . ناظم الملک نواب سعادت علی خاں
بہادر . . . اکثر کہ بہ بازار بیان جلوہ می کرد سامعان از ذوق بہ دست
نسیان می فروختند، ایں کمترین کہ رشتۂ عقیدتش روز بروز درازتر است
مستعد آں شد کہ آں دُرّ غرر را بہ نقد جان مشتری گرد و بدو ہمہ را حوالۂ درج
تحریر نماید تا آیندگان را بکار آید امید از عنایت باری آں دارد کہ تا قیام
قیامت ہر روز گل تازہ زیب دامن کاغذ گردد، چوں جنبش امواج از قلزم
زخار طبع بلند جناب مستطاب پیر و مرشدم نواب سعادت علی خاں بہادر است
اگر بہ "لطائف السعادت" موسوم نمایم جا دارد [1]

---

[1] لطائف السعادت ۔ از انشار، مرتبہ ڈاکٹر آمنہ خاتون مطبوعہ کوثر پریس، لکھنؤ (طبع اول) ۱۹۵۵ء صفحہ ۲۰

انشار کی یہ تالیف کتنے لطائف پر مبنی تھی اس کا صحیح اندازہ نہیں کیا جا سکا۔ اس کے ابتدائی سولہ اوراق برٹش میوزیم میں محفوظ رہ سکے جس میں کل ۵۵ لطیفے شامل تھے۔ ڈاکٹر آمنہ خاتون نے اسے مرتب کر کے مع اردو ترجمہ اور تعلیقات و حواشی ۱۹۵۵ء میں شائع کرایا۔[۱]

لطائف سے قطع نظر انشار کی اس تالیف کی اہمیت یوں بھی ہے کہ اس سے نہ صرف نواب سعادت علی خاں اور ان کے معاصرین کے عادات و اطوار کا علم ہوتا ہے بلکہ خود انشار کی عادت و خصلت نیز حلیہ و بشریٰ کے متعلق معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ مثلاً انشار ناس سونگھتے تھے:

"ناس وانی این غلام را ملاحظہ فرمودہ اشارہ نمودند "تمہاری ناس کا ستیاناس جائے قل اعوذ برب الناس"

(لطیفہ نمبر ۹)

وہ شبنم میں سوتے تھے رات میں دو تین بار نہاتے تھے:

"احوال خود ظاہر ساختم کہ غلام در شبنم می خوابد و در شبانہ روز دو سہ مرتبہ غوطہ در آب می زند"

(لطیفہ نمبر ۴۰)

زربفت کا جوتا پہنتے تھے اور باڈی گارڈ رکھتے تھے:

"روزی بہ خیال اینکہ آدم برای محافظت نیست کفش مُغرّق و زرباف را بیرون گذاشتہ کفشِ سادہ پوشیدہ در حضور آمدم ..... (لطیفہ نمبر ۲۵)

منتیں مرادیں مانگنے پر یقین رکھتے تھے:

---

۱ پچپن[۵۵] لطیفوں میں تیس[۳۰] لطیفے فارسی زبان میں ہیں۔ بقیہ پچیس[۲۵] لطیفوں میں اردو کے جملے بھی استعمال ہوئے ہیں۔ سترہ لطیفوں کے اردو جملوں کی ابتدا میں خاص طور پر لکھا ہے کہ یہ جملے "در لہجۂ اردو (لطیفہ ۲، ۲۴) بعبارت اردو" (لطیفہ ۱۸) "بزبان ہندی" (لطیفہ ۲۳) "بزبان اردو" (لطیفہ ۲۹) "در زبان اردو" لطیفہ ۲۷، ۲۹، ۴۰، ۴۱، ۴۲، ۴۶، ۴۷، ۴۹، ۵۲، ۵۳، ۵۴) لکھے گئے۔

"روزی معروض داشتم کہ غلام نذور بسیار قبول کردہ بود کہ چوں خداوند نعمت غسلِ شفا فرمایند بجا آوردہ شود۔۔۔۔۔ (لطیفہ نمبر ۳۰)

آزاد نے آبِ حیات میں لکھا ہے کہ انشار نے علامہ تفضل حسین خاں کی وساطت سے نواب کے دربار میں رسائی حاصل کی، ان لطائف سے اس بات کا علم ہوتا ہے کہ انشا نے اپنی عربی دانی کی وجہ سے دربار میں جگہ پائی اس کتاب سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت دربار کی زبان فارسی تھی کیونکہ اگر کوئی لطیفہ بزبان ہندی یا اردو بیان ہوا ہے تو وہ فوراً وضاحت کرتے ہیں کہ یہ لطیفہ "درلہجۂ اردو یا" بزبان ہندی" ادا ہوا۔

آزاد نے آبِ حیات انشار کی فارسی دانی کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ " فارسی میں انتہائی درجے کی قدرت رکھتے تھے اس میں جب نظم یا نثر کہتے تھے تو یہی معلوم ہوتا تھا کہ گویا بلبلِ شیراز سامنے بول رہا ہے (صفحہ ۲۷۴) لیکن ہمیں آزاد کی یہ عبارت پڑھنے کے بعد شبلی کا وہ قول یاد آگیا کہ آزاد تحقیق کے میدان کا مرد نہیں تاہم اِدھر اُدھر کی گپیں بھی ہانک دیتا ہے تو وحی معلوم ہوتی ہے " انشار کی نظم کے متعلق تو مجھے سرِ دست کچھ کہنا نہیں البتہ نثر کے لیے اتنا ضرور کہنا چاہوں گی کہ دریائے لطافت ہو یا لطائف السعادت اس کا نثری پایہ ایسا بلند نہیں کہ جس پر بلبل شیراز کے چہکنے کا گماں ہو۔ اس کی وجہ بھی ہے وہ یہ کہ ان کی فارسی نثر پر اردو کا بے پناہ غلبہ ہے۔ یہاں تک کہ فارسی لکھتے لکھتے وہ باقاعدہ اردو کے جملے لکھنا شروع کر دیتے ہیں بقول آمنہ خاتون ایسا فارسی زبان میں ان کے عجز کی بنا پر نہیں بلکہ اردو کی طرف میلانِ طبع کی فراوانی کی وجہ سے ہے اور یہ بہت حد تک درست بھی ہے۔

بحیثیت مجموعی اگرچہ ادبی اعتبار سے " لطائف السعادت فارسی کا کوئی غیر معمولی نوشتہ نہیں پھر بھی لکھنؤ یا اودھ پر تحقیق کرنے والوں کے لیے انشار کی یہ تالیف یقیناً مأخذ کا درجہ رکھتی ہے۔

انیسویں صدی، ہندوستان میں فارسی کے دورِ انحطاط سے تعبیر ہے ایسے وقت میں انشار کی یہ نثری کاوشیں بلاشبہ باقیاتِ صالحات کہلانے کی مستحق ہیں!!

ڈاکٹر کاظم علی خاں

غالب اور علی گڑھ

دیارِ علی گڑھ اپنے جغرافیائی محلِ وقوع کے اعتبار سے مرزا غالب کے مولد اکبرآباد اور مسکن ومدفن دہلی کے درمیان آباد وہ قدیم شہر ہے۔ جو تاریخ میں عرصۂ دراز تک "کول" کے نام سے مشہور رہ کر مغل حکمراں بابر کے ایک ماتحت عہدے دار محمد علی جنگ جنگ، فاتح کول، کے دور میں "علی گڑھ" کے نام سے موسوم ہوا تھا[1]۔ مگر عہدِ غالب میں بھی دیارِ علی گڑھ کو اس کے قدیم نام "کول" سے یاد کیے جانے کی روایت جاری رہی تھی۔ غالب نے اپنے متعدد اردو خطوط میں اس شہر کو "علی گڑھ" اور "کول" دونوں ہی ناموں سے یاد کیا ہے[2]۔ غالب کے مولد ومدفن سے دیارِ علی گڑھ کے محلِ وقوع کی قربت میرے نزدیک غالب اور علی گڑھ کے درمیان ایک ایسی وابستگی کی بنیادی حیثیت رکھتی ہے جو ابھی تک پروفیسر رشید احمد صدیقی کے علاوہ عام طور پر غالب شناسوں کی مناسب توجہ کا موضوع بننے سے محروم رہی ہے۔ انھوں نے ایک مقالے "غالب اور علی گڑھ" کے ذریعے غالباً پہلی بار اہلِ قلم کی توجہ مبذول کرانے کی غرض سے اس موضوع کو چھیڑا تھا[3]۔

سرسید کی علی گڑھ تحریک کے مرکز دیارِ علی گڑھ اور غالب کے درمیان وابستگی اور تعلق کے مختلف پہلوؤں کے متعلق مجھے جو مواد دستیاب ہوا ہے یہاں اس کا تجزیاتی جائزہ پیش کیا

جہاں تک علی گڑھ تحریک کے بانی سرسید احمد خاں اور اقلیم شعروادب کے قدآور شخصیت مرزا اسداللہ خاں غالب کے درمیان تعلق کے جن رشتوں کا سراغ ملتا ہے اس مقالے میں سب سے پہلے انھیں پر روشنی ڈالنا مناسب ہوگا۔

غالب اور سرسید کے مجموعۂ حیات کے مطالعے سے اس دل چسپ اتفاق کا انکشاف ہوتا ہے کہ جس طرح سید احمد خاں کا مولد دہلی غالب کا مسکن رہا تھا اسی طرح غالب کا مولد آگرہ بھی چند سال تک سید احمد خاں کا مسکن بنا تھا۔ گویا ان دونوں ہم عصر مشاہیر میں سے ایک کا مولد دوسرے کا مسکن رہا ہے۔ تنخواہ اور پنشن کے سلسلے میں دونوں معاصرین کے احوال میں اشتراک کا یہ دل چسپ پہلو بھی قابلِ ذکر ہے کہ غالب انگریزی سرکار سے پنشن اور مغل دربار سے تنخواہ پایا کرتے تھے۔ سید احمد خاں کو مغل دربار سے خاندانی پنشن اور انگریزی سرکار سے تنخواہ ملتی رہی تھی۔

مرزا غالب (متولد ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء) سید احمد خاں (ولادت ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء) سے عمر میں کم و بیش بیس سال بڑے تھے۔ غالب اپنی شادی (۷ رجب ۱۲۲۵ھ مطابق شنبہ ۱۸ اگست ۱۸۱۰ء) کے دو تین سال بعد تقریباً ۱۳-۱۸۱۲ء میں اپنے مولد اکبرآباد کو خیرباد کہہ کر دہلی منتقل ہوئے تھے۔ اور غالب کے ورودِ دہلی کے چار پانچ سال بعد سید احمد خاں کی ولادت ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دہلی میں ہوئی تھی۔ غالب اور سید احمد خاں کے سن و سال میں بیس برس کے اِس تفاوت کے باعث اِن دونوں ہم عصروں میں برابر کے دوستانہ روابط تو نہ قائم ہو سکے لیکن دہلی کے ایک ہی دیار میں دونوں کا برسوں تک قیام دونوں میں باہمی شناسائی اور قربت کا سبب ضرور بنا تھا۔ حیاتِ جاوید (ص ۶۷۶) میں شاگردِ غالب مولانا حالی راوی ہیں کہ سید احمد خاں مرزا غالب کو چچا کہتے تھے اور مرزا بھی سید صاحب پر بزرگانہ شفقت فرمایا کرتے تھے۔ 'حیاتِ جاوید' (ص ۵۴) میں مولانا حالی نے یہ بھی لکھا ہے کہ سید احمد خاں اپنے علمی ذوق کی تسکین و تکمیل کے لیے اٹھارہ/انیس سال کے سن میں (۳۶-۱۸۳۵ء کے آس پاس) دہلی کے جن عالموں کی صحبت سے فیضیاب ہوتے رہتے تھے ان میں غالب بھی شامل تھے۔

فروری ۱۸۳۹ء سے سید احمد خاں انگریزی سرکار میں اپنی ملازمت کے باعث دہلی سے

نکل کر زیادہ تر مختلف مقامات پر رہنے لگے اور دہلی میں انہیں مستقل قیام کا موقع کم ہی مل سکا تھا۔ (حیات جاوید ص ۵۹ نیز ص ص ۶۱ تا ۹۲) ان حالات کے پیش نظر دہلی میں غالب سے سید احمد خاں کی ملاقات کے مواقع کم ہی رہے ہوں گے لیکن غالب اور سید احمد خاں کے ادبی آثار میں ایسے متعدد شواہد دستیاب ہوتے ہیں جن سے ان دونوں ہم عصروں میں باہمی تعلقات کا اظہار ہوتا ہے۔

مرزا غالب کا اردو دیوان پہلی بار سید احمد خاں کے بڑے بھائی سید محمد خاں کے مطبع واقع دہلی سے شعبان ۱۲۵۷ھ مطابق اکتوبر ۱۸۴۱ء میں شائع ہوا تھا[۱]۔ ان دونوں کے درمیان تعلقات کی تصدیق سید احمد خاں کے نام غالب کے اس نودریافت فارسی خط سے بھی ہوتی ہے جو ۱۰ جنوری ۱۸۴۲ء کے بعد مگر ۱۳ دسمبر ۱۸۴۵ء سے قبل اس زمانے میں لکھا گیا تھا جب سید احمد خاں فتح پور سیکری (ضلع آگرہ) کے منصف تھے۔ غالب کا ایک نودریافت فارسی خط 'کتاب تلاش غالب' میں موجود ہے[۲] اور اس کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ یہ خط دراصل غالب کے نام سید احمد خاں کے ایک خط کا جواب ہے۔ غالب کا یہ خط اور اس میں سید احمد خاں کے مکتوب کا حوالہ غالب اور سید احمد خاں کے درمیان مکاتبت کے رشتے کا بھی انکشاف کرتا ہے اس خط سے یہ بھی علم ہوتا ہے کہ غالب نے اس خط کے ہمراہ سید احمد خاں کو اپنی ایک نعتیہ مثنوی بھی نقل کر کے ارسال کی تھی۔ غالب نے مکتوب الیہ کے بڑے بھائی کو آخر میں سلام لکھ کر اس خط کو تمام کیا ہے۔ سید احمد خاں کے بڑے بھائی سید محمد خاں ۱۳ ذوالحجہ ۱۲۶۱ھ مطابق ۱۳ دسمبر ۱۸۴۵ء کو دہلی میں فوت ہوئے تھے لہٰذا سید احمد خاں کے نام غالب کا یہ فارسی خط ۱۳ دسمبر ۱۸۴۵ء سے قبل لکھا گیا ہوگا[۳]۔

سید احمد خاں مرزا غالب سے غیر معمولی عقیدت رکھتے تھے۔ سید صاحب کی کتاب آثار الصنادید کے ۱۸۴۷ء کے پہلے اڈیشن کے چوتھے باب میں "ذکر بلبل نوایان سواد جنت آباد حضرت شاہ جہاں آباد" کے عنوان کے تحت دہلی کے جن متعدد شاعروں کا حال ملتا ہے ان میں سر فہرست خاص مدح و تعریف کے ساتھ غالب کے مفصل احوال اور ادبی آثار کو جگہ دی گئی ہے[۴] اس کتاب میں ذکر غالب کے ضمن میں سید احمد خاں نے غالب سے اپنے عقیدت مندانہ گہرے

رعایت کا حال ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"۔۔۔۔۔۔ ان (غالب) کی نعمتِ تربیت کا راقم (سید احمد خاں) کو جو اعتقاد ان کی خدمت میں ہے، اس کا بیان دقدرت تقریر میں ہے اور دا حاطہ تحریر میں آسکتا ہے اور چوں کہ "مو جا بدہا باشد" ان حضرت کو بھی وہ شغف راقم کے حال پر ہے کہ شاید اپنے بزرگوں کی طرف سے کوئی مرتبہ اس کا مشاہدہ کیا ہوگا۔ میں اپنے اعتقاد میں ان کے ایک حرف کو بہتر ایک کتاب سے اور ان کے ایک گل کو بہتر ایک گلزار سے جانتا ہوں۔"[۵۹]

سید احمد خاں نے مرزا غالب کی فارسی نثر و نظم کے نمونے پیش کرنے کے ساتھ ساتھ مرزا صاحب کی اردو شاعری کے نمونوں کو بھی اس کتاب میں شامل کیا ہے۔ اس میں سید احمد خاں نے غالب کے احوال وادبی آثار کے علاوہ غالب کے جن شاگردوں کے احوال و آثار کو کتاب میں جگہ دی ہے ان میں یہ نام شامل ہیں:

نواب محمد ضیاء الدین خاں بہادر نیر ورخشاں (ص ص ۱۴۴ تا ۱۵۹)، نواب زین العابدین خاں بہادر عارف (ص ص ۱۵۹ تا ۱۶۳) نواب غلام حسن خاں محو دہلوی (ص ۱۶۳) نواب ذوالفقار علی خاں آذر (ص ۱۶۵) جناب نواب محمد مصطفیٰ خاں بہادر حسرتی و شیفتہ (ص ص ۲۰۲ تا ۲۰۰)

آثار الصنادید اپنے دامن میں غالب کی ایک منثور فارسی تقریظ بھی رکھتی ہے۔ غالب کی یہ تقریظ پنج آہنگ (مشمولہ کلیاتِ نثر غالب) میں بھی محفوظ ہے۔

غالب نے سید صاحب کی کتاب 'آثار الصنادید' کا ایک نسخہ اپنے کرم فرما حکیم سید رجب علی خاں ارسطو جاہ (۱۸۰۶ ۔ ۱۸۶۹) کو اپنے جس فارسی مکتوب کے ہمراہ ارسال کیا تھا اس میں غالب نے اس کتاب کی تعریف کی تھی۔ (احوال غالب ص ۱۹)۔ غالب کے مکتوب الیہ ارسطو جاہ علم ریاضی میں سید احمد خاں کے حقیقی نانا (دبیر الدولہ امین الملک خواجہ فرید الدین احمد خاں مصلح جنگ) کے شاگرد رہ چکے تھے۔ (حیاتِ جاوید ص ص ۳۴ تا ۳۵) ارسطو جاہ سید رجب علی خاں کے مختصر حالاتِ زندگی 'بزم غالب' میں موجود ہیں[۶۰]

غالب کے ادبی آثار میں سید احمد خاں کی مرتب کردہ فارسی کتاب 'آئینِ اکبری'

ہوئی کہ مرزا غالب جب سفر رام پور سے دہلی واپس ہو رہے تھے تو وہ راہ میں چند روز کے لیے مرادآباد کی سرائے میں ٹھہرے ۔ سید احمد خاں اس زمانے میں مرادآباد ہی میں صدر الصدور تھے۔ سید صاحب غالب کو سرائے سے اپنے مکان لے آئے اور انھوں نے اپنے مکان پر غالب کی خاطر خواہ خاطر مدارات کر کے ان سے اپنے روابط دوبارہ استوار کر لیے۔

حالی کا بیان ہے کہ غالب نے یہ سفر والیِ رام پور نواب یوسف علی خاں کے زمانے میں کیا تھا۔ ہماری معلومات کے مطابق نواب یوسف علی خاں کے دور میں غالب کے قیام رامپور کا زمانہ ۲۷ جنوری ۱۸۶۰ء سے ۱۷ مارچ ۱۸۶۰ء تک کی درمیانی مدت کو محیط رہا تھا اور وہ ۱۷ مارچ سے ۲۴ مارچ ۱۸۶۰ء کی درمیانی تاریخوں کے دوران مرادآباد میں سید احمد خاں کے مکان پر ایک آدھ روز مہمان رہے تھے[۵۱]

غالب اور سید احمد خاں کے درمیان ذاتی نوعیت کے یہ روابط ہمارے 'غالب اور علی گڑھ' کے سلسلے میں پس منظر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ غالب کے عزیزوں، کرم فرماؤں، شاگردوں اور عقیدت مندوں کی فہرست میں ایسے متعدد افراد کے نام ملتے ہیں جن کے روابط سید احمد خاں سے بھی ثابت ہوتے ہیں۔ ان دونوں ہم عصر مشاہیر کے مشترک مربیوں اور رفیقوں وغیرہ کی جامع و مکمل فہرست جس محنت و فرصت کی طالب ہے اس کے لیے سردست ہمارے پاس وقت نہیں۔ ہم غالب و سید احمد خاں کے دائرۂ تعارف و تاثر میں شامل صرف ان چند افراد کے مختصر ذکر پر اکتفا کرتے ہیں، جن کا حوالہ ان دونوں مشاہیر کے احوال یا ادبی آثار وغیرہ میں ہماری نظر سے گزرا ہے۔

سید محمد خاں[۳۱]

سید محمد خاں (متوفی ۳ ذی الحجہ ۱۲۶۱ھ مطابق ۳ دسمبر ۱۸۴۵ء) سید احمد خاں کے حقیقی بڑے بھائی تھے۔ سید محمد خاں نے 'سید الاخبار' کے نام سے دہلی سے ایک ہفتہ وار اخبار نکالا تھا جس میں سید احمد خاں کے مضامین بھی چھپا کرتے تھے۔ یہ اخبار جس پریس سے شائع ہوتا تھا اس کے دو نام ملتے ہیں: (۱) "لیتھو گرافک پریس" دہلی (۲) "مطبع سید الاخبار" دہلی۔ سید الاخبار کے

(سنہ اشاعت ۲، ۱۲ھ مطابق ۱۸۵۵ء) پر بشکل مثنوی ایک منظوم فارسی تقریظ بھی موجود ہے، اڑتیس اشعار کی یہ مثنوی کلیات غالب طبع ۱۸۶۳ء میں شامل ہے[۱]۔ اس مثنوی میں غالب نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ 'آئینِ اکبری' جیسی تقویم پارینہ کتاب پر محنت کرنے کے بجائے انگریزوں کے آئینِ حکومت پر توجہ دینا بہتر ہوگا۔ اپنی مرتب کردہ کتاب آئینِ اکبری کے خلاف غالب کی یہ تقریظ سید احمد خاں کو ناپسند ہوئی اور انھوں نے اسے کتاب میں شائع نہیں کی۔ ۲، ۱۲ھ/۱۸۵۵ء کے آس پاس کا یہ ناخوشگوار واقعہ غالب اور سید احمد خاں کے درمیان تعلقات میں کشیدگی و بدمزگی کا سبب بنا تھا۔ ('حیات جاوید' ص ص ۲، تا ۳، ۷ نیز یادگار غالب ص ص ۸۱ تا ۸۳)

آئینِ اکبری پر غالب کی مخالفانہ تقریظ کی واپسی کے سلسلے میں سید احمد خاں نے غالب کے نام جو خط لکھا تھا وہ تو اب ناپید ہے لیکن حیات جاوید (ص ص ۲، تا ۳، ۷) میں اس ناخوشگوار واقعے کے متعلق مولانا حالی کے بیان کی شہادت سید احمد خاں اور غالب کے درمیان مکاتبت کے اس رشتے کی نشان دہی ضرور کرتی ہے جس کے ثبوت سطور گذشتہ میں پہلے بھی پیش کیے جا چکے ہیں۔

آئینِ اکبری کے متعلق غالب کی یہ مخالفانہ تقریظ اس لحاظ سے بھی ہمارے نزدیک ایک بعید از انصاف بات ثابت ہوتی ہے کہ غالب اس واقعے سے کچھ عرصہ قبل خود مہر نیم روز کے عنوان سے سلطنت مغلیہ کی تاریخ لکھ چکے تھے۔ مہر نیم روز کی پہلی اشاعت ۲، ربیع الاول ۱۲۷۱ھ مطابق جمعہ ۲۳، نومبر ۱۸۵۴ء کو منظر عام پر آئی تھی جو اکبر اعظم کے والد مغل حکمران نصیرالدین ہمایوں تک کی سلطنت مغلیہ کی تاریخ پر مشتمل ہے[۲]۔ ان حقائق کے پیش نظر سلطنت مغلیہ کی تاریخ سے متعلق جس کام کو وہ خود انجام دے چکے تھے۔ اس کی سرانجام دہی پر غالب کا سید احمد خاں کو روکنا کہاں تک جائز تھا ــــــ؟ ہمارے خیال میں یہ سوال قابل غور ضرور ہے۔

سید احمد خاں کی مرتب کردہ کتاب آئینِ اکبری کے متعلق غالب کی تقریظ سے ان دونوں ہم عصر مشاہیر کے درمیان ۱۸۵۵ء کے آس پاس پیدا ہو جانے والی یہ دوری یوں دو

لیتھوگرافک پریس دہلی ہی سے غالب کا اردو دیوان ان کی زندگی کے دوران پہلی بار شعبان ۱۲۶۷ھ مطابق اکتوبر ۱۸۴۱ء میں چھپا تھا۔ غالب شاید اسی لیے سید محمد خاں اور ان کے سید الاخبار کو عزیز رکھتے تھے۔ سید الاخبار اور سید محمد خاں کے متعلق غالب نے میرجان جاکوب کو اپنے ایک فارسی خط میں، جو کچھ لکھا ہے اس کا اردو مفہوم پیش کیا جاتا ہے[۵۳]:

"سید الاخبار کے بارے میں آپ نے جو لکھا ہے وہ منت مزید ہے۔ مطبع سید الاخبار کے مالک جو میرے دوست ہیں میرا کلام چھاپ رہے ہیں۔۔۔ دیوانِ اردو غالباً ایک مہینے کے اندر چھپ کر نظر عالی سے گزرے گا۔۔۔۔ سید الاخبار ہر ہفتے آپ کی خدمت میں پہنچتا رہے گا۔ مطبع والوں نے میری آپ سے نیازمندی کی بنا پر آپ کا نام نامی سرفہرست خریداران رکھا ہے۔"

مطبع سید الاخبار سے غالب کے اردو دیوان کے علاوہ خود سید احمد خاں کی بھی بعض کتابیں شائع ہوئی تھیں جن میں آثار الصنادید، طبع اول (مطبوعہ ۱۸۴۷ء) بھی شامل ہے (بہ حوالہ آثار الصنادید، سید احمد خاں، مرتبہ خلیق انجم، جلد اول، اردو اکادمی دہلی۔ طبع ۱۹۹۰ء ص ۱۵۰)

بہادر شاہ ظفر

سلطنتِ مغلیہ کے آخری فرماں روا بہادر شاہ ظفر کے دربار سے سید احمد خاں اور غالب دونوں ہی خطاب یافتہ تھے۔ بہادر شاہ ظفر کی جانب سے سید احمد خاں کو ۱۸۴۲ء میں "جوادالدولہ عارف جنگ" اور غالب کو جولائی ۱۸۵۰ء میں ملازمت کے ساتھ ساتھ "نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ" کے خطابات عطا کیے گئے تھے۔ بہادر شاہ ظفر اپنے استاد ذوق کی وفات کے بعد اپنے کلام پر غالب سے اصلاح بھی لینے لگے تھے[۵۴]

حکیم احسن اللہ خاں

احترام الدولہ حکیم احسن اللہ خاں (۱۲۱۳ھ - ۱۲۹۰ھ) بہادر شاہ ظفر کے وزیر تھے۔ حکیم احسن اللہ خاں کی تحریک پر سید احمد خاں کو مغل دربار سے خطاب ملا تھا۔ سید احمد خاں نے اپنی

کتاب آثار الصنادید کی پہلی اشاعت میں دہلی کے جن نامور اطبا کا حال لکھا ہے ان میں سرفہرست حکیم احسن اللہ خاں ہی کا نام ملتا ہے۔ اس کتاب سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ وہ ابتدا میں فخر الدولہ نواب احمد بخش خاں والیٔ فیروز پور جھرکہ (متوفی اکتوبر ۱۸۲۷ء) کی سرکار میں ملازم رہے تھے۔ نواب احمد خاں مرزا غالب کے حقیقی چچا خسر تھے۔ اس طرح حکیم احسن اللہ خاں اور غالب کے درمیان گہرے دیرینہ مراسم کے ثبوت ملتے ہیں۔ حکیم احسن اللہ خاں کے نام 'پنج آہنگ' میں مرزا غالب کا ایک ایسا فارسی خط بھی موجود ہے جس کا زمانۂ تحریر ۱۸۳۳ء متعین کیا گیا ہے۔ اس خط سے پتا چلتا ہے کہ حکیم صاحب مرزا غالب سے ان کی فارسی نثر کے طالب تھے۔ پنج آہنگ کی پہلی اشاعت حکیم احسن اللہ خاں کے زیر اہتمام مطبع سلطانی دہلی سے ۱۸۴۹ء میں منظر عام پر آئی تھی۔ جولائی ۱۸۵۰ء حکیم صاحب ہی کی تحریک پر غالب مغل دربار میں مغل بادشاہوں کی تاریخ لکھنے پر مامور ہوئے تھے۔ اور ان کی کتاب 'مہر نیم روز' معرض وجود میں آئی تھی۔ مہر نیم روز کے مواد کی فراہمی میں حکیم صاحب نے مرزا غالب کی مدد کی تھی۔[۵۸]

مفتی صدر الدین آزردہ

مولانا حالی راوی ہیں کہ سید احمد خاں کے علمی اور ادبی ذوق کی آبیاری میں مفتی صدر الدین آزردہ کا بھی فیض تربیت شامل رہا تھا۔ 'آثار الصنادید' میں آزردہ کے متعلق سید احمد خاں کا بیان انہیں آزردہ کا سرتاپا عقیدت مند ثابت کرتا ہے۔ وہ عہد غالب کے ان سربرآوردہ دہلوی عالموں اور شاعروں میں تھے جن سے غالب کے بھی دیرینہ دوستانہ مراسم رہے تھے۔

مولانا امام بخش صہبائی

سید احمد خاں کی ادبی تربیت میں مولانا امام بخش صہبائی بھی شامل رہے تھے جن کا شمار غالب کے دوستوں میں تھا۔ حالی نے 'آثار الصنادید' کے پہلے اڈیشن میں صہبائی کو سید احمد خاں کا شریک کار قرار دیا ہے۔

نواب کلبِ علی خاں بہادر

نواب کلب علی خاں والیِ رام پور مرزا غالب کے مربی و شاگرد نواب یوسف علی خاں ناظم والیِ رام پور (متوفی ۱۰ اپریل ۱۸۶۵ء) کے فرزند و جانشین تھے۔ کلب علی خاں کی سرکار سے غالب کو وظیفہ بھی ملتا تھا۔ کلب علی خاں کے نام غالب کے ۵، مطبوعہ اردو خطوط موجود ہیں۔ سید احمد خاں نے ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو علی گڑھ میں جو مدرسۃ العلوم قائم کیا تھا۔ اس کے قیام کے لیے نواب کلب علی خاں والیِ رام پور نے مبلغ تیس ہزار روپے کی خطیر رقم کے ایک پرامیسری نوٹ کی سند ۲۳ مئی ۱۸۷۴ء کو (قیام مدرسہ سے ایک سال قبل) عطا کی تھی۔ گویا نواب کلب علی خاں سید احمد خاں اور مرزا غالب دونوں ہی کے سرپرست اور مربی تھے۔

سید رحمت علی خاں عرف مفتی میرلال

"سراج العلما ضیار الفقہار سید رحمت علی خاں" عرف مفتی میرلال کا ذکر سید احمد خاں نے اپنی کتاب 'آثار الصنادید' (جلد دوم ص ۱۱۵۔ جدید اشاعت) میں بڑی عقیدت کے ساتھ کیا ہے۔ سید رحمت علی خاں عرف مفتی میرلال سے غالب کے بھی تعلقات تھے۔ مفتی صاحب کی کتاب 'سراج المعرفت' غالب کے سرپرست بہادر شاہ ظفر کے حکم پر ۲ فروری ۱۸۵۴ء کو مطبع سلطانی دہلی سے شائع ہوئی تھی۔ سراج المعرفت میں غالب کا ایک طویل منثور اردو دیباچہ شائع ہوا تھا جو غالب کی کتاب 'اردوئے معلیٰ' حصہ دوم (طبع اپریل ۱۸۹۹ء) میں بھی شامل ہے۔[۲۳]

نواب علاء الدین احمد خاں علائی

نواب علاء الدین احمد خاں علائی رئیس لوہارو (زمانۂ حیات ۲۵ اپریل ۱۸۳۳ء تا ۱ اکتوبر ۱۸۸۴ء) نے نہ صرف ابتدائی تعلیم اپنے رشتے کے پھوپھا مرزا غالب سے پائی تھی بلکہ وہ فن شاعری میں بھی غالب کی شاگردی کا شرف رکھتے تھے۔ علائی کے نام غالب کے ۵۰ مطبوعہ اردو خطوط موجود ہیں۔[۲۴] علائی کے والد نواب امین الدین احمد خاں کے نام غالب کے ایک خط (مشمو۔

اردوئے معلی حصہ اوّل طبع اوّل مطبوعہ مارچ ۱۸۶۹ء ص ۳۹۰) سے پتا چلتا ہے کہ علائی اردو کے علاوہ عربی، فارسی اور انگریزی زبانوں میں بھی اچھی دست گاہ رکھتے تھے۔ مجھے سید احمد خاں کے نام نواب علاء الدین احمد خاں علائی کا ۲۷ جولائی ۱۸۷۲ء کا ایک ایسا انگریزی خط ملا ہے جس سے بہ تفصیل ذیل متعدد اہم امور روشنی میں آتے ہیں۔

۱۔ سید احمد خاں کے نام علائی کا یہ ۲۷ جولائی ۱۸۷۲ء کا تحریر کردہ خط دراصل علائی کے نام سید احمد خاں کے ایک خط مورخہ ۲۰ جولائی ۱۸۷۲ء کا جواب ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ علائی غالب کے علاوہ سید احمد خاں کے مکتوب الیہ ہونے کا بھی شرف رکھتے تھے۔

۲۔ علائی کا یہ خط اس دور سے تعلق رکھتا ہے جب سید احمد خاں کے علی گڑھ کالج کا قیام عمل میں نہ آیا تھا اور اسے قائم کرنے کے لیے سرمایے کی فراہمی کی سعی جاری تھی۔

۳۔ علائی کے اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ سید احمد خاں نے علائی کے نام اپنے ۲۰ جولائی ۱۸۷۲ء کے خط میں علی گڑھ کالج کے قیام کے لیے مالی امداد کی اپیل کی تھی۔ سید احمد خاں کی اس اپیل پر علائی نے اپنی مالی پریشانیوں کے باوجود اس کارِ خیر میں اپنی اور اپنے چچا نواب ضیاء الدین خاں کی مالی امداد کا وعدہ کیا تھا۔ سید احمد خاں کے نام علائی کا یہ انگریزی خط انگریزی کتاب "سیلیکٹیڈ ڈاکیومنٹس فرام دی علی گڑھ آرکائیوز" (ص ص ۱۶۵ تا ۱۶۶) میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔[۲۵]

نواب ضیاء الدین احمد خاں نیّر و رخشاں

نواب محمد ضیاء الدین احمد خاں نیّر و رخشاں (عہدِ حیات اکتوبر ۱۸۲۱ء تا شنبہ ۲۷ جون ۱۸۸۵ء) مرزا غالب کے حقیقی خسر نواب الٰہی بخش خاں معروف دہلوی کے حقیقی بڑے بھائی نواب احمد بخش خاں والیٔ فیروز پور جھرکہ و جاگیردار لوہارو کے فرزند اور غالب کی اہلیہ کے حقیقی چچا زاد بھائی تھے۔[۲۶] اس طرح رشتے میں غالب دراصل ضیاء الدین احمد خاں کے بہنوئی ہوتے تھے۔ ضیاء الدین احمد خاں نیّر و رخشاں نے نہ صرف تعلیم و تربیت میں بلکہ اردو اور فارسی شاعری میں بھی غالب کی شاگردی سے فیض حاصل کیا تھا۔ نیّر و رخشاں اپنے دور کے علم دوست رئیس تھے اور وہ ایک عمدہ کتب خانے کے بھی مالک تھے۔ اس کتب خانے کی کتابیں غالب کے مطالعے میں رہتی

تھیں۔ نواب ضیاءالدین احمد خاں نیرؔ و رخشاں نے اپنے استاد مرزا غالب کے ادبی آثار کی جمع آوری میں یادگار خدمت انجام دی تھیں۔ ان تمام باتوں کی تفصیل میرے مقالے "غالب اور نیرؔ رخشاں" (مطبوعہ رسالہ آج کل نئی دہلی دسمبر ۱۹۸۰ء ص ص ۳۳ تا ۴۰) میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

سید احمد خاں کی کتاب 'آثار الصنادید' (طبع اوّل) میں غالب کے جن شاگردوں کا حال موجود ہے ان میں نیرؔ و رخشاں بھی شامل ہیں۔ آثار الصنادید میں نیرؔ رخشاںؔ کے احوال و ادبی آثار پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ نیرؔ و رخشاں اور سید احمد خاں کے درمیان ذاتی تعلقات بھی تھے۔ نواب ضیاء الدین احمد خاں رخشاںؔ کا جو اردو کلام اب کمیاب ہے وہ قابلِ لحاظ مقدار میں سید احمد خاں کی کتاب 'آثار الصنادید' (طبع اوّل) میں ملتا ہے۔ سید احمد خاں کے نام رخشاںؔ کے بھتیجے نواب علائی کے ۲، جولائی ۱۸۷۲ء کے محولۂ بالا انگریزی خط سے یہ بھی علم ہوتا ہے کہ علائیؔ نے سید احمد خاں کے علی گڑھ کالج کے لیے اپنے چچا ضیاء الدین احمد خاں سے بھی مالی امداد دلوانے کی کوشش کی تھی۔[۲۷]

زین العابدین خاں عارفؔ

زین العابدین خاں عارفؔ دہلوی (۱۲۳۳ھ ۔ ۱۸۱۷ء - ۱۲۶۸ھ ۔ ۱۸۵۲ء) غلام حسین خاں مسرورؔ کے فرزند اور نواب الٰہی بخش خاں معروفؔ دہلوی کے نواسے تھے۔ عارف کی والدہ بنیادی بیگم مرزا غالبؔ کی زوجہ امراؤ بیگم کی سگی بہن تھیں۔ اس طرح مرزا غالبؔ عارف کے حقیقی خالو تھے۔ غالب کی جب اپنی کوئی اولاد زندہ نہ رہی تو انھوں نے عارف کو اپنا بیٹا بنا لیا۔ عارف اپنے والد مسرورؔ کی طرح شعر و سخن کے شائق تھے اور غالبؔ کے شاگرد تھے۔[۲۸] غالبؔ کے ان منہ بولے بیٹے اور شاگرد زین العابدین خاں عارفؔ کے احوال اور ادبی آثار سید احمد خاں کی کتاب 'آثار الصنادید' (طبع اول مطبوعہ ۱۸۴۷ء) میں بھی شامل ہیں[۲۹] جو غالبؔ اور سید احمد خاں کے درمیان باہمی تعلقات کے ایک پہلو کی حیثیت رکھتے ہیں۔

غلام حسن خاں محوؔ دہلوی

غلام حسن خاں محوؔ دہلوی زین العابدین خاں عارفؔ دہلوی کے مختلف البطنی بھائی تھے

توری والدہ عظمی بیگم عارف کی سوتیلی ماں تھیں۔ سخن شعرا، بزم سخن اور تلامذۂ غالب کے مندرجات کی بنیاد پر تو بھی غالب کے شاگرد تھے۔ سید احمد خاں کی کتاب 'آثار الصنادید' کے پہلے ایڈیشن میں تو کے احوال وادبی آثار اختصار سے شامل ہیں۔[۱]

نواب ذوالفقار علی خاں آذر

سخن شعرا (ص ۱۹) اور تلامذۂ غالب (ص ۴۶) نواب ذوالفقار علی خاں آذر کو غالب کا شاگرد بتلاتے ہیں۔ آذر کا مختصر حال اور نمونۂ کلام سید احمد خاں کی کتاب 'آثار الصنادید' طبع اول میں شاگرد غالب کی حیثیت سے شامل ہے۔ (آثار الصنادید، مرتبہ خلیق انجم جلد دوم ص ۱۶۵) -

مولوی غلام محمد خاں تپش

مولوی غلام محمد خاں تپش مرزا غالب کے ان شاگردوں میں تھے۔ جنھوں نے شاعری کے علاوہ اردو صحافت اور نثر نگاری کی بھی آبیاری کی تھی۔ تپش کم و بیش آٹھ سال منشی نول کشور کے 'اودھ اخبار' لکھنؤ کے مدیر رہ کر جب ۱۸۷۷ء میں اس سے الگ ہوئے تو انھوں نے خود اپنا ہفتہ وار اخبار 'مشیر قیصر ہند' لکھنؤ ستمبر ۱۸۷۷ء سے جاری کیا تھا۔ مالک رام نے تلامذۂ غالب (ص ۱۰۹ تا ۱۱۰) نیز تذکرہ ماہ و سال (ص ۱۰۰) میں مولوی غلام محمد خاں تپش (شاگرد غالب) کے جو حالات پیش فرمائے ہیں وہ تپش اور سید احمد خاں کے درمیان باہمی تعلقات کے ذکر سے یکسر خالی ہیں۔ مجھے شاگرد غالب مولوی غلام محمد خاں تپش (مدیر اودھ اخبار لکھنؤ) کے نام دو ایسے اہم خطوط ملے ہیں جن سے انکشاف ہوتا ہے کہ مولوی غلام محمد خاں (تپش) سید احمد خاں کے مکتوب الیہ رہے تھے اور وہ سید احمد خاں نیز ان کی علی گڑھ تحریک کے حامیوں میں تھے۔ ان کا نام سید احمد خاں کے موقر جریدے 'تہذیب الاخلاق' علی گڑھ کے مضمون نگاروں کی فہرست میں شامل تھا۔ ان تمام امور کی تفصیل میرے مقالے 'غالب اور منشی نول کشور' (مشمولہ رسالہ نیا دور لکھنؤ نول کشور نمبر، دسمبر ۱۹۸۰ء ص ص ۱۵۰ تا ۱۵۱۔ (حاشیہ ۵۵)) میں ملاحظہ فرمائی جاسکتی ہے۔

منشی نول کشور

منشی نول کشور (ولادت یک شنبہ ۳ جنوری ۱۸۳۶ء۔ وفات سہ شنبہ ۱۹ فروری ۱۸۹۵ء)
کے والد جمنا پرشاد بھارگو اسی دیار علی گڑھ کے موضع ساسنی کے زمیندار تھے جو بعد میں سرسید احمد
خاں کی علی گڑھ تحریک اور علی گڑھ کالج کی بدولت ہندستان کے جغرافیائی نقشے پر اس ملک کی
ذہنی تاریخ میں ایک یادگار علمی مرکز کی حیثیت ہندستانی نشاۃ ثانیہ کا ایک تابناک باب
بننے والا تھا۔ نول کشور کی ولادت تو "ریڑھا" ضلع متھرا میں ہوئی لیکن انھوں نے ۱۸۴۲ء سے ۱۸۴۶ء
تک ابتدائی تعلیم ضلع علی گڑھ کے موضع ساسنی میں حاصل کی تھی۔ نول کشور اپنی تعلیم اور
ملازمت کے سلسلے میں غالب کے مولد آگرہ میں بھی ۱۸۴۶ء سے ۱۸۵۲ء تک مقیم رہے تھے
نول کشور آگرے اور لاہور کے مطابع میں ملازمت کرکے پریس کے کاموں کا تجربہ حاصل کرنے
کے بعد لکھنؤ منتقل ہو گئے۔ انھوں نے لکھنؤ سے ۲۶ نومبر ۱۸۵۸ء کو اپنا اودھ اخبار جاری کیا۔ جو
انھی کے قائم کردہ پریس سے شایع ہوتا تھا۔ نول کشور پریس لکھنؤ کی توسیع و ترقی کے نتیجے میں
اس پریس کی شاخیں کانپور اور لاہور جیسے شہروں میں بھی قائم ہو گئیں۔ ان امور کی تفصیل کے
لیے دیکھیے میرا مقالہ، "منشی نول کشور" مطبوعہ رسالہ جامعہ، نئی دہلی فروری ۱۹۸۱ء۔

غالب سے اپنے ان ہی روابط کی بدولت منشی نول کشور غالب کے مکتوب الیہ بھی رہے
رہیں۔ میری اطلاع کے مطابق نول کشور کے نام فارسی و اردو میں اب غالب کے دو خط ہی محفوظ ہیں
ان کے علاوہ مجھے نول کشور کے نام غالب کے دو اور خطوں کا بھی علم ہوا ہے جو اب ناپید ہو چکے ہیں
غالب کے مکاتیب یا کتب میں منشی نول کشور یا ان کے مطبع یا ان کے اودھ اخبار کے نام کے
مجھے کم و بیش ڈھائی درجن حوالے بھی ملے ہیں۔ ان تمام امور کی تفصیل میرے مقالے "غالب اور
منشی نول کشور" میں دیکھی جا سکتی ہے۔

منشی نول کشور علی گڑھ تحریک کے بانی سید احمد خاں سے بھی روابط رکھتے تھے۔ مجھے نول کشور
کے اودھ اخبار لکھنؤ کے مدیر منشی غلام محمد خاں تپش دہلوی (شاگرد مرزا غالب) کے سید احمد خاں
کے نام جو دو اردو خط ملے ہیں ان سے پتا چلتا ہے کہ سید احمد خاں کا رسالہ تہذیب الاخلاق
(علی گڑھ)، نول کشور کے مطالعے میں رہا کرتا تھا۔ اور اس میں چھپنے والے سید احمد خاں کے مضامین
نول کشور اپنے اودھ اخبار لکھنؤ میں بھی شائع کیا کرتے تھے۔ سید احمد خاں کے نام مدیر اودھ اخبار

لکھنؤ منشی غلام محمد خاں تپش کے خطوں سے یہ بھی انکشاف ہوتا ہے کہ نول کشور اپنے اودھ اخبار لکھنؤ کے ذریعے سید احمد خاں کی علی گڑھ تحریک کی حمایت میں پیش پیش رہتے تھے [۴۲]

سید احمد خاں سے اپنے انھیں قریبی تعلقات کے باعث نول کشور نے سر سید کے علی گڑھ کالج کی لائبریری کو مبلغ دس ہزار روپے نقد کی خطیر رقم اور ہزاروں روپے کی کتابوں کا عطیہ بھی دیا تھا جس کی تفصیل نول کشور کی سوانح عمری "مجون چرتر منشی نول کشور صاحب" (مطبوعہ ۱۹۰۳ء) میں موجود ہے [۴۳]

مطبع نول کشور سے سید احمد خاں کی کتابوں کی اشاعت کے بھی ثبوت ملتے ہیں۔ خود میرے ذاتی کتب خانے میں سید احمد خاں کی کتاب 'احکام طعام اہل کتاب' کا ایک قدیم مطبوعہ نسخہ موجود ہے جو مطبع منشی نول کشور کانپور سے ۱۸۶۸ء میں چھپا تھا۔

نواب محمد مصطفیٰ خاں شیفتہ و حسرتی

نواب محمد مصطفیٰ خاں شیفتہ و حسرتی (۱۲۲۱ھ/۱۸۰۶ء - ۱۲۸۶ھ/۱۸۶۹ء) رئیس جہانگیر آباد شاعری میں مومن خاں مومن دہلوی اور مرزا غالب کے شاگرد تھے۔ شیفتہ اپنے عہد کی اہم ادبی ہستیوں میں تھے۔ وہ فارسی و اردو دونوں زبانوں کے شاعر اور فارسی کے نثر نگار تھے۔ تذکرۂ گلشنِ بےخار فارسی نثر میں ان کی دست گاہ کا یادگار نمونہ ہے [۴۴] مولانا حالی سات آٹھ سال تک شیفتہ کی سرکار میں ان کے بیٹوں کے اتالیق کی حیثیت سے ملازم رہے تھے۔ شیفتہ سید احمد خاں کے ان قریبی رفیقوں میں تھے جن کا ذکر سید احمد خاں کی کتاب 'آثار الصنادید' (جلد دوم ص ص ۲۰۲ تا ۲۱۰) میں تفصیل سے موجود ہے۔ 'حیات جاوید' (ص ۴۱۵) میں مولانا حالی کا بیان ہے کہ نواب محمد مصطفیٰ خاں بھی سید احمد خاں کی سائنٹفک سوسائٹی کے رکن تھے۔ شیفتہ کا حال تذکرہ ماہ و سال (ص ۲۳۳) نیز تلامذۂ غالب (ص ص ۳۲۸ تا ۳۴۲) میں بھی موجود ہے۔

حکیم سید رجب علی خاں ارسطو جاہ

حکیم سید رجب علی خاں ارسطو جاہ (۱۸۰۶ء - ۱۸۶۹ء) غالب کے مکتوب الیہ تھے۔

حکیم صاحب سید احمد خاں کے نانا خواجہ فرید الدین احمد کے شاگرد رہ چکے تھے۔ ارسطو جاہ کے مختصر حالات بزم غالب میں موجود ہیں۔[۵۱] احوالِ غالب (ص ۱۹) میں ارسطو جاہ کے نام غالب کے ایک فارسی خط کا ذکر ہے۔

مولانا الطاف حسین حالی

مولانا الطاف حسین حالی (ولادت ۱۸۳۷ء - وفات یکم جنوری ۱۹۱۵ء)[۵۲] مرزا غالب کے ان فرِاستاد شاگردوں میں تھے جو اردو نثر و نظم کے میدان میں اپنے عظیم الشان کارناموں کی بدولت کسی تعارف کے محتاج نہیں۔[۵۳]

سطورِ گزشتہ میں عرض کیا جا چکا ہے کہ مولانا حالی سات آٹھ سال تک نواب محمد مصطفیٰ خاں شیفتہ کے بیٹوں کے اتالیق رہ چکے تھے۔ خود حالی کا بیان ہے کہ ان کے ادبی ذوق کی آبیاری میں غالب سے زیادہ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کا ہاتھ رہا تھا۔[۵۴] مگر سچ تو یہ ہے کہ مولانا حالی کی ادبی صلاحیتوں کی نشوونما میں غالب و شیفتہ سے بھی زیادہ سید احمد خاں اور ان کی اس ہمہ گیر علی گڑھ تحریک کی کارفرمائی شامل رہی تھی۔ جس نے زندگی کے دوسرے شعبوں کے ساتھ ساتھ اردو ادب پر بھی اپنے اثرات کے تابناک نقوش ثبت کیے تھے۔ حالی نے اردو نثر کی صنف سوانح نگاری میں جو یادگار کارنامے انجام دیے ہیں ان میں غالب اور سر سید دونوں کی سوانح عمریاں 'یادگارِ غالب' و 'حیاتِ جاوید' کے عنوانات سے شامل ہیں لیکن ان میں بہ لحاظ ضخامت و مواد سر سید کی سوانح عمری (حیاتِ جاوید) غالب کی سوانح عمری (یادگارِ غالب) کے مقابلے میں زیادہ اہم ہے۔ حیاتِ جاوید کے علی الرغم یادگارِ غالب کی ضخامت کا قابل لحاظ حد تک کم ہونا جاری اس بات کا بخوبی اثبات کرتا ہے کہ حالی اپنے استاد غالب کے مقابلے میں اپنے ادبی نظریات کے سلسلے میں سر سید سے کہیں زیادہ فیضیاب ہوئے تھے۔

مالک رام اور صالحہ عابد حسین کا قیاس ہے کہ سید احمد خاں سے مولانا حالی کی پہلی ملاقات ۱۸۶۴ء کے اواخر یا ۱۸۶۵ء کے اوائل میں دہلی میں ہوئی تھی مگر حیاتِ جاوید میں خود مولانا حالی کا بیان ہے کہ سید احمد خاں سے ان کی پہلی ملاقات ۱۸۶۷ء/۱۸۶۸ء میں بمقام علی گڑھ

اس موقعے پر ہوئی جب وہ اپنے مربی نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ (متوفی ۱۸۶۹ء) کے ہمراہ دہلی سے سائنٹیفک سوسائٹی کے سالانہ جلسے میں شرکت کے لیے علی گڑھ جاکر سید احمد خاں کی کوٹھی میں فروکش ہوئے تھے۔[۳۹]

حالی و سید احمد خاں کے قریبی تعلقات کے متعلق یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ حالی کے متعدد منثور و منظوم ادبی آثار سید احمد خاں کے مجلوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالقیوم کی تحقیق ہے کہ مولانا حالی کی مقالہ نگاری کا آغاز ان کے جس پہلے مقالے "سید احمد خاں اور ان کا کام" سے ہوا وہ سید صاحب کے رسالے انسٹی ٹیوٹ گزٹ علی گڑھ (۱۸۷۶ء) میں چھپا تھا[۴۰] سید احمد خاں اور ان کی علی گڑھ تحریک کے زیر اثر حالی کے جو ادبی آثار معرض وجود میں آئے ان میں "مسدس حالی" جس اہمیت کا حامل ہے اس سے اہل نظر بے خبر نہیں۔ کتابی شکل میں شائع ہونے سے پہلے "مسدس حالی" سید احمد خاں کے مشہور علمی جریدے "تہذیب الاخلاق علی گڑھ" ہی میں پہلی بار قسط وار چھپا تھا۔[۴۱] "مسدس حالی" کے متعلق (جو حالی اور سر سید کے باہمی روابط کا نتیجہ تھا) ڈاکٹر عابد حسین کا یہ یادگار قول بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ "سر سید کی بدولت قوم کو شاعر مل گیا اور شاعر کو قوم"۔[۴۲]

سر سید کے نام اور کام کو "شہرت عام اور بقائے دوام" کے دربار میں جگہ دلوانے میں مولانا حالی نے جو رول ادا کیا ہے اس سے اہل نظر پوری طرح باخبر ہیں۔ سر سید اور علی گڑھ تحریک سے وابستگی کے نتیجے میں مولانا حالی نے جو ادبی کارنامے سر انجام دیے ان کی بدولت خود حالی نے اردو نثر و نظم کی تاریخ میں مقام حاصل کیا۔ ان امور کی تفصیل ڈاکٹر سید محمد عبداللہ، ڈاکٹر عبدالقیوم اور ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی کے تحقیقی مقالوں میں ملاحظہ فرمائی جا سکتی ہے۔[۴۳]

مرزا غالب اور ان کے دائرہ تعارف میں شامل مذکورہ بالا افراد کے درمیان سر سید احمد خاں کے یہ روابط ہمارے زیر نظر مقالے "غالب اور علی گڑھ" کے منظر نامے میں اس اہم تاریخی پس منظر کی حیثیت رکھتے ہیں جسے پیش نظر رکھے بغیر اس تصویر کی تکمیل ممکن نہ تھی۔ دیار علی گڑھ سے غالب و غالبیات کے رشتوں کے دائرہ کار میں ابھی کچھ اور بھی قابل ذکر امور کا ذکر باقی ہے جن کا حال سطور ذیل میں اجمال سے پیش کرنا بے محل نہ ہوگا۔

غالب کے عقیدت مندوں کی فہرست میں متعدد اور بھی ایسے افراد شامل ہیں جو یا تو علی گڑھ کے باشندے رہے ہیں یا جن کے سفرِ حیات کی کسی نہ کسی منزل میں دیارِ علی گڑھ سے وابستگی کا ذکر ملتا ہے۔ ان اشخاص کی فہرست میں درج ذیل افراد کا نام شامل ہے:

مولانا محمد اسمٰعیل میرٹھی

غالب کے شاگرد مولانا محمد اسمٰعیل میرٹھی (زمانۂ حیات ۱۲ نومبر ۱۸۴۴ء تا یکم نومبر ۱۹۱۷ء) نے سرسید کے علی گڑھ کالج سے شائع ہونے والی طوطیِ ہند حضرت امیر خسرو کی کتابوں کے سلسلے میں مثنوی "قران السعدین" کی ترتیب و تصحیح کا کام سرانجام دیا تھا مگر وہ اپنی مرتب کردہ اس کتاب کی مطبع انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ سے اشاعت (۱۹۱۸ء) سے قبل ہی نومبر ۱۹۱۷ء میں فوت ہوگئے۔ مولانا اسمٰعیل میرٹھی کی بعض نظمیں سرسید احمد خاں کے ادبی معاون مولانا وحیدالدین سلیم پانی پتی کے رسالے 'معارف' علی گڑھ میں شائع ہوئی تھیں[۴۵]

منشی ہرگوپال تفتہ

منشی ہرگوپال تفتہ (زمانۂ حیات ۱۲۱۴ھ تا ۱۵ رمضان ۱۲۹۶ھ) مرزا غالب کے چہیتے شاگرد تھے۔ غالب کے مطبوعہ اردو خطوط سب سے زیادہ تفتہ کے نام ہیں، ان کی تعداد ۱۲۳ ہے۔ تفتہ اگرچہ قصبۂ سکندرآباد (ضلع بلند شہر) کے باشندے تھے لیکن مولوی محمد ظہور علی (صدرالصدور کول) کی خواہش پر تفتہ نے اپنی زندگی کا ایک قابل لحاظ حصہ کول (یعنی علی گڑھ) میں بھی گزارا تھا جس کا ذکر انھوں نے اپنی فارسی مثنوی 'سنبلستان' کے سبب تالیف میں کیا ہے[۴۶] ہرگوپال تفتہ کا ذکر مختلف قدیم تذکروں کے علاوہ عہد حاضر کے بھی متعدد مصادر میں موجود ہے[۴۷]

منشی نبی بخش حقیر

منشی نبی بخش حقیر اکبرآبادی (متوفی ۱۲۷۷ھ/ ۱۸۶۰ء) مرزا غالب کے ان شاگردوں میں تھے جن کی سخن فہمی اور دوستی پر مرزا کو ناز تھا۔ حقیر کے نام غالب کے مطبوعہ اردو خطوط کی

تعداد ۰، ہے جن میں ۹، مارچ ۱۸۴۸ء کا ایک ایسا مکتوب بھی موجود ہے جو غالب کا قدیم ترین دستیاب مطبوعہ خط مانا جاتا ہے۔ حقیر محلہ تاج گنج آگرہ کے رہنے والے تھے لیکن انگریزی سرکار کی عدالت فوج داری میں بہ عہدۂ سر رشتہ داری اپنی ملازمت کی بدولت وہ مدتوں کول (علی گڑھ) میں مقیم رہے تھے۔[۳۴۸]

مولوی سید محمد عبدالرزاق شاکر

شاگرد غالب مولوی سید محمد عبدالرزاق شاکر (زمانہ حیات ۱۸۳۵ء تا جون ۱۴ ۱۹ء) باشندے تو پھلی شہر کے تھے مگر اپنی ملازمت کے دوران جن مختلف شہروں میں ان کی سکونت رہی ان میں علی گڑھ بھی شامل ہے۔ شاکر ۱۸۹۴ء میں اپنے قیام علی گڑھ کے دوران ملازمت سے سبکدوش ہو کر علی گڑھ ہی میں رہنے لگے تھے۔ شاکر کے ایک فرزند سید نقی علی ایڈووکیٹ (متوفیٰ ۱۹۲۳ء) مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں قانون کے استاد بھی رہے تھے۔[۳۴۹]

محمد ابوالحسن

سرسید کے مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے مدرس اور سرسید کے پرائیویٹ سکریٹری محمد ابوالحسن دراصل مرزا غالب کے شاگرد مولوی محمد عزیزالدین عزیز وصادق بدایونی کے فرزند تھے۔ (تلامذۂ غالب ص ص ۳۴۷ تا ۳۴۹)

مولانا عبدالصمد کلیم

مولانا عبدالصمد کلیم مرزا غالب کے ایک ایسے شاگرد تھے جو دیار علی گڑھ کے رہنے والے تھے مگر بعد کو وہ اجمیر جا بسے تھے۔ (تلامذۂ غالب ص ۴۶۴)

منشی سخاوت حسین مدہوش بدایونی

غالب کے شاگرد خاں بہادر منشی سخاوت حسین مدہوش بدایونی (۱۸۳۶ء - ۱۹۰۱ء)

سرسید کی علی گڑھ تحریک کے سرگرم ہمنواؤں میں شامل رہے تھے [۹۵]

مولوی عبدالقیوم

مولوی عبدالقیوم (صدرامین علی گڑھ) مرزا غالب کے اردو خطوط کے مجموعوں عودِ ہندی، اور اردوئے معلّیٰ کی اشاعت سے بوجوہ غیرمعمولی دلچسپی رکھتے تھے اس کی تفصیل ان کے نام اخبار غلام غوث بے خبر کے ایک خط میں موجود ہے جو فغان بے خبر میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے [۹۶]

غالبیات اور علی گڑھ

سرسید کا قائم کردہ علی گڑھ کالج جو بعد کو ترقی کرکے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ بنا غالب و غالبیات کے مطالعے کے سلسلے میں سرسید کی زندگی کے دوران ہی میں دلچسپی لینے لگا تھا سید احمد خاں کے نام سید مہدی حسن کے ایک خط (مورخہ ۳ اکتوبر ۱۸۸۳ء) سے پتا چلتا ہے کہ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۲۱ اگست ۱۸۸۳ء میں خلیفہ سید محمد حسن خاں (میر منشی ریاست پٹیالہ) کی ایک تجویز چھپی تھی جس کے ذریعے علی گڑھ کالج میں ذوق و غالب کی یادگار قائم کرنے کی تحریک کی گئی تھی [۹۷] سرسید کے علی گڑھ کالج میں غالب کی یہ مجوزہ یادگار قائم ہوئی یا نہیں اس کا ہمیں علم نہیں لیکن سرسید کے نامور رفیقِ کار اور غالب کے شاگرد مولانا حالی کی کتاب 'یادگار غالب' (طبع اول مطبوعہ ۱۸۹۷ء) ہماری اطلاع کے مطابق غالب کی وہ پہلی مبسوط سوانح عمری ہے جس نے عام ادبی حلقوں کے لیے غالب شناسی کا ایک نیا باب کھولا تھا [۹۸] 'یادگار غالب' حالی کی قلمی کاوشوں سے معرضِ وجود میں آنے والے اس سوانحی ادب کا ایک یادگار کارنامہ ہے۔ جو سرسید کی علی گڑھ تحریک سے حالی کی وابستگی کے اثرات کا مظہر تسلیم کیا جاتا ہے

'یادگار غالب' (۱۸۹۷ء) کے بعد بھی مولانا حالی نے غالبیات کے میدان میں اپنی ادبی سرگرمیوں کو جاری رکھا جن کے نتیجے میں اپریل ۱۸۹۹ء میں خطوطِ غالب کے مجموعے اردوئے معلّیٰ حصہ دوم کی پہلی اشاعت عمل میں آئی۔ اس کتاب کے لیے غالب کے

غیر مطبوعہ خطوط کی فراہمی کا کام حالی ہی نے انجام دیا تھا جیسا کہ اردوئے معلیٰ حصہ دوم طبع اول (مطبوعہ اپریل ۱۸۹۹ء ص ۱) میں شامل کتاب کے ناشر محمد عبدالاحد کے اعلان سے ظاہر ہوتا ہے

احباب علی گڑھ میں حالی سے حال تک غالب و غالبیات پر نوشت و خواند کا کام انجام دینے والوں کے طویل سلسلے میں حالی کے بعد حسرت موہانی کا نام قابل ذکر ہے۔ سید فضل الحسن حسرت موہانی نے علی گڑھ کالج سے ۱۹۰۳ء میں بی۔ اے پاس کیا تھا۔ حسرت نے اپنے دوسرے رفیقوں کے تعاون سے ۱۹۰۳ء سے قبل ہی علی گڑھ کالج میں "انجمن اردوئے معلیٰ" قائم کی۔ ان کا بیان ہے کہ اس ادبی انجمن کی نشستوں میں شریک ہونے والے طلبہ جلسہ شروع ہونے سے قبل وقت گزاری کے لیے اشعار غالب کی تشریح کیا کرتے تھے۔ حسرت نے جولائی ۱۹۰۳ء میں علی گڑھ سے جو اپنا مشہور و مقبول رسالہ اردوئے معلیٰ جاری کیا اس کا نام غالباً خطوطِ غالب کے مجموعے اردوئے معلیٰ کے نام سے مستعار معلوم ہوتا ہے۔ حسرت کی ادبی زندگی کی پہلی کتاب جو ۱۹۰۵ء میں چھپی "دیوانِ غالب اردو مع شرح" تھی۔ اس کتاب نے حسرت کی زندگی کے دوران متعدد بار شائع ہو کر جس طرح ادبی حلقوں کو غالب کی عظمت سے روشناس کرایا وہ غالب شناسی میں ایک یادگار کارنامہ مانا جاتا ہے۔ مشہور ماہر غالبیات غلام رسول مہر معترف ہیں کہ غالب سے ان کی دلچسپی کے اسباب و محرکات میں حسرت موہانی کی یہ شرحِ دیوانِ غالب بھی شامل تھی۔ ان کے ادبی جریدے 'اردوئے معلیٰ' میں خود غالب یا تلامذۂ غالب کے متعلق جو مقالے چھپتے رہتے تھے انھوں نے بھی حلقوں میں مطالعۂ غالب کے لیے ایک سازگار رفضا تیار کی۔ مشہور محقق قاضی عبدالودود (مرحوم) کا بیان ہے:

"مجھے یاد نہیں کہ کس طرح حسرت موہانی کا رسالہ 'اردوئے معلیٰ' میں نے دیکھا اور اس کے کئی پرانے مجلدات منگوائے اور ان میں شعرائے اردو سے متعلق جو مضامین تھے، پڑھے۔ بعد کو مجھے غالب سے دلچسپی ہوئی اور میں نے اتنی بار اس کا دیوان دیکھا کہ اس کا بڑا حصہ مجھے یاد ہو گیا ہے"

قاضی عبدالودود مرحوم کا یہ بیان بتاتا ہے کہ انھیں مطالعۂ غالب کی جانب متوجہ

کہنے میں حسرت موہانی کا ادبی مجلہ اردوے معلّٰی اہم محرک ثابت ہوا۔ اس رسالے سے متاثر ہوکر قاضی عبدالودود نے بعد کو غالب اور غالبیات پر، جو گراں قدر ادبی سرمایہ فراہم فرمایا وہ مقدار و معیار دونوں ہی اعتبار سے جس وزن و وقار کا حامل ہے اس سے اہلِ نظر بخوبی باخبر ہیں۔[۵۸]

حسرت موہانی نے غالبیات کے میدان میں جو یادگار کارنامے سرانجام دیے ان کی تفصیل ہمارے مقالے "غالب شناسی اور مولانا حسرت موہانی" (مطبوعہ رسالہ غالب نامہ نئی دہلی، جولائی ۱۹۸۸ء ص ص، ۱۴۳ تا ۱۶۲) میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

اب علی گڑھ کالج کے نامور فرزند ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری (وفات ۷، نومبر ۱۹۱۸ء) کی مشہور کتاب محاسن کلامِ غالب، جو ۱۹۲۱ء میں مطبع مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ گزٹ علی گڑھ سے اپنے مصنف کی وفات کے بعد شائع ہوئی تھی غالب شناسی کی تاریخ میں ایک اہم سنگ میل تسلیم کی جاتی ہے۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری ۱۹۰۲ء سے ۱۹۰۹ء تک علی گڑھ کالج میں زیرِ تعلیم رہے تھے۔

غالبیات کے میدان میں علی گڑھ کالج کے تعلیم یافتہ اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے سابق وائس چانسلر ڈاکٹر ذاکر حسین کا برلن (جرمنی) سے ۱۹۲۵ء میں شائع کردہ دیوانِ غالب (اردو) غالبیاتِ علی گڑھ کے سلسلے ہی کی ایک کڑی ہے۔[۵۹]

ڈاکٹر ذاکر حسین کے شائع کردہ دیوانِ غالب (مطبوعہ ۱۹۲۵ء) کے بعد ۱۹۲۶ء اور ۱۹۲۸ء میں اربابِ علی گڑھ نے غالبیات میں جو اضافے کیے ان کا حال سطورِ ذیل سے معلوم ہوگا۔

۴۸۵ صفحات کی ضخامت پر مشتمل 'مطالبِ غالب' کے عنوان سے قاضی سعیدالدین احمد کی تیار کردہ شرحِ دیوانِ غالب پہلی بار مطبع مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ہی سے ۱۹۲۶ء میں چھپی۔[۶۰] غالب کے اردو خطوط کے مجموعے عودِ ہندی کا بھی ایک اڈیشن مطبع مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے، ۱۹۲۶ء میں منظرِ عام پر آیا۔[۶۱] علی گڑھ کے سابق طالب علم بابائے اردو مولوی عبدالحق نے رسالہ اردو جولائی ۱۹۲۸ء میں اپنا مقالہ "غالب کی خودنوشت سوانح عمری کا ایک ورق۔ مولوی امداد الحق کے تذکرے کے لیے": چھپوا کر غالب سے متعلق دستیاب مواد پر اضافہ کیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے رسالۂ اردو اورنگ آباد (اپریل ۱۹۴۳ء) میں "روئدادِ مقدمہ مرزا غالب" شائع کر کے غالب کی زندگی سے متعلق ایک اہم دستاویز شائع کی جس میں غالب کے سلسلے میں کچھ نئے معلومات ملتے ہیں۔[۶۲]

"غالبیات اور علی گڑھ" کے موضوع کے سلسلے میں علی گڑھ میگزین کا غالب نمبر (۴۹-۱۹۴۸ء) مرتبہ مختار الدین احمد آرزو ایک نیا باب کھولتا ہے۔ اس شمارے میں جہاں مالک رام، غلام رسول مہر، حمید احمد خاں، مہیش پرشاد، امتیاز علی خاں عرشی، عبد المجید سالک، شوکت سبزواری اور عبادت بریلوی ایسے نامور اہل قلم کے مقالات شامل ہیں وہاں علی گڑھ سے تعلق رکھنے والے عبد الستار صدیقی، رشید احمد صدیقی، قاضی عبد الودود، آل احمد سرور، مختار الدین آرزو کے بھی مضامین ہیں۔ جنھوں نے غالب شناسی کے میدان میں قابل لحاظ مقدار میں نیا مواد فراہم کر کے غالب فہمی کی تاریخ میں یادگار کارنامہ سرانجام دیا۔ علی گڑھ میگزین ۴۹-۱۹۴۸ء کے غالب نمبر کی بدولت غالب شناسی کے منظر نامے میں پروفیسر مختار الدین احمد کے ایسے ماہر غالبیات کا ایک نیا نام ابھر کر سامنے آیا۔ علی گڑھ میگزین ۴۹-۱۹۴۸ء کا یہ غالب نمبر اپنے دامن میں ایسا اور اتنا مواد رکھتا تھا کہ اس کے مرتب مختار الدین احمد آرزو (علیگ) نے ڈاکٹر ذاکر حسین اور رشید احمد صدیقی کی فرمائش پر حذف و اضافے کے بعد اسے دو حصوں میں مرتب کیا اور قاضی عبد الغفار صاحب نے انجمن ترقی اردو سے شائع کیا۔

(۱) احوال غالب : مرتبہ ڈاکٹر مختار الدین احمد۔ انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ۔ طبع ۱۹۵۳ء، دوسرا اڈیشن (دہلی ۱۹۸۶ء)

(۲) نقد غالب : مرتبہ ڈاکٹر مختار الدین احمد علیگ، انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ، طبع جون ۱۹۵۶ء اس کا دوسرا اڈیشن پروفیسر آل احمد سرور کے مقدمے کے ساتھ ابھی حال میں پروفیسر سید معین الرحمٰن صاحب صدر شعبۂ اردو گورنمنٹ کالج لاہور نے شائع کیا ہے۔

اردو فلم "مرزا غالب" جو ہندوستان میں ۵۵-۱۹۵۴ء کے آس پاس ریلیز ہوئی اور غالب کی عوامی مقبولیت کا سبب بنی اس کی کہانی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نامور فرزند سعادت حسن منٹو (علیگ) کی قلمی کاوش کا نتیجہ تھی۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے منٹو کے تعلق کے متعلق رسالہ فکر و نظر علی گڑھ (مارچ ۱۹۹۱ء ص ۶۹ و بہ بعد) میں مفید مواد موجود ہے۔

ہندوستان میں غالب صدی تقریبات (۱۹۶۹ء) سے قبل ۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۸ء تک کے درمیانی عرصے کے دوران علی گڑھ کالج یا مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے جن اساتذہ اور سابقہ طلبہ نے غالبیات میں اپنے ادبی کام کی بدولت نام و مقام حاصل کیا ان کے نام اور ادبی کام کا حال سطور ذیل میں

اجمال سے پیش کیا جاتا ہے :

پروفیسر محمد رشید الاسلام کی کتاب 'غالب'۔ ابتدائی دور (طبع اول مطبوعہ ۱۹۷۰ء) یہ غالب پر تحقیقی مقالہ ہے جس پر انھیں علی گڑھ سے ڈاکٹریٹ تفویض ہوئی۔ اس کا تیسرا اڈیشن غالب تقلید و اجتہاد ۱۹۷۹ء میں شائع ہوا۔

ڈاکٹر خلیق انجم علیگ (سابق طالب علم مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) : غالب کی نادر تحریریں مطبوعہ فروری ۱۹۶۱ء

اکبر علی خاں عرشی زادہ علیگ (سابق طالب علم مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) : نکات و رقعات مطبوعہ اکتوبر ۱۹۶۲ء

قاضی عبدالودود : قاطع برہان و رسائل متعلقہ جلد ۱ مطبوعہ، ۱۹۶۶ء۔ قاضی عبدالودود کے بارے میں یہ بات کم لوگوں کو معلوم ہے کہ انھوں نے انگلستان جانے سے قبل بلگرامی ٹیوٹوریل اسکول علی گڑھ میں تعلیم حاصل کی تھی[۶۳]

ڈاکٹر یوسف حسین خاں (سابق پرووائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) : ' غالب اور آہنگ غالب' مطبوعہ دسمبر ۱۹۶۸ء

۱۹۶۹ء میں غالب صدی تقریبات کے موقعے پر ہندستانی دانشوروں نے متعدد مطبوعات کی شکل میں غالب کو جو خراج عقیدت پیش کیا اس میں شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی جانب سے ایک منصوبے کے تحت غالب پر درج ذیل کتابیں تیار کرا کے شائع کی گئیں جو ۱۹۶۹ء کے بعد تک منظر عام پر آتی رہی تھیں۔

(۱) متاع غالب : مرزا جعفر حسین مطبوعہ فروری ۱۹۶۹ء (غالب کا منتخب فارسی کلام)

(۲) عرفان غالب : پروفیسر آل احمد سرور طبع ۱۹۶۹ء (مجموعہ مقالات غالب سمینار مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)[۶۴]

(۳) عکس غالب (غالب کے منتخب خطوط : پروفیسر آل احمد سرور[۶۵]

(۴) غالب کا فن : پروفیسر اسلوب احمد انصاری[۶۶] (شعبۂ انگریزی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

(۵) انگریزی کتاب " غالب ری ویلس ہم سلف" : مرتبہ و مترجمہ ڈاکٹر نورالحسن نقوی

(شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، طبع ۷۲، ۱۹ء)

(۶) غالب ببلیوگرافی ، محمد انصار اللہ طبع ۷۲، ۱۹ء (شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

(۷) انگریزی کتاب EVALUATION OF GHALIB'S PERSIAN POETRY ، وارث کرمانی (شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

(۸) غالب کی شاعری پر ڈاکٹر وارث کرمانی کی ایک اور انگریزی کتاب بھی شائع ہوئی تھی جو میری نظر سے نہیں گزری (بہ حوالہ پروفیسر مختار الدین احمد)[۳۶]

غالب صدی کے موقعے پر ۱۹۶۹ء کے دوران بشیر بدر کی ادارت میں علی گڑھ میگزین کا جو ڈائمنڈ جوبلی نمبر شائع کیا گیا وہ غالب کے لیے مختص تھا۔ غالب صدی تقریبات کے موقعے پر علی گڑھ کالج اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے سابق طالب علموں نے غالب وغالبیات پر جو شاندار علمی، ادبی اور تحقیقی کام سرانجام دیے ان میں درج ذیل قابلِ ذکر ہیں:

(الف) "غالب کی شخصیت اور شاعری" (طبع ۱۹۷۰ء) پروفیسر رشید احمد صدیقی مرحوم کے دو عدد خطبات پر مشتمل ہے۔ موصوف کے یہ خطبے فروری ۱۹۶۹ء میں شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کی دعوت پر پیش ہوئے تھے اور کتابی شکل میں ان کی اشاعت ۱۹۷۰ء میں ہوئی تھی۔

(ب) ۱۹۶۹ء میں غالب صدی تقریبات ہی کے موقعے پر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے سابق طالب علم اکبر علی خاں عرشی زادہ نے دیوانِ غالب نسخۂ عرشی زادہ شائع کرکے غالب شناسی کی تاریخ میں جو یادگار کام سرانجام دیا اس سے ادبی حلقے بخوبی باخبر ہیں۔

(ج) غالب کی صد سالہ برسی ۱۹۶۹ء ہی کے موقعے پر ڈاکٹر یوسف حسین سابق پرو وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی مرتب کردہ کتاب بین الاقوامی غالب سمینار (اردو) بھی غالبیات اور علی گڑھ کے سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔

(د) غالب کی صد سالہ برسی ۱۹۶۹ء کے دوران منعقد ہونے والی تقریبات علی گڑھ کالج کے سابق طالب علم اور ماہر غالبیات قاضی عبدالودود کے گراں قدر مشوروں کی بدولت جس زبردست کامیابی سے ہمکنار ہوئی تھیں اس سے ادبی حلقے بے خبر نہیں۔[۳۹]

غالب صدی تقریبات کے بعد بھی ارباب علی گڑھ نے غالب وغالبیات پر لوشت وخواند کے کام کو جاری رکھا اب تک حسب ذیل کتابیں منظرِ عام پر آچکی ہیں :

(۱) نقشِ غالب : اسلوب احمد انصاری (سابق صدر شعبۂ انگریزی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) مطبوعہ اکتوبر ۱۹۷۰ء

(۲) غالب اور شاہانِ تیموریہ : ڈاکٹر خلیق انجم (علیگ) مطبوعہ دسمبر ۱۹۷۴ء

(۳) غالب اور سرور : ایم. حبیب خاں (علیگ) مطبوعہ دسمبر ۱۹۷۵ء

(۴) خطوط غالب کا تحقیقی مطالعہ : کاظم علی خاں سابق طالب علم مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (یعنی راقم الحروف) مطبوعہ ۱۹۸۱ء

(۵) خطوطِ غالب (فنی تجزیہ) : حامدہ مسعود عبداللہ گرلس کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، مطبوعہ ۱۹۸۲ء

(۶) 'تفتہ اور غالب' : ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری (علیگ) مطبوعہ دسمبر ۱۹۸۴ء

(۷) غالب کے خطوط (چار جلدوں میں) : ڈاکٹر خلیق انجم (علیگ) . غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی مطبوعہ ۱۹۸۴ - ۱۹۹۳ء

دہلی میں غالب پر علمی وادبی کام میں جو اہم ادارے سرگرم عمل ہیں ان میں غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی بھی شامل ہے جسے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے سابق وائس چانسلر اور علی گڑھ کالج کے سابق طالب علم ڈاکٹر ذاکر حسین نے قائم کیا تھا. یہ ادارہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نامور فرزند فخرالدین علی احمد کی سرپرستی سے بھی فیضیاب رہا ہے. (بحوالہ احوال غالب طبع ۱۹۸۶ء ص ۴) غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی کے سابق سکریٹری پروفیسر نذیر احمد (سابق صدر شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) کی نگرانی میں. برسوں سے ہر سال بین الاقوامی غالب سیمینار منعقد ہوتا رہتا ہے جس میں دنیا کے مختلف ملکوں سے ماہر غالبیات آکر اپنے علمی مقالات پیش کرتے ہیں. پروفیسر نذیر احمد غالب انسٹی ٹیوٹ کے علمی مجلے غالب نامہ نئی دہلی کی کامیاب ادارت کا کام برسوں سے بحسن وخوبی سرانجام دے رہے ہیں. پروفیسر نذیر احمد کی کتاب نقد قاطع برہان مع ضمائم بھی غالبیات اور علی گڑھ کے ضمن میں آتی ہے.

مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں غالب اور غالبیات کے متعلق نوادر کا جو وقیع علمی ذخیرہ موجود و محفوظ ہے اس کی مکمل تفصیل کے مرتب ہونے کی ضرورت ہے۔ پروفیسر مختارالدین احمد اپنے ایک مقالے "آثارِ غالب" میں مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں موجود غالب سے متعلق بعض نوادر کا تعارف پیش فرماچکے ہیں۔

مئی ۱۹۹۳ء میں مکمل ہونے والا میرا یہ طویل مقالہ "غالب اور علی گڑھ" اس موضوع پر میرے ایک تحقیقی منصوبے کا وہ ابتدائی خاکا ہے جسے مکمل کرنا میری ادبی زندگی کا خوشگوار فریضہ قرار دیا جائے گا۔ علیگ برادری کے ایک ادنیٰ رکن کی حیثیت سے مجھے اپنی مادرِ تعلیم مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور علیگ برادری سے اس کام میں تعاون کی پوری توقع ہے۔

حواشی

١ بحوالہ مقالہ پروفیسر سید محمد کمال الدین حسین ہمدانی "علی گڑھ کا تاریخی پس منظر" مشمولہ رسالہ "فکر و نظر" علی گڑھ سرسید نمبر اکتوبر ۱۹۹۲ء ص ۱۳۶

٢ دیکھیے: ۱۔ اردوے معلیٰ طبع اول مطبوعہ جمعہ ۵ مارچ ۱۸۶۹ء (علی گڑھ)، ص ۷، ص ۱۲۸ (کول)، ص ۶۰، ص ۹۰، ص ۱۰۷، ص ص ۱۱۴ تا ۱۱۶ نیز ص ۱۵۶ نادراتِ غالب، مرتبہ آفاق حسین آفاق کراچی۔ طبع ۱۹۴۹ء ص ۵۴ جہاں غالب نے علی گڑھ کے لیے "کول" لکھا ہے۔

٣ احوالِ غالب، مرتبہ پروفیسر مختارالدین احمد۔ انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی۔ طبع دوم ۱۹۸۶ء ص ص ۱۶ تا ۲۱

٤ ذکرِ غالب ص ۲۶ نیز ص ۴۴، حیات جاوید ص ۲۹، خطوط غالب کا تحقیقی مطالعہ ص ص ۲۹ تا ۳۰

٥ صوبہ شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوعات: محمد عتیق صدیقی۔ انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ طبع ۱۹۶۲ء ص ۳۴۲ (حاشیہ ۱)، ذکرِ غالب ص ۱۶۵

٦ تلاشِ غالب: نثار احمد فاروقی (دہلی) مئی ۱۹۶۹ء، ص ص ۱۲۶ تا ۱۲۷

٧ سید محمد خاں کی تاریخ وفات کے لیے دیکھیے صوبہ شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوعات ص ۳۴۲ حاشیہ

٨ آثار الصنادید: سید احمد خاں، مرتبہ خلیق انجم جلد دوم، اردو اکادمی دلی۔ طبع ۱۹۹۰ء ص ص ۱۲۱ تا ۱۲۳

٩ ایضاً ص ١٢٣

١٠ کلیاتِ نثرِ غالب۔ مطبع منشی نول کشور کانپور اپریل ١٨٨٨ء، ص ص ٨٣ تا ٨٥

١١ 'بزمِ غالب'؛ عبدالرؤف عروج۔ ادارۂ یادگارِ غالب کراچی طبع ١٩٦٩ء ص ص ٢٤١ تا ٢٤٣

١٢ کلیاتِ غالب؛ مطبع منشی نول کشور لکھنؤ۔ طبع ١٨٦٣ء ص ص ١٣ تا ١٤

١٣ ر۔ک مقالۂ کاظم علی خاں "مہر نیم روز۔ تحقیق کی روشنی میں" مطبوعہ دوماہی اکادمی لکھنؤ۔ مارچ ٨٢ء ص ٦٤

١٤ حیاتِ جاوید ص ٣، (فٹ نوٹ)

١٥ ذکرِ غالب ص ص ١١٣، ١١٤

١٦ احوال سید محمد خاں درج ذیل مصادر کے حوالے سے پیش کیے گئے ہیں؛ صوبۂ شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوعات ص ص ٣٠١ تا ٣٠٤، اردو صحافت کی تاریخ؛ نادر علی خاں۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ۔ طبع ١٩٨٧ء ص ص ٧٠ تا ١٣٣، ہندوستانی اخبار نویسی (کمپنی کے عہد میں)؛ محمد عتیق صدیقی انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ۔ طبع دسمبر ١٩٥٧ء ص ص ٧٧، ٢ تا ٩٠، ٢

١٧ غالب کے فارسی خط کا یہ اردو مفہوم "پنج آہنگ": مرتبہ و مترجمہ محمد عمر مہاجر۔ ادارۂ یادگارِ غالب کراچی طبع مارچ ١٩٦٩ء ص ٩٣ سے ماخوذ ہے غالب کے اصل خط کا فارسی متن پنج آہنگ' مشمولہ کلیاتِ نثرِ غالب طبع اپریل ١٨٨٨ء ص ١٤٢ میں موجود ہے۔

١٨ حیاتِ جاوید ص ٦١، ذکرِ غالب ص ص ٩٦ تا ٩٧ نیز ص ٩٩، تلامذۂ غالب؛ مالک رام طبع ١٩٨٤ء ص ٨٥ ٣، مقالۂ کاظم علی خاں "بہادر شاہ ظفر کی کتاب پر غالب کی ایک تقریظ" مشمولہ ہماری زبان نئی دہلی۔ یکم ستمبر ١٩٨١ء ص ص ١ تا ٢

١٩ - ر۔ک، خیابانِ تاریخ؛ محمد علی جویا مرادآبادی۔ مطبع منشی نول کشور لکھنؤ طبع اکتوبر ١٨٨١ء ص ٥٩ آثار الصنادید؛ سید احمد خاں۔ مرتبہ خلیق انجم جلد دوم، ص ص ٤٨ تا ٥٠، مقالۂ کاظم علی خاں "حکیم احسن اللہ خاں اور غالب" مطبوعہ رسالہ ہماری زبان نئی دہلی۔ یکم نومبر ١٩٨١ء ص ص ١ تا ٦ نیز ص ٦ پنج آہنگ مشمولہ کلیاتِ نثرِ غالب طبع اپریل ١٨٨٨ء ص ١٠، مقالۂ کاظم علی خاں "مہر نیم روز۔ تحقیق کی روشنی میں" مطبوعہ دوماہی اکادمی لکھنؤ مارچ ١٩٨٢ء ص ص ٦١ تا ٦٢

۲۰۔ حیاتِ جاوید ص ۴۳، آثار الصنادید، مرتبہ خلیق انجم (جلد دوم)، ص ص ۶۰ تا ۹۱، بزمِ غالب، ص ص ۲۲ تا ۲۶

۲۱۔ حیاتِ جاوید ص ۴۵ نیز ص ۶۵۳، بزمِ غالب ص ص ۲۴۲ تا ۲۶۲

۲۲۔ مکاتیبِ غالب دیباچہ ص ص ۱ تا ۹۱، نیز ص ص ۱۰۹ تا ۱۳۸، تلامذۂ غالب ص ص ۵۱۲ تا ۵۱۵
خطوطِ غالب کا تحقیقی مطالعہ ص ۸، انگریزی کتاب "سرسید اینڈ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ" کاظم علی خاں
پرکاشن کیندر لکھنؤ طبع ۱۹۹۶ء ص ۱، انگریزی کتاب سیلیکٹیڈ ڈاکیومنٹس فرام دی علی گڑھ
آرکائیوز، مرتبہ یوسف حسین خاں۔ ایشیا پبلشنگ ہاؤس بمبئی۔ طبع ۱۹۶۶ء ص ۳۸۷

۲۳۔ اردوئے معلّٰی (حصہ دوم)، طبع اول مطبوعہ اپریل ۱۸۹۹ء ص ص ۱ تا ۵، اردوئے معلّٰی (حصہ اول) ایڈیشن،
حصہ دوم، مرتبہ سید مرتضیٰ حسین فاضل۔ مجلسِ ترقی ادب لاہور۔ طبع اپریل ۱۹۷۰ء ص ص ۸۵۲ تا
۸۵۹ (مع حواشی و تعلیقات)

۲۴۔ خطوطِ غالب کا تحقیقی مطالعہ ص ۸

۲۵۔ مقالہ کاظم علی خاں "غالب اور نواب علائی" مطبوعہ دو ماہ اکادمی لکھنؤ ماہ جنوری / فروری ۱۹۸۴ء ص ۲۱

۲۶۔ تفصیل کے لیے میرے درج ذیل دو مطبوعہ مقالے ملاحظہ ہوں۔
"غالب اور نیر رخشاں" مطبوعہ رسالہ آج کل نئی دہلی۔ دسمبر ۱۹۸۰ء ص ص ۳۲ تا ۴۰۔
"غالب اور معروف دہلوی" مطبوعہ رسالہ جامعہ نئی دہلی۔ ستمبر ۱۹۸۰ء ص ص ۴۴ تا ۵۳۔

۲۷۔ آثار الصنادید۔ مرتبہ خلیق انجم (جلد دوم) ص ص ۱۴۴ تا ۱۵۹، سیلیکٹیڈ ڈاکیومنٹس فرام دی
علی گڑھ آرکائیوز" ص ص ۱۶۵ تا ۱۶۶

۲۸۔ بزمِ غالب ص ص ۲۹۳ تا ۲۹۷، ذکرِ غالب ص ص ۱۳۶ تا ۱۴۳، تلامذۂ غالب ص ص ۳۹۱ تا ۳۹۵
تذکرۂ ماہ و سال، مالک رام۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی طبع نومبر ۱۹۹۱ء ص ۲۵۷

۲۹۔ آثار الصنادید (جلد دوم)، ص ص ۱۵۹ تا ۱۶۳

۳۰۔ ایضاً ص ص ۱۶۳ تا ۱۶۵، سخن شعرا، نساخ۔ مطبع منشی نول کشور لکھنؤ۔ طبع اکتوبر ۱۸۷۴ء
ص ص ۴۲۲ تا ۴۲۳، بزمِ سخن، سید علی حسن خاں دسلیم، مطبع مفید عام آگرہ طبع اوّل
مطبوعہ ۱۲۹۸ھ ص ۱۰۴، تلامذۂ غالب ص ۴۸۷

۳۱ یہاں منشی نول کشور کے حالات اور غالب سے ان کے تعلقات کی تفصیلات کے لیے میں نے
اپنے درج ذیل دو مطبوعہ مقالوں سے مدد لی ہے:
"منشی نول کشور" مطبوعہ رسالہ جامعہ نئی دہلی فروری ۱۹۸۱ء ص ص ۸۳ تا ۹۰
"غالب اور منشی نول کشور" مطبوعہ رسالہ نیا دور لکھنؤ۔ نول کشور نمبر۔ نومبر/دسمبر ۱۹۸۰ء ص ص ۱۳۶
تا ۱۵۴۔

۳۲ مقالہ کاظم علی خاں "غالب اور منشی نول کشور" مشمولہ نیا دور لکھنؤ نول کشور نمبر۔ بابت نومبر/دسمبر
۱۹۸۰ء ص ص ۱۵۰ تا ۱۵۱ (حاشیہ ۔۔) مقالہ ڈاکٹر اکبر حیدری کشمیری مشمولہ "ہماری زبان"
نئی دہلی شمارہ جات ۲۲ مارچ و یکم اپریل ۱۹۹۳ء، "سیلیکٹیڈ ڈاکیومنٹس فرام دی علی گڑھ
آرکائیوز" ص ص ۱۶۹ تا ۱۷۰ نیز ص ص ۲۱۰ تا ۲۱۱

۳۳ جیون چرتر منشی نول کشور صاحب، منشی لالہ جی۔ مطبع منشی نول کشور لکھنؤ طبع ۱۹۰۳ء ص ص ۷ تا ۹

۳۴ تذکرۂ گلشن بے خار، نواب مصطفیٰ خاں شیفتہؔ۔ مطبع منشی نول کشور لکھنؤ۔ طبع اکتوبر ۱۸۷۴ء

۳۵ بزم غالب ص ص ۱۶۱ تا ۱۶۳

۳۶ تذکرۂ ماہ و سال ص ۱۲۵، تلامذۂ غالب ص ۱۴۳ نیز ص ۱۴۸

۳۷ میری لائبریری میں مولانا حالی کی کتابیں موجود ہیں ان میں دیوان حالیؔ کا وہ کمیاب پہلا ایڈیشن
بھی شامل ہے جو مطبع انصاری دہلی سے ۱۸۹۳ء میں شائع ہوا تھا۔ دیوان حالی طبع اول کا سرورق
نامی پریس کانپور میں چھپا تھا۔ دیوان حالی کے اس پہلے ایڈیشن (ص ص ۱ تا ۲۲۸) میں مولانا حالیؔ
کا مقدمہ ہے اور پھر صفحات کے ایک نئے سلسلے کے ماتحت اس میں دیباچہ دیوان بھی شامل ہے

۳۸ یادگار حالیؔ، صالحہ عابد حسین۔ انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ۔ طبع بار سوم ص ۳۴، حالی کی اردو
نثر نگاری، ڈاکٹر عبد القیوم ص ص ۳۵۶ تا ۳۵۷، مقالہ خلیق انجم "حالی اور غالب" مشمولہ
ہماری زبان نئی دہلی۔ ۲۲ اپریل ۱۹۸۱ء ص ۵۔

۳۹ تلامذۂ غالب، مالک رام طبع ۱۹۸۴ء ص ص ۱۴۷ تا ۱۴۸، یادگار حالی، صالحہ عابد حسین ص ص
۱۶۵ تا ۱۶۷، حیات جاوید، مولانا حالیؔ ص ص ۱۵۴ تا ۱۵۴

۴۰ حالی کی اردو نثر نگاری، ڈاکٹر عبد القیوم ص ۵۶۵

۴۱ یادگارِ حالی ؛ صالحہ عابد حسین ص ۴۳

۴۲ ایضاً ص ۴۳

۴۳ دی اسپرٹ اینڈ سبسٹنس آف اردو پروز انڈر دی انفلوئینس آف سر سید احمد خاں؛ ڈاکٹر سید محمد عبداللہ۔ رپن پرنٹنگ پریس لاہور طبع اول مطبوعہ ۱۹۴۰ء، حالی کی اردو نثر نگاری؛ ڈاکٹر عبدالقیوم، حالی بحیثیت شاعر؛ ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی۔ لکھنؤ طبع اپریل ۱۹۷۱ء طبع ثانی)

۴۴ تلامذۂ غالب ص ص ۴۴ تا ۵۱، مقالہ کاظم علی خاں "خسرو شناسی اور علی گڑھ" صرف ایک غیر مطبوعہ کتاب امیر خسرو اور علی گڑھ ؛ محی الدین اظہر۔ نسرین پبلشنگ ہاؤس علی گڑھ طبع ۱۹۸۱ء ص ۱۴۴

۴۵ تلامذۂ غالب ص ۱۲۱، تفتہ اور غالب ؛ ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری۔ غالب اکیڈمی نئی دہلی۔ طبع دسمبر ۱۹۸۴ء ص ص ۱۶۷ تا ۱۶۸

(۴۶) رسالہ فکر و نظر علی گڑھ۔ سر سید نمبر (اکتوبر ۱۹۹۲ء) ص ۱۰۹

۴۷ تلامذۂ غالب ص ص ۱۱۶ تا ۱۲۲، غالب اور تفتہ (مختلف صفحات)، بزم غالب ص ص ۱۴۴ تا ۱۴۶ خطوط غالب کا تحقیقی مطالعہ ص ۸، مقالہ کاظم علی خاں، بہ عنوان "تفتہ تلمیذ غالب۔ ایک تعارف" (تاریخ تکمیل ۹ اگست ۱۹۷۹ء ہنوز غیر مطبوعہ)

۴۸ تلامذۂ غالب ص ص ۱۵۹ تا ۱۶۲، بزم غالب ص ص ۱۴۴ تا ۱۴۷، نادرات غالب ؛ آفاق حسین آفاق (حصہ اول)، ص ص ۱ تا ۴۴، خطوط غالب کا تحقیقی مطالعہ ص ۸ نیز ص ص ۵۰ تا ۴۹

۴۹ تلامذۂ غالب ص ص ۳۰۴ تا ۳۰۷، بزم غالب ص ص ۲۱۸ تا ۲۲۱

۵۰ تلامذۂ غالب ص ص ۸۸ تا ۹۰

۵۱ خمخانۂ بے خبر ؛ خواجہ غلام غوث بے خبر۔ نامور پریس الہ آباد مطبوعہ ۱۸۹۱ء/۱۳۰۹ھ ص ص ۱۴۱ تا ۱۴۳

۵۲ سیلیکٹیڈ ڈاکیومنٹس فرام دی علی گڑھ آرکائیوز" ص ۸۹، (مکتوب سید مہدی حسن بنام سید احمد خاں مورخہ ۳ اکتوبر ۱۸۸۳ء)

۵۳ حالی کی اردو نثر نگاری ص ۱۴۵ (مع حاشیہ)، نیز ص ص ۱۹۸ تا ۲۰۰

۵۴ اردوئے معلی (حصہ دوم)؛ غالب۔ مطبع مجتبائی دہلی۔ طبع اول مطبوعہ اپریل ۱۸۹۹ء ص ۱۱ نیز ٹائیٹل صفحہ آخر) خطوط غالب کا تحقیقی مطالعہ ص ۵۳ (مع حاشیہ ۱۵ بر صفحہ ۵۹)

۵۵ ان امور کی تفصیل ہمارے مقالے "غالب شناسی اور مولانا حسرت موہانی" میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے جو ہماری کتاب مقالات و نثریات۔ نظامی پریس لکھنؤ۔ طبع ۱۹۹۳ء ص ص ۲۲۱ تا ۲۳۲) میں بھی شامل ہے۔ کاظم علی خاں (نینی تال مورخہ ۵ رمئی ۱۹۹۳ء)

۵۶ غالب: غلام رسول مہر۔ لاہور پریس دہلی (سنہ اشاعت ندارد) ص ۱۰

۵۷ رسالہ معاصر پٹنہ (قاضی عبدالودود نمبر) اگست ۱۹۷۶ء ص ص ۱۷ تا ۱۸

۵۸ تفصیلات کے لیے دیکھیے مقالہ "غالب اور قاضی عبدالودود" از پروفیسر مختارالدین احمد (غالب نامہ دہلی جنوری ۱۹۹۵ء)، تعین و تقدیر: ڈاکٹر حمیرا خاتون۔ لکشمی پریس نئی دہلی۔ طبع ۱۹۸۰ء ص ص ۲ تا ۳۶۔

۵۹ فکر و نظر علی گڑھ (ناموران علی گڑھ تیسرا کارواں جلد اول۔ جنوری ۱۹۸۷ء تا جولائی ۱۹۸۸ء) ص ص ۹۵ تا ۱۰۰ (مقالہ پروفیسر خورشید الاسلام)، ہماری زبان نئی دہلی مورخہ ۱۵ اپریل ۱۹۹۳ء ص ۱ (مقالہ پروفیسر اکبر حیدری کشمیری)

۶۰ رسالہ فکر و نظر علی گڑھ۔ جنوری ۱۹۸۷ء تا جولائی ۱۹۸۸ء ص ۲۲۰ نیز ص ص ۲۲۶ تا ۲۲۸ (مقالہ ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری) غالب ببلیوگرافی: مرتبہ محمد انصار اللہ (حصہ ۲)، ص ۲۲

۶۱ غالب ببلیوگرافی (پہلا حصہ) ص ۳۴

۶۲ ایضاً (حصہ ۲) ص ۳۴

۶۳ ایضاً (حصہ ۳) ص ۱۳ نیز ص ۱۵

۶۴ بہ حوالہ مقالات قاضی عبدالودود (جلد ۱) مرتبہ کلیم الدین احمد۔ بہار اردو اکادمی پٹنہ طبع ۱۹۷۷ء ص ۶

۶۵ بہ حوالہ احوال غالب طبع ۲ ۱۹۸۶ء ص ص ۳ تا ۴ مقدمہ مرتب پروفیسر مختارالدین احمد

۶۶ ایضاً مقدمہ مرتب

۶۷ ایضاً مقدمہ مرتب

۶۸ ایضاً مقدمہ مرتب

۶۹ تفصیل کے لیے دیکھیے کتاب تعین و تقدیر ص ص ۳۳ تا ۳۴

۷۰ علی گڑھ میگزین (غالب نمبر) ۱۹۶۹ء ص ص ۳۵ تا ۴۸

اب ان خطوط کے سلسلے میں بعض معروضات :

رشید صاحب بعض مرتبہ اپنے خطوط پر تاریخ اور مہینہ تو درج کردیا کرتے تھے لیکن سال تحریر نہیں لکھتے تھے۔ ان تیرہ خطوط میں صرف آخری چار خطوں پر رشید صاحب نے تاریخ تحریر بقید ماہ و سال لکھی ہے، بقیہ خطوط پر صرف تاریخ اور مہینہ لکھا ہے، سال درج نہیں۔

عابد صاحب نے خط مورخہ ۱۰ر اگست کے فٹ نوٹ میں "۱۱ر اگست ۱۹۳۸ء (مہر پڑی)" لکھا ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ خط پر سالِ تحریر درج نہیں لیکن علی گڑھ کے ڈاک گھر کی مہر ۱۱ر اگست ۱۹۳۸ء کی ہے۔ رشید صاحب نے خط ۱۰ر اگست کو لکھا ہوگا اور ۱۱ر کو ڈاک گھر بھجوایا ہوگا۔

ایک خط انگریزی میں تاریخ ۶/۷ دی ہوئی ہے، عابد صاحب نے خط کے آخر میں ۷ر جون ۱۹۴۶ء لکھا ہے پھر اسے قلمزد کردیا ہے، یہ خط ۱۹۴۶ء کا نہیں ہوگا اس لیے کہ اس میں چیک پر سید بشیر حسین زیدی صاحب کے دستخط کا ذکر ہے۔ یہ چیک غالباً کسی امتحان کے معاوضے کے سلسلے کا ہے اس لیے اس زمانے کا ہونا چاہیے جب زیدی صاحب علی گڑھ کے وائس چانسلر تھے۔ یہ خط جون ۱۹۵۷ء کا ہوگا۔

اس خط میں جس میں رسالہ "جوہر" کے جوبلی نمبر کا ذکر ہے، عابد صاحب نے تاریخ ۳۰ر مئی ۱۹۴۸ء لکھی ہے پھر قلمزد کرکے ۱۹۴۶ء کردیا ہے پھر اسے بھی مسترد کرکے خط کے آخر میں رشید صاحب کے دستخط کے بعد تاریخ ۲ر جون ۱۹۴۶ء لکھی ہے۔ یہ خط جامعہ ملیہ کے جشن جوبلی کے انعقاد سے پہلے کا لکھا ہوا ہونا چاہیے۔

جس خط میں عابد صاحب کے آپریشن کا ذکر ہے اس پر تاریخ تحریر ۱۲ر جولائی درج ہے، عابد صاحب نے فٹ نوٹ میں ۱۹۴۹ء لکھ دیا ہے۔

۲۶ر جولائی کے خط پر بھی ۱۹۴۹ء کا اضافہ انھی کے قلم سے ہے۔

۳۰ر مارچ کے خط پر عابد صاحب نے سال کا اندراج نہیں کیا، ان کی توجہ اس طرف نہیں گئی کہ یہ بظاہر اس زمانے کا خط ہے جب ذاکر صاحب علیل ہوکر آرام کے لیے رام پور میں مقیم تھے پھر اس میں افضل العلماء ڈاکٹر عبدالحق کی رحلت کا ذکر ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی تاریخ وفات ۱۵ر مارچ ۱۹۵۸ء ہے۔ رشید صاحب کے خط کی تاریخ تحریر ۳۰ر مارچ ۱۹۵۸ء ہونی چاہیے۔

۱۵؍ جون اور ۱۷؍ جون کے خطوں پر نہ رشید صاحب نے سال تحریر درج کیا ہے اور نہ عابد صاحب نے سال متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان دونوں خطوں میں ذاکر صاحب پر مضامین نظم و نثر لکھنے کی تجویز ملتی ہے۔ پہلے خط میں یہ مضامین جوبلی کے موقع پر پیش کرنے کا خیال ظاہر کیا گیا ہے۔ جوبلی سے مراد جامعہ ملیہ کا جشن سیمیں ہے جو ۱۹۴۶ء میں منعقد ہوا۔ یہ دونوں خط ۱۹۴۶ء کے لکھے ہوئے ہوں گے۔

رشید صاحب کے ان خطوط کی نقل ڈاکٹر صغرا مہدی (عابد ولا، جامعہ نگر، دہلی) کی مہربانی سے کوئی تین سال پہلے ملی تھی، خیال تھا کہ عابد صاحب کے نام ان کے کچھ اور خطوط مل جائیں گے لیکن اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ میں ڈاکٹر صاحبہ کی اس عنایت کے لیے ان کا شکر گزار ہوں۔

اب خطوط ملاحظہ فرمائیے :

(۱)

یونیورسٹی علی گڑھ

۱۰؍ اگست (۱۹۳۸) [۱]

عابد صاحب محترم

گرامی نامہ مورخہ پانچ اگست۔ لکچرر والی جگہ تمام تر پروفیسر حبیب صاحب کی مرضی و منشا پر منحصر ہے۔ کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ پروفیسر حبیب اس بارے میں موصوف سے سلسلہ جنبانی فرمائیں۔ جامعۂ اردو آگرہ کا سلیبس وغیرہ عنقریب بھیجوں گا اس کے کرتا دھرتا عید ..... [۲] وطن گئے، آتے ہی ہوں گے۔ اس وقت تعمیل ارشاد کی جائے گی۔ مطمئن رہیے۔ ذاکر صاحب آگئے ہوں تو میری طرف سے تہنیت پیش کر دیجیے [۳] بقول شخصے، آید ہی [۴] ہیں اور حکیم [۵] صاحب ۱۲؍ کو دلی آئیں گے

---

[۱] ڈاک گھر کی مہر سے عابد صاحب نے سالِ تحریر کا اندراج کیا ہے۔

[۲] "عید میں وطن گئے" یا "عید کرنے وطن گئے" یا اسی طرح کا کوئی فقرہ ہوگا۔ جامعہ کے کرتا دھرتا سید ظہیرالدین علوی (متوفی ۱۹۷۳ء) تھے جو بعد کو رجسٹرار جامعۂ اردو ہوئے۔

[۳] ۱۹۳۸ء میں ذاکر صاحب کو کس بات کی تہنیت دی جا رہی ہے معلوم نہ ہو سکا۔

[۴] عابد صاحب نے نقطوں کی جگہ "یا دِ یار مہرباں" لکھ کر مصرع مکمل کر دیا ہے۔ اور غالباً کاتب کے لیے ہدایت لکھ دی ہے، "اگر نقطے ہوں تو مصرع لکھ دینا چاہیے"۔

[۵] شفاء الملک حکیم عبداللطیف سابق پرنسپل طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

اور ۱۴ کی رات کو واپس ہوں گے۔ ہو سکا تو حاضر ہونے کی کوشش کروں گا۔

آپ کا

رشید احمد صدیقی

(۲)

۴ جون ۱۹۶۳ء[1]

عابد صاحب محترم ۔ آداب

گرامی نامہ موصول ہوا اور رجسٹرار آفس کو ہدایت کر دی گئی کہ وہ ایم۔ اے فائنل کے مقالات آپ کے پاس بھیج دے۔ آپ دیکھ لیں گے تو میں دیکھوں گا۔ ذرا جلد دیکھ ڈالیے تاکہ مہلت و میعاد کے اندر ہی ہم اور آپ نمبروں کے بارے میں ضروری کارروائی کر لیں۔

محمد عرفان نوری[2] مدیر "جوہر" جوبلی نمبر کی ایک یاددہانی مجھے کل موصول ہوئی۔ ذاکر صاحب نمبر کا مضمون آپ کے پاس بھیجتا ہوں تاکہ اسے آپ دیکھ لیں اور اپنا اطمینان کر لیں کہ کوئی بات بے تکی تو نہیں ہے اور جامعہ کے مفاد کے خلاف تو نہ پڑے گی۔ ایک جگہ (ص ۷) کی پہلی سطر ہی ایسی ہے جو تحقیق طلب ہے۔ آپ کوشش یہ سال کا تعین کرنے میں آسانی ہو یہ واقعہ میں نے ذاکر صاحب کی زبان سے سنا تھا، صرف تعداد سال میں شبہ ہے۔ آپ اس مضمون کو دیکھ کر "جوہر" کے مدیر صاحب کے پاس بھیج دیجیے۔ میں نے ان کو اطلاع دے دی ہے کہ مضمون آپ کے پاس ہے۔ ابھی اس مضمون کو مکمل نہ سمجھیے کم و بیش چھ سات صفحے اور لکھوں گا۔ لکھنا شروع کر دیا ہے۔ مضمون کا عنوان آپ اپنے قلم سے لکھ دیجیے گا۔ عنوان صرف "ذاکر صاحب" رکھیے تو اچھا ہوگا۔ سرور صاحب حال میں آئے تھے۔ میں نے ان سے اپنا یہ خیال ظاہر کیا کہ یہ مضمون "جوہر" کو بھیج دیا جائے اور وہیں شائع ہو لیکن میں خود یہ چاہتا ہوں کہ ذاکر صاحب کی تصویر کے ساتھ اس کو ایک خوب صورت سے رسالہ کی شکل میں

---

[1] مسودے میں ۳۰ مئی ۱۹۶۳ء لکھا ہوا تھا اسے قلم زد کر کے ۱۹۶۳ء بنایا گیا ہے۔ خط کے آخر میں عابد صاحب نے تاریخ تحریر ۲ جون ۱۹۶۳ء لکھی ہے۔

[2] جامعہ لائبریری کے کارکن، جامعہ کے استاد رہ چکے ہیں (عابد حسین)

اپنے صرفے سے چھپواکر جوبلی کے موقع پر اپنے ہدیۂ مختصر کے طور پر پیش کروں گا۔ جامعہ کے لیے مجھ سے یہی ہو سکا۔ اسی طور پر میری خواہش یہ تھی کہ ذاکر صاحب کے دوستوں میں سے جس کسی کو توفیق ہو وہ ذاکر صاحب یا جامعہ پر کچھ نہ کچھ کہے یا لکھے اور اسے موزوں شکل میں جوبلی کے موقع پر پیش کرے۔ سرور صاحب نے اس تجویز کو پسند کیا تھا مگر مجھے اندیشہ ہے کہ شاید میری اس تجویز پر سبھی عمل کریں الا ماشاءاللہ!

آپ کے جواب کا منتظر تو نہیں مشتاق ضرور ہوں گا۔

آپ کا

رشید احمد صدیقی

(۳)

یونیورسٹی علی گڑھ

۱۵؍جون، شنبہ (۱۹۴۶ء)

ڈاکٹر صاحب مکرم

گرامی نامہ موصول ہوا۔ جی نہیں میرا مقصد یہ تھا کہ ہر شخص ذاکر صاحب پر کچھ لکھ کر رسالہ کی شکل میں خود چھپوائے یہ تو صرف میں اپنے مضمون کے لیے چاہتا تھا۔ میرا مقصد یہ تھا کہ وہ لوگ جو ڈاکٹر صاحب سے عقیدت رکھتے ہیں اگر ان کو نظم یا نثر پر قدرت ہو تو اپنے جذبات کا اظہار اپنے طور پر (یعنی نظم و نثر کی کسی صنف میں) کریں اور ہو سکے تو اپنے خرچ سے چھپوا کر جوبلی کے موقع پر پیش کریں لیکن اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے ایسی تمام چیزیں یکجا طور پر "جوہر"[1] یا کسی اور مجموعہ میں شائع کی جائیں تا کہ متفرق اور منتشر نہ ہو جائیں مثلاً میں، آپ، سرور صاحب، سیدین صاحب، پروفیسر مجیب وغیرہ اس تحریک میں حصہ لیں اور ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب اس پر دیباچہ لکھ دیں[2]!

---

[1] جامعہ کا رسالہ جو قلمی لکھا جاتا تھا اور سال دو سال میں اس کا کوئی خاص نمبر بھی شائع ہوتا تھا۔ عبداللطیف اعظمی صاحب کا مرتب کردہ "عبدالحق نمبر" خاصا مشہور ہوا۔

[2] ذاکر صاحب پر مضامین ہوں اور دیباچہ ڈاکٹر ضیاء الدین لکھیں، یہ "مزاح المومنین" تو نہیں؟

ایم۔اے کے مقالات کے بارے[1] میں اس سے پہلے عرض کر چکا ہوں کہ نمبروں کی کچی نقل میرے پاس بھجوا دیجیے۔ میں اپنے نمبر آپ کے پاس بھجوا دوں گا۔ آپ دونوں پرنظر کر کے مارکس شیٹ پر نقل کر کے اور دستخط کر کے میرے پاس بھیج دیجیے گا میں دستخط کر کے ٹیبولیٹرس کے ہاں بھیج دوں گا یا جو ترکیب آپ مناسب سمجھیں لیکن کیجیے جلدی۔

آپ کا

رشید

ذاکر صاحب کی علالت کے بارے میں مفصل تحریر میں نے ذاکر صاحب کو لکھ بھیجی ہے سیدین صاحب کی خدمت میں سلام شوق۔ ساجد صاحب[2] کی خدمت میں آداب۔

(۴)

یونیورسٹی علی گڑھ

۷ دسمبر[3]

عابد صاحب محترم آداب

ذاکر صاحب کی معرفت میں نے اپنے ہاں کے ایک صاحب کا اردو پی ایچ ڈی کا مقالہ بھیج دیا تھا۔ ہر طرح کا اہتمام کر دیا تھا کہ وہ جلد سے جلد آپ تک پہونچ جائے لیکن اس کے بعد سے کوئی اطلاع نہ ملی کہ وہ پہنچا بھی یا نہیں۔

بات دراصل یہ ہے کہ اس مقالہ کی جلدی ہے۔ جنوری کے وسط یا اس کے بعد ہی شاید کانووکیشن ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ اس سے پہلے ہی نتیجہ نکل آئے۔ متحن کے یہاں سے نتیجہ آجانے کے بعد بھی بڑے طویل طویل مراحل طے کرنے پڑتے ہیں۔ کمیٹی، کونسل، وغیرہ مقالے کا صرف ایک نسخہ ہے۔ آپ دیکھ لیں گے تو اسے دوسرے متحن کے

---

[1] نقل نویس نے "مقالات کے بارہ میں" لکھا تھا، عابد صاحب نے اپنے قلم سے "بارے" کر دیا ہے۔
[2] نواب ساجد علی خاں رامپوری، بعد کو انھوں نے ڈیوٹی ہوسٹل کے سامنے اپنی کوٹھی تعمیر کرائی تھی اور وہ علی گڑھ منتقل ہو گئے تھے۔
[3] خط کا زمانہ تحریر میں متعین نہیں کر سکا۔ تقسیم ہند سے پہلے کا لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

پاس بھیجا جانے کا معلوم نہیں وہ کتنی دیر لگائیں۔ آپ پر زور چلتا ہے اس لیے اصرار بھی کرسکتا ہوں کہ اور کاموں کا تھوڑا سا ہرج کرکے اسے نپٹا دیجیے۔ دوسرے سے تو یہ نہ کرسکوں گا میں سمجھتا ہوں کہ آپ میرے لیے اتنی تکلیف گوارا فرمائیں گے۔ اور دو حرف لکھ کر بھیج دیجیے کہ مقالہ اور یہ میری گزارش آپ تک پہنچ گئی۔

آپ کا

رشید احمد صدیقی

(۵)

یونیورسٹی علی گڑھ

۱۲، جولائی (۱۹۳۹ء)[1]

عابد صاحب مکرمی آداب

بیگم صاحبہ کے نوازش نامے سے یہ معلوم کرکے بڑا اطمینان ہوا اور خوشی کہ آپریشن بفضلہ کامیاب ہوا۔ یہ موقع خاصا تردد کا ہوتا ہے۔ خواہ آپریشن اپنا ہو یا اپنے عزیز یا دوست کا۔ اللہ تعالیٰ فضل فرمائے اور آپ صحت یاب ہو کر خوشی اور اطمینان سے دوستوں اور عزیزوں میں آملیں، آمین

بیگم صاحبہ کی خدمت میں آداب

آپ کا

رشید احمد صدیقی

(۶)

یونیورسٹی علی گڑھ

۲۶، جولائی (۱۹۳۹ء)[2]

عابد صاحب عید مبارک ہو اور صحت یابی بھی

---

[1] رشید صاحب نے تاریخ اور مہینہ لکھا ہے۔ عابد صاحب نے فٹ نوٹ میں ۱۹۳۹ء لکھ دیا ہے۔
[2] سال ۱۹۳۹ء کا اضافہ عابد صاحب نے کیا ہے۔

آپ نے اپنی صحت یابی کی اطلاع بڑے مزے کی اور بڑے مزے میں دی۔ مزا آگیا۔ یعنی گویا کہ معنی مامعنی۔

۳۰ کو میری ایک ریڈیو کی تقریر دلّی سے ہے۔ ہو سکا تو اسے "نئی روشنی"[۱] کے لیے بھیج دوں گا۔ ہم سب بخیریت ہیں اور آپ کی صحت یابی پر خوش اور تہنیت گزار۔ بیگم صاحبہ اور بیگم زیدی صاحبہ کی خدمت میں آداب۔

آپ کا

رشید احمد صدیقی

(۷)

یونیورسٹی علی گڑھ

۱۷ر جون (۱۹۵۶ء)

ڈاکٹر صاحب

گرامی نامہ رجسٹری شدہ موصول ہوا۔ اور آج ہی میں نے ساری خانہ پُری کرکے مارکس ٹیبولیٹرس کو دے دیے۔ چیز بروقت پہنچی شکریہ۔ میں نے آپ کے ہر زیادہ سے زیادہ ۵ اور کم سے کم ۲-۳ کا جہاں تہاں اضافہ کر دیا ہے۔ امید ہے آپ کو قابلِ قبول ہوگا۔

ذاکر صاحب پر مضمون لکھنے والے چند ہی لوگ تو ہیں۔ میں لکھ چکا ہوں۔ اب رہ جاتے ہیں سیدین صاحب/ اسود صاحب/ آپ/ مجیبی صاحب[۲]، نذیر نیازی، حارث[۳] یا کچھ اور

---

[۱] یہ ہفتہ وار اخبار ڈاکٹر عابد حسین صاحب جامعہ نگر دہلی سے شائع کرتے تھے۔ عبداللطیف اعظمی صاحب اس کے نائب مدیر تھے۔ یہ شعلۂ مستعجل ثابت ہوا۔ اس کا پہلا شمارہ ۱۵ر جون ۱۹۴۸ء کو نکلا تھا اور آخری شمارہ اگست ۱۹۵۰ء میں شائع ہوا۔

[۲] اس نام پر عابد صاحب نے سرخ لکیر کھینچ کر سوالیہ نشان بنا دیا ہے۔ پروفیسر محمد مجیب (جامعہ ملیہ) مراد ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے قریبی لوگوں میں فرخ آباد کے حفیظ الرحمٰن خاں مجیبی صاحب ایک اخبار نویس تھے جن کا جامعہ اور ذاکر صاحب سے تعلق رہا ہے۔ یہ شاعر بھی تھے۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی پرو وائس چانسلرشپ کے زمانے میں یہ بہت دن تک علی گڑھ رہے۔ یاد آرہا ہے کہ مسلم یونیورسٹی گزٹ کے اڈیٹر بھی رہے۔ لیکن غالباً وہ مراد نہیں۔

[۳] معین الدین حارث جامعہ ملیہ کے تعلیم یافتہ، ذاکر صاحب کے شاگرد اور اردو کے مشہور اخبار نویس۔

لوگ، جن کو آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں، یہ تو محض محبت اور عقیدت کا نذرانہ ہوگا ـــــ
چھوٹی موٹی نظم بھی موزوں ہوگی۔ اگر کوئی آرٹسٹ ہو تو ایک آدھ تصویر بھی۔
کوئی چھوٹا بچہ ہو۔ یہ اس لیے کہ ذاکر صاحب نے شاید اپنی بعض تحریر
اس کے نام معنون کی ہے، یا کہیں سنگِ بنیاد کسی چھوٹے بچے کے ہاتھ سے
رکھایا ہے۔ آپ ایک گشتی مراسلہ اپنے نام سے کیوں نہیں سب کے پاس بھیج
دیتے۔ اچھے خاصے پیامات گاندھی جی، مولانا ابوالکلام، سروجنی نائڈو، جواہرلال،
راجندر بابو، امرت کور، سارجنٹ، سر سپرو وغیرہ سے حاصل ہو جائیں گے۔

آپ کا

رشید احمد صدیقی

عابد صاحب، میرے مطبوعہ خط کو نہ بھولیے گا جب اور جتنی فرصت ملے اور جو
کو ہو سکے کر دیجیے گا۔ ذاکر صاحب آپ، سیدین صاحب اور مجیب صاحب[1]
سے خاص طور پر امید ہے، آپ مدد نہ کریں گے تو کون کرے گا۔

(۸)

علی گڑھ

۷، جون (۱۹۵۷ء)[2]

ڈاکٹر صاحب مکرم

[1] نقل نویس نے مجیبی لکھ کر اسے مجیب بنایا ہے یا مجیب لکھ کر مجیبی کر دیا ہے۔ اس نام کے نیچے بھی عابد صاحب نے سرخ لکیر کھینچ دی ہے۔ حیرت ہے کہ عابد صاحب کا خیال پروفیسر محمد مجیب کی طرف کیوں نہیں گیا۔

[2] عابد صاحب کے مسودے میں آخر میں نام کے بعد ۷، جون ۱۹۴۶ لکھا ہوا ہے۔

دکھایا۔ ان کی ماننے ہے کہ بشیر حسین زیدی صاحب کے دستخط میں یہ نقص ہے کہ انھوں نے دوسرے دستخط پر ریوانی مہر نہیں لگائی۔ بہرحال چیف اکاؤنٹنٹ کا یہ کہنا ہے کہ اگر چک کے چہرے میں کوئی نقص ہو تو وہ درست کریں گے لیکن اگر اس کی پشت پر کوئی نقص ہو تو وہ آپ درست کریں گے۔ بہرحال میرا تو وہی حال ہے کہ چاندنی چوک کے کلاک ٹاور کے نیچے دو شرابی لڑ رہے تھے، جب فارغ ہوئے تو ایک سکھ کو کھڑا پایا۔ ایک نے کہا سردار جی کے بجے ہوں گے، سردار جی نے کلاک ٹاور کی طرف دیکھا اور بولے   بھائی ہم پردیسی ہیں۔ ہم کیا جانیں !!

آپ کا

رشید احمد صدیقی

(۹)

یونیورسٹی علی گڑھ

۲۰ مارچ (۱۹۵۸ء)

عابد صاحب محترم، آداب

ڈاکٹر عبدالحق[1] کی رحلت پر آپ کا قطعۂ تاریخ وفات ڈپارٹمنٹ میں ملا۔ جہاں اس

---

[1] افضل العلماء ڈاکٹر عبدالحق، ممبر پبلک سروس کمیشن مدراس، جو کئی ماہ ذاکر صاحب کے زمانے میں مسلم یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر رہے۔ رشید صاحب نے ان کی وفات (۱۵ مارچ ۱۹۵۸ء) پر بہت اچھا مضمون لکھا ہے جو رسالہ "فکر و نظر" میں چھپا تھا بعد کو ۱۹۶۲ء میں ان کے مجموعۂ مضامین "ہم نفسانِ رفتہ" میں شائع ہوا۔

وقت بھی موجود تھے۔ سرور صاحب، مسعود صاحب، ڈاکٹر عزیز[1]، ڈاکٹر نذیر[2] وغیرہ سب نے پڑھا اور سب نے ساختہ تعریف کی اور کہا کہ جو کچھ بیان کیا گیا تھا وہ صداقت پر مبنی تھا۔ نہ صرف یہ کہ مرحوم کے بارے میں جو کچھ کہا گیا تھا وہ حرف بحرف صحیح تھا بلکہ بات جتنی اور جس طرح کہی گئی تھی وہ معنف کا (آپ کا) اپنا مخصوص انداز تھا۔ مصرع تاریخ تو لاجواب ہے۔ اس طرح کی تاریخ (مرحوم کے بارے میں) شاید ہی کوئی اور کہہ پائے۔ اس طرح کی تاریخ کو میں "فال نیک" یا "بشارت الٰہی" سمجھتا ہوں۔ خدا کبھی کبھی تو ضرور شاعر کی زبان میں کچھ کہتا ہوگا!!

سرور صاحب نے بے اختیار ہوکر اسے "ہماری زبان" کے لیے مانگ لیا اور میں بھی شاید بے اختیار ہی رہا ہوں گا کہ ان کے حوالے کر دیا[3]۔

میرا ایک قیاس ہے کہ جب کسی میں والدین کی شباہت آنے لگے تو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ بوڑھا ہونے لگا۔ آپ کے والد مغفور[4] کو میں نے نہیں دیکھا لیکن مرحوم کے ملکۂ تاریخ گوئی کی شہرت سُن چکا ہوں۔ یہ ملکہ آپ میں ظہور پانے لگا ہے تو آپ کے بڑھاپے کے بارے میں کیا رائے قائم کروں!

آپ کا

رشید احمد صدیقی

---

[1] ڈاکٹر شاہ محمد عزیر صاحب، ریڈر شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے متقاعد ہونے کے بعد کراچی چلے گئے تھے، وہیں کچھ دن پہلے ان کا انتقال ہوا۔

[2] ڈاکٹر نذیر احمد سابق صدر شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی۔

[3] عابد صاحب کا کہا ہوا یہ قطعہ تاریخ وفات فی الحال نہیں مل سکا۔ "ہماری زبان" کے ۲۰ مارچ ۱۹۵۸ء کے بعد کے کسی شمارے میں یہ قطعہ ممکن ہے شائع ہوا ہو۔ مالک رام صاحب نے ان کے لکھے ہوئے پانچ قطعات نذر عابد (دہلی ۱۹۷۴ء) میں شائع کیے ہیں۔

[4] سید حامد حسین جو شعر گوئی سے دلچسپی رکھتے تھے اور تاریخ گوئی میں مہارت۔

(۱۰)

ذکاءاللہ روڈ
یونیورسٹی علی گڑھ
۱۳؍اکتوبر ۱۹۵۹ء

عابد صاحب محترم تسلیم

آپریشن کی کامیابی کی تفصیلی خبر سعود صاحب نے دی جو وائس چانسلر[۱] صاحب کے یہاں ٹیلی فون پر موصول ہوئی تھی۔ یہ خبر اتنی اچھی تھی کہ ایسا محسوس ہوا جیسے آپ آپریشن میں نہیں مبتلا تھے بلکہ علی گڑھ میں ہم سب کے ساتھ جنس بول رہے تھے۔ دعا ہے کہ آپ کے سوچنے ہی نہیں آپ کے دوستوں کی بھی توقع سے کم مدت میں آپ صحت یاب ہوکر ہم میں آملیں۔

اس دعا کے مقبول ہونے پر یوں شبہ نہیں رہتا کہ مجھ سے بہتر لوگ بھی یہی دعا مانگ رہے ہیں۔ جواب دینے یا لکھانے کی آپ بالکل فکر نہ کریں۔ آپ کی صحت کی بولیٹن شائع ہوتی رہتی ہے۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوسکتا ہے کہ دعاؤں کے مقبول ہونے کی رفتار کتنی امید افزا ہے۔ بیگم صاحبہ کی خدمت میں آداب۔

دعاگو
رشید احمد صدیقی

(۱۱)

ذکاءاللہ روڈ یونیورسٹی علی گڑھ
۱۷؍اکتوبر ۱۹۵۹ء

عابد صاحب محترم تسلیم

کارڈ ملا۔ اس سے ذرا پہلے سرور صاحب کو لکھ چکا تھا کہ اگر وائس چانسلر صاحب کے یہاں ٹیلی فون سے آپ کی صحت سے متعلق کوئی خبر آئی ہو تو مطلع فرمائیں۔ ورنہ دہلی جائیں اور آپ سے ملاقات کرسکیں تو میرا سلام پہنچائیں۔ آپ کے خط سے معلوم ہوا کہ آپ بیگم صاحبہ

---

[۱] اس وقت سید بشیر حسین زیدی صاحب مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔

اور ڈاکٹر سین تینوں صحت کی رفتار سے خوش اور مطمئن ہیں۔ اور کیا چاہیے اتنا بڑا امر حل انشاءاللہ اتنا جلد اور آسان گزرے گا کہ کچھ دن گزرے پر آپ ایسا محسوس کریں گے جیسے یہ اتنا آپریشن نہ تھا جتنی پکنک غرض چاہ اور بحث سے ذرا قطع نظر کرکے! آپ نے خط لکھا نہیں لکھوایا ہے۔ پھر بھی اس مختصر سے کارڈ میں آپ نے آپریشن کو جتنے سخت الفاظ میں یاد کیا ہے وہ زور بیان شاید آپ کے پچھلے کئی پورے مضمون میں نہ ملے۔ بڑا لطف آیا۔ اپنے انداز میں ایک آپریشن آشوب کیوں نہ لیٹے لیٹے لکھوائیے۔ شیخ سعدی سفر سے واپس آئے تو دوستوں کے لیے گلستاں بوستاں لکھ لائے تھے۔ آپ آپریشن سے فارغ ہوکر واپس آئیں تو ہم سب کے لیے یہ اسپتال آشوب کیوں نہ لائیں۔ گورنر کانفرنس میں ذاکر صاحب آخر ماہ میں دہلی پہنچیں گے۔ ان کی ملاقات اور فرمودات سے آپ کو بڑی تفریح ہوگی اور صحت کی رفتار اور توانائی میں اضافہ ہوگا۔ تیمارداروں کی آمدورفت اور ان کی فلاطون مآبی سے جو مرض اور آپریشن سے متعلق ہوگی آپ کیا کچھ منتفعن یا محظوظ نہ ہوتے ہوں گے۔ لیکن عابد صاحب عبادت کی طرح عیادت کا مزا بھی جوانی میں ہی لے رہے ہیں۔ لے جوانی میں عبادت کے تو نہیں عیادت کے مزے اٹھائے ہیں۔ خدا کرے موجودہ عمر میں آپ کو دونوں کا لطف میسر آئے۔ گو اس طرح کی دعا مانگنے میں خدا کی ذمہ داری بڑھ جانے سے پہلے مجھے بیگم صاحبہ کا استمزاج کر لینا چاہیے تھا۔ بیگم صاحبہ اور سیدین صاحب کی خدمت میں آداب بشرطیکہ مؤخر الذکر کہیں مبتلائے پرواز نہ ہوں۔ سب سے خوب صورت نرس اور سب سے خدمت گزار ڈاکٹر کو مادجب۔

آپ کا

رشید احمد صدیقی

(۱۲)

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

۲۴ فروری ۱۹۶۴ء

ڈاکٹر صاحب مکرم تسلیم

کمال[1] نے بات بتایا کہ ریڈیو پر اطلاع ملی ہے کہ حسین صاحب کو آکادمی میں چراغ[2] پر اکیڈمی کا انعام ملا ہے۔ خدا مبارک فرمائے آمین۔ بڑی خوشی ہوئی۔ موصوف کو خط لکھیے تو میری طرف سے مبارک باد بھی دیجیے گا۔ مجھے پتہ نہیں معلوم ورنہ براہِ راست لکھتا۔ لیکن کوئی حرج نہیں۔ مقصود تو جلد سے جلد تہنیت پہنچانی ہے۔

نیازمند

رشید احمد صدیقی

(۱۳)

ذاکر باغ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

۱۱ر مئی ۱۹۷۲ء[2]

ڈاکٹر صاحب مکرم و محترم   سلام شوق

"تحریر"[3] کے حالیہ شمارہ "رشید نمبر" میں آپ کا مضمون (میرے بارے میں) نظر سے گزرا۔ بیش از بیش خوشی اور شکر گزاری کے ساتھ ساتھ کچھ ایسی یادیں تازہ ہو گئیں (۵۰-۶۰ سال کی مدت کم نہیں ہوتی) جو کئی گنی راحت افزا تھیں لیکن آج کیسی حزیں محسوس ہوتی ہیں۔ کیا کیجیے کہ ؎

تھیں وہ اک شخص کے تصور سے

---

[1] رشید احمد صدیقی کے بھانجے ڈاکٹر کمال احمد صدیقی سابق ریڈر شعبۂ تعلیمات مسلم یونیورسٹی۔

[2] اس خط کے لکھنے کی تاریخ ممکن ہے درست ہو لیکن سال ۱۹۷۲ء کسی طرح صحیح نہیں۔ "تحریر" کا "رشید نمبر" ۱۹۷۵ء کے اواخر یا ۱۹۷۶ء کے اوائل میں شائع ہوا ہوگا۔ مالک رام صاحب نے اس کے دو نسخے مجلد کرا کے مجھے بھیجے تھے کہ ایک میں رشید صاحب کو دے دوں۔ خط کی تاریخ تحریر ۱۱ر مئی ۱۹۷۶ء زیادہ قرینِ قیاس ہے۔

[3] اردو کا مشہور سہ ماہی رسالہ جو مالک رام صاحب کی ادارت میں برسوں علمی مجلس دلی سے شائع ہوتا رہا۔ اس کا شمارہ ۳۳ (اکتوبر، دسمبر ۱۹۷۵ء) "رشید احمد صدیقی نمبر" تھا جو بعد کو کتابی شکل میں بھی شائع ہوا۔ اس میں ڈاکٹر عابد حسین صاحب کا مضمون "رشید و مرشد" بھی شریکِ اشاعت ہے۔

آپ کی تحریروں میں OVERSTATEMENT کہیں اور کچھ نہیں ملا۔ لیکن میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ میری محبت اور احترام میں آپ نے زہد و تقویٰ مضمون میں اسے گوارہ کر لیا اس کو آپ کی طرف سے بڑا قیمتی تحفہ سمجھتا ہوں اور سمجھتا رہوں گا۔ خدا آپ کو خوش، تندرست اور محترم رکھے۔ آمین!

کمزور ہو گیا ہوں۔ زیادہ لکھ پڑھ نہیں سکتا ورنہ جی چاہتا رہا ہے کہ اس موقع پر کچھ یادیں تفصیل سے لکھتا۔

دوستوں اور عزیزوں کو دعا۔ اب میری طرف سے آداب قبول کرنے والے آس پاس شاید ہی ملیں۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

مقالات بین الاقوامی غالبؔ سیمنار (انگریزی)

مرتب: ڈاکٹر یوسف حسین خاں

بین الاقوامی غالب سیمنار منعقدہ ۱۹۶۹ء میں پڑھے گئے انگریزی مقالات کا مجموعہ ہے۔ جس میں ملک اور بیرون ملک کے اہم نقاد اور محققین کے مضامین شامل ہیں۔

صفحات : ۱۴۶
قیمت : ۱۰ روپے

انتخاب غزلیات غالب

(انگریزی)

مترجم: محمد یعقوب مرزا

غالب کی کچھ منتخب غزلوں اور اشعار کا انگریزی ترجمہ۔ ترجمے کے ساتھ اردو رسم الخط میں غزلیں بھی شامل ہیں۔

صفحات : ۹۶
قیمت : ۹ روپے

ازناد نصیرالدین شماتوف

وسط ایشیا میں غالب پر تحقیقی کام

روس کے انیس سو سترہ کے انقلاب سے قبل وسط ایشیا میں، جس کے ہند سے پرانے ثقافتی اور ادبی تعلقات رہے ہیں، فارسی زبان بہت مقبول تھی۔ اس لیے اس علاقے کے باشندے غالب کے متعلق بہت کچھ جانتے تھے اور ان کی فارسی تصانیف سے کسی حد تک واقف تھے۔ اس کا سب سے اہم ثبوت یہ ہے کہ وہاں کے تاشقند، دوشنبہ اور دیگر بڑے شہروں کے کتب خانوں میں غالب کی بہت سے کتابیں محفوظ ہیں، جن میں نہ صرف فارسی دیوان اور نثر کے نمونے، بلکہ اردو غزلیات کے نمونے بھی شامل ہیں۔ ہند کے غالب شناسوں اور محققین غالبیات کے لیے خاص دلچسپی کی اور قابل غور یہی بات ہوگی، کہ ازبیک Academy of Sciences ذخیرے میں چند اردو مخطوطے بھی پائے جاتے ہیں، جن کی کتابت خوارزم سلطنت کے زمانے میں، یعنی انیسویں اور بیسویں صدیوں کے درمیانی عرصے میں کی گئی معلوم پڑتی ہے۔ اس امر سے آپ لوگوں کو شاید خوشی ہوگی کہ وسط ایشیا میں کس قدر اردو شاعری سے لگاؤ پیدا ہو چکا تھا۔

اس پس منظر میں ایک اور امر بہت اہم لگ رہا ہے کہ ہند اور وسط ایشیا کے دونوں

عوام کی مشترک تہذیب اور روایات، رہن سہن، رسم ورواج کے اشتراک سے ابھرنے والے غالب کے تخلیقی ورثہ کی مقبولیت اور شہرت کی بنیادوں میں مرزا عبدالقادر بیدل کے اثرات بھی موجود ہیں، جو وسط ایشیا میں خاص شہرت رکھتے ہیں۔ خاص طور سے انیسویں صدی کے تاجک اور ازبیک شعرا نے بیدل کے لاجواب اور غیر معمولی طرز بیان سے متاثر ہو کر ان کے اسلوب اپنانے کی کوشش کی تھی۔ حالانکہ بیدل کا غالب کی ابتدائی تصانیف پر جو گہرا اثر ہوا تھا، اس کا اعتراف ہو چکا ہے۔

یوں تو سوویت یونین کے دور میں غالبیات کا موضوع وسط ایشیا میں ایک باقاعدہ علمی دلچسپی کی بات بھی ہو گئی تھی۔ تقریباً بیسویں صدی کے درمیان اس اہم کام کا بیڑا دو تاجیک محققین محترمہ پولو دووا اور جناب غفوروف نے اٹھایا تھا۔ انھوں نے غالب کے حالاتِ زندگی اور نثر و نظم کے چند پہلوؤں پر مقالے تیار کئے۔ اور بعد میں اپنی تحقیقات متعدد کتابوں اور مضامین کی شکل میں بھی شائع کرائیں۔ ہماری رائے میں، یہ کام غالبیات کو مجموعی طور پر زیر تحقیق لانے کی ایک کامیاب کوشش مانی جا سکتی ہے۔

محترمہ ڈاکٹر پولو دووا کے مضامین و کتابیات پر تبصرہ کرتے ہوئے ان کے لکھے ہوئے دو مقالے قابلِ غور ہیں، چنانچہ ایک میں غالب کی طرز ادا کے سرچشمہ پر روشنی ڈالتے ہوئے انھوں نے نظیر اکبر آبادی کے مقابلے میں مرزا عبدالقادر بیدل کی طرز کو غالب کی ترجیح قرار دیا ہے۔ اور دوسری طرف، غالب کی بعض رباعیات پر جو شاعر نے بعد کے دور میں لکھی تھیں، اُن کا عمر خیام کی رباعیات سے تقابل کرتے ہوئے خیام کے اثرات کی نشاندہی کی ہے۔

جہاں تک ڈاکٹر غفوروف کا سوال ہے، تو انھوں نے اپنی جو کتاب شائع کی تھی، وہ غالب کے حالاتِ زندگی اور تخلیقی عمل پر، تاجک زبان میں انیس سو اکسٹھ میں چھپی تھی اور جو سوویت دور کے اس موضوع پر اولین اہم تحقیقی مقالہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ اگرچہ اِس کتاب کے دونوں ابواب محض فارسی مواد اور غالب کی فارسی نظم و نثر کے مطالعہ پر مبنی

ہیں تاہم ماہرین مشرقیات کو پورا یقین ہے کہ اس کتاب کی بدولت، جس میں خصوصاً غالب کے پا‌ئچ آہنگ اور قاطع برہان فارسی تصانیف پر بھرپور نظر سے توجہ دلائی گئی تھی، غالبیات کے میدان میں آیندہ تحقیقات کے لیے مضبوط بنیاد ڈالی گئی تھی۔

چار سال بعد تاشقند از بیکستان میں ازبیک زبان میں غالب کی منتخب غزلیات کا ترجمہ مع مقدمہ ڈاکٹر قمر رئیس چھپ گیا تھا۔ ڈاکٹر موصوف نے اس میں غالب کی تصانیف کی گنگا جمنی اہمیت اور برصغیر کے عوام میں اس کی خاص مقبولیت کا جائزہ لیا ہے۔

پھر ایک سال بھی گزرنے نہ پایا کہ دوشنبہ میں محترمہ ڈاکٹر پولو دووا کی، غالب کے اردو خطوط، کے نام سے تحقیقی تصنیف کی اشاعت ہوگئی تھی۔ چاہے یہ کتاب تاجک زبان میں کیوں نہ لکھی گئی ہو، پھر بھی اس میں ایک زبردست پہلو یہی نظر آتا ہے کہ اس کے دو ابواب میں، جن کے عنوان " غالب کی زندگی کا تاریخی پس منظر" اور اردو نثر کی ارتقا کا خاکہ" ہیں، ڈاکٹر موصوف نے ایک تو روایتی اردو شاعری کے موضوعات پر غالب کے اضافہ اور، دوسرے غالب کی نثر نگاری کے اردو نثر کے ابتدائی ادوار سے قدر قدر وابط کا مسئلہ اٹھایا ہے۔ کتاب کی بنیادی بات میں جس میں عود ہندی، اردوئے معلی، مکاتیب غالب، نادرات غالب اور نامۂ غالب کے مجموعے زیر تحقیق لائے گئے تھے، محترمہ پولو دووا نے ایک نیا نظریہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے جس کے مطابق خطوط غالب نے ادب کی ایک خاص طرز بیان کی حیثیت سے انیسویں صدی کی اردو نثر نگاری کی ترقی میں نہایت اہم حصہ ادا کیا ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو اس مقالے میں سنجیدہ نقطۂ نظر سے غالب کی تحقیقات کا حق ادا کیا گیا ہے۔

جہاں تک ازبیکستان کا سوال ہے تو اسی اعتبار سے مرزا غالب کی اردو غزلیات سے ان کا تعارف انیس سو چھیاسٹھ (۱۹۶۶ء) میں ہوا تھا، جب تاشقند یونیورسٹی کے بزرگ استاد رحمان بیردی محمد جانوف نے ان میں سے چونسٹھ غزلوں کا ترجمہ ازبیک میں کیا تھا اور ایک علیحدہ کتاب جس کا عنوان "شیدا" تھا شائع بھی کی تھی۔ کتاب کے آخر میں ایک چھوٹا

سا مگر بہت بیش قیمتی مضمون بھی دیا گیا تھا جس کو اس زمانے میں تاشقند یونیورسٹی میں Visiting Professor کی حیثیت سے آئے ہوئے دلی یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر قمر رئیس نے تیار کیا تھا۔ اصل میں یہ کتاب سوویت یونین میں براہ راست اردو سے مقامی زبان میں کیا گیا اوّل ترین ترجمہ ثابت ہوا ہے۔ اس زمانے سے لے کر مرزا غالب کے متعلق ازبیک قارئین جلدی سے مختلف مواد حاصل کرتے آئے ہیں۔ چنانچہ دو سال بعد دو اہم ادبی اخباروں میں غالب کی چار رباعیات اور دوسرے ممتاز اردو پروفیسر خواجہ احمد فاروقی صاحب کا مضمون بھی چھپا تھا۔ جس میں میرزا غالب کے شاہکاروں کی اہمیت پر تبصرہ کیا گیا تھا۔ پھر ستمبر ۱۹۶۹ء میں تاشقند Academy of Sciences کے یہاں Al-Beruni Oriental Studies Institute کی کاوشوں سے مرزا غالب کی سالگرہ منائی گئی تھی جس کے موقع پر ایک شاندار علمی کانفرنس بھی منعقد کی گئی تھی۔ اس میں چند علمی مقالے بھی پیش کئے گئے تھے۔ تب سے برابر ازبکستان اور تاجکستان میں غالبیات کا بہت چرچا اور غالب شناسی سے دلچسپی بڑھتی جا رہی ہے۔

تاشقند میں چند مخطوطے بھی محفوظ ہیں جن میں کلیاتِ غالب کے دو سنگی چھاپے کے نسخے موجود ہیں۔ نمبر ۲۳ ۱۰۵ اور ۱۰۵۲۴۔ ان کی کتابت لاہور سے ۱۸۹۳ء میں کی گئی تھیں۔ پھر اس کے علاوہ ۲۲۹۵ اور ۲۹۹۴ نمبروں کی تحت دو قلمی مخطوطے بھی موجود ہیں کلیاتِ غالب کے خوارزم سلطنت کے زمانے میں نقل کئے گئے تھے اور جن کے درمیان تین چار صفحوں پر اردو غزلیات کے نمونے بھی دے گئے ہیں۔

غالب انسٹی ٹیوٹ کی تاریخی پیش کش

یادگارنامہ

فخرالدین علی احمد

مُرتّبین: پروفیسر نذیر احمد
پروفیسر مختارالدین احمد
ڈاکٹر شریف حسین قاسمی

عرصے سے انسٹی ٹیوٹ کی یہ خواہش تھی کہ جناب مرحوم فخرالدّین علی احمد کی خدمات کے اعتراف میں ایک یادگارنامہ شائع کرے لیکن چند در چند وجوہ سے اس مقصد کے حصول میں تاخیر ہوتی رہی ہے، شکر ہے کہ اب یہ مقصد پورا ہو رہا ہے، ادارے کی طرف سے موصوف کے نام پر دو کتابیں، مجموعۂ مضامین ایک انگریزی میں اور دوسری اردو میں شائع ہوئی ہیں جس میں ملک اور بیرونِ ملک کے نامور اہلِ قلم کے بہترین مضامین شاملِ اشاعت ہیں۔

خوب صورت گٹ اپ، فوٹو آفسٹ طباعت ۔

قیمت: (اردو) ۵۰۰ روپے
(انگریزی) ۳۵۰ روپے

CONTENTS

15.	Prof. Sharif Husain Qasemi	Literary Importance of Faizi's Writings
16.	Prof. Nazir Ahmad	Epigraphy in India
17.	Dr. (Ms) Asifa Zamani	Persian Prose of Syed Insha
18.	Dr. Kazim Ali Khan	Ghalib and Aligarh
19.	Prof. Mukhtaruddin Ahmad	Some Unpublished Letters of Prof. Rasheed Siddiqui
20.	Prof. Azad Nasiruddin Shamatov	Researches on Ghalib in Central Asia

Ghalibnama

NEW DELHI

January 1996

Volume 17 No.1

Price : *Rs. 50/-*

Printer & Publisher
SHAHID MAHULI

Printed by :
AZIZ PRINTING PRESS
Tel. : 328 5884

GHALIB NAMA

Aiwan-e-Ghalib, Aiwan-e-Ghalib Marg,
(Mata Sundri Lane), New Delhi-110 002
Ph. : 3712583, 3316518

Ghalibnama

Chief Editor :
PROF. NAZIR AHMAD

Editors :
RASHEED HASAN KHAN
PROF. ABDUL WADOOD AZHAR
SHAHID MAHULI

GHALIB INSTITUTE
AIWAN-E-GHALIB MARG, (MATA SUNDRI LANE)
NEW DELHI.110 002